اَحد بَب
غِنا یا آوازِ دوست......
حبیب

اَحدبب

مصنّف:	سید حبیب
مصوّر (سرورق):	منیر احمد
کمپیوٹر خطاط:	ضمیر میر
ڈیزائننگ:	فاروق
پروف ریڈنگ معاونت:	ڈاکٹر اعجاز
اشاعت:	شفا پبلی کیشنز، زبرون
سالِ اشاعت:	جنوری، ۲۰۱۲ء
طباعت:	شالیمار آرٹ پریس، سرینگر
معاونت:	گریٹر کشمیر
مقام:	سری نگر
ہدیہ:	اختیاری

انتساب
لگیہِ ؤندِ تھ
حبیبؔ

اَحد بب
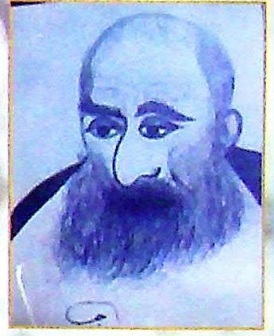
تاج بر سر آئے صاحب باخدا
دوش پر لائے مزمّل برملا
چھپ گئے موتی پریشان ہوگئے
کھِل اُٹھی ہیروں کی لولاکی ضیا
آیتیں بقرہ کی بکھریں چار سُو
پڑھنے لگا شیر خود صلِّ علےٰ
مشرق و مغرب میں نکھرا لامکاں
ڈوب گئے شان میں ارض و سما
ہر طرف جلووں کی بارش الاماں
عنبر افشاں مرحبا تحت الثریٰ
لوح و قلم آب آب ساری حیات
ہر طرف گُل کاریوں کا ماجرا
بلبلوں کے راگ پھولوں کا سرور
راغ راغ میں باغ باغ صوتی ادا
حشر کے میدان میں لوگوں کا جلوس
تخت پر خود مالکِ روزِ جزا
عالم حیرت میں جشن زندگی
مختصر دنیا شفا عقبیٰ وفا
"حمد بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایمان داد مشتِ خاک را"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

۱۹۸۳ء میں وقت کے گھومتے ہوئے پہیے نے ایران پہنچا دیا۔ کسی غیبی طاقت نے ایران کا مہمان بنا دیا۔ وہاں مشہد میں امام رضا علیہ السّلام کی درگاہ پر گرم گرم آنسو بہاتے ہوئے عاجزی کی کہ کوئی کامل مرشد مل کر دیرینہ شوقِ عرفان پورا ہو۔ مشہد میں دو چار دن گلابی پی کر خوب گزرے پھر ہوا کچھ ایسا کہ میں اور گھر سے کچھ قلیل عرصہ گذرنے کے بعد سوپور پہنچا۔ صاحب کے دستِ کرم پر، جو گرم بھی ہے اور نرم ... ئی اور ان کے ساتھ جڑ گیا۔ تب سے یہ دلچسپ، پر اسرار، کام گار، کام جو اور محوِ کار رشتہ بدستور قائم ... تابناک روپ: شفا در دنیا، و وفا در آخرت!

ژہ تہ مے چھو وعدہ ازلُک دری تے قسم نگارو

اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ان کی یاد میں کچھ ایسی باتیں لکھی جائیں جو پُر معانی ہوں، روحانی اعتبار سے ضروری ہوں اور طالبانِ معرفت کیلئے سود مند۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے فریب، چاہِ یوسفؑ کا تذکرہ، زلیخا کی اصلی شناخت، یوسفؑ کا قافلہ والوں کے ذریعے چاہ سے نکلنا، بازارِ مصر میں اس کا بھکاؤ، اس کی قمیض کا پیچھے سے پھاڑ دیا جانا، یوسف کے سامنے بھائیوں کا سجدہ، موسیٰ علیہ السلام کا آگ کے ساتھ ہم کلام ہونا، تحت الثریٰ کی پہچان اور اس کی اہمیت دنیائے عرفان میں، رٖیشم کا سورہ الرحمٰن میں تذکرہ، مرجان وغیرہ کی پہچان اور اہمیت، سورہ والنجم کی پہلی اٹھارہ آیتوں کا ذکر، سدرہ کی وضاحت اور عالم معرفت میں اس کا مقام، قرآن میں جمال اور جلال، نفی اور اثبات کا معاملہ اور خدا کا دیدار، اولی الامر منکم کا تعیّن، خاص کر جدید دور میں جیسے معاملات[۱]، یہ اور اس قسم کے معاملات نہ صرف خدا پرستی کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ہزاروں خرابیوں کا بھی علاج کر سکتے ہیں جن خرابیوں نے آج کل خدا پرستی دشوار بنائی ہے۔ ہم ایسے مسائل کی بلا واسطہ

۱۔ ان معاملات کا ذکر اس تحریر میں آئے یا نہ آئے مگر ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ اسلئے کہ ایسے ہی بہت سے راز ہیں جن کی نقاب کشائی کرنا ہمارا مقصود ہے۔ قطعی نقاب کشائی بھی ممکن نہیں کیونکہ رازِ الٰہی بالکل کھل کر بیان نہیں کئے جا سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی کہا گیا ”آپ مجھے کھل کر نہیں دیکھ سکتے“

تشریح نہیں کر سکتے۔ ان کا بیان بقولِ مولانا جلال الدین رومیؒ یا در حدیث دیگراں ہو سکتا ہے یا اشاروں، کنایوں، استعاروں، تمثیلوں اور رمزوں کے ذریعہ۔ علم و دانش میں ان ذرائع کا مقام عالموں اور دانشوروں کو معلوم ہے۔ بقول غالب مرحوم

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

ہم نے تاہم اپنی طرف سے بہت کوشش کی ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، یعنی معرفت کے گہرے راز سمجھنے میں بھی مدد ملے اور سسٹم کے روابط اور ضوابط بھی بلا کسی نقصان کے قائم رہیں۔

بزرگان دین کا کشمیر کی سرزمین پر بہت مثبت اثر رہا ہے۔ یہاں کے غریب اور سیدھے سادھے لوگوں کی سیدھی سادھی زندگی کا بہر رنگ سدھاران بزرگوں کا شعار رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام الناس کی دیکھ ریکھ اور ان کی علمی و قلبی پرورش بزرگوں کی تخلیقی زندگی کا لازمی جز ہے۔ کشمیر میں تقریباً ہر دور میں باضابطہ تعلیم کا نہ ہونے کے برابر انتظام رہا ہے۔ اس سے عوام الناس کی زندگی پر کافی برا اثر پڑا ہے۔ ہمارے بزرگوں خاص کر درویشوں نے اس برے اثر کا کافی دفعیہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے لدُن سے کام لیتے ہوئے کتابوں اور دیگر وسائل کی کمی پوری کی ہے۔ یہاں اگر چہ ابن عربی جیسے عالم و فاضل پیدا نہ ہوئے اور نہ رومیؒ، حافظؒ و عطارؒ جیسے صوفی و علماء تاہم امیرِ ہمدانؒ، خاکیؒ، رحیم صاحب سوپوری، شمس فقیر، نعمہ صاحب، صمد میر اور احد زرگر جیسے ولیوں اور عارفوں نے عوام کی قلبی اور سماجی ضروریات پوری کی ہیں۔ اس ضمن میں اپنے صاحب احد بب کا مایہ ناز اور شاندار کام لامثال ہے۔ وہ سوپور اور کمراز کے عوام کی ہمہ جہت ضروریات بھی پوری کرتے رہے اور انہیں جامِ معرفت بھی پلاتے رہے۔ یہ بھی باور ہو کہ وہ عالمی سطح پر بھی بہت بڑا روحانی کام انجام دیتے رہے۔

رازِ الٰہی جاننے کیلئے جرأت، برداشت، صبر اور گنجائش چاہیے۔ جو لوگ ان صفات سے خالی ہوں وہ راز کی باتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے لئے بھی مسائل پیدا کر سکتے ہیں اور دوسروں کیلئے بھی دردِ سر۔ پھر یہ کہ شورہ زمین میں اچھے اور نادر بیج، پھلوں کے، پھولوں کے بوئے نہیں جاسکتے الاّ یہ کہ صاحب جیسے بہادر اور جوکھم اٹھانے والے فقیر ہوں۔ وہ خود پھاوڑ اٹھائیں گے، زمین کھودیں گے، پتھر توڑ دیں گے بیج بوئیں گے حتیٰ کہ آبیاری اور رکھوالی کا بوجھ بھی خود اٹھائیں گے۔ پھر کہیں بات بنے بنجروں میں سنبل پیدا کرنے کی۔ ایسے جاں کی بازی لگانے والے مجاہد بار بار آتے نہیں۔ آہ!

صاحب کی زندگی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ اسے خانوں میں بانٹا نہیں جاسکتا، خاص کر اس طرح کہ ایک پہلو کا دوسرے پہلو کے ساتھ جوڑ نہ ہو۔ یوں بھی شخصیت وحدت ہے جسے الگ الگ حصوں میں

تحویل نہیں کیا جاسکتا۔ احد بب لکھنے کیلئے ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم مختلف موضوعات تلاش کریں جوان کی زندگی کے ساتھ میل کھاتے ہوں تاکہ خامہ فرسائی میں ربط پیدا ہوجائے اور تنظیم۔ کتابی زبان میں یہ موضوعات ابواب یا chapters۔ یہ تو ہم اپنی بساط کے مطابق کر چکے مگر ہم کہہ نہیں سکتے کہ کسی جگہ خیال دہرایا نہ گیا ہو۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے اور شاید کسی جگہ ضروری بھی۔ رگ رگ الگ کرنا مناسب بھی نہیں ہے کیونکہ اس طرح تحریر بناوٹی ہوجاتی ہے اور زندگی پارہ پارہ۔ یوں بھی زندگی کو اس طرح کافی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ ہم نے جگہ جگہ پیغمبروں اور اولیائے کرام کے علاوہ صوفیوں اور بزرگوں کا نام لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ادب اور احترام کے ساتھ ان کا نام لیا جائے۔ پھر بھی کوئی بھول چوک ہوئی ہو یا کوتاہی، اس کیلئے ہم دربارالٰہی میں معافی کیلئے دست بدعا ہیں۔ ہم انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم کی بارگاہ میں درود وسلام پیش کرتے ہیں اور بار بار اور اپنی بشریت کو مدنظر رکھتے ہوئے خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ اگر اپنا منہ عطر گلاب سے بار بار دھوئیں، پھر بھی ادب کے ساتھ ان کے اسماء گرامی لینے میں کامیاب نہ ہونگے۔

رنگ کم کم ژستھ آئے پھولی پھولی گلاب
شبنمو لیوکھ موختہ ہیتی کنت تراب
چشمہ میانے گے ؤچھان روئے یارہ سوند
نار لوگ میانس زوس چیے چیے شراب

حبیبؔ

میں نے لکھتے لکھتے ظاہر داری یا غلو (hyperbole) سے کام نہیں لیا۔ ایسا کرنا میری نظروں میں دینداری، روحانیت اور مذہب عرفان کے منافی ہے۔ اس قسم کی حرکات بدترین قسم کی بددیانتی ہے۔ میں نے مسکا لگانے کی بھی کوشش نہیں کی کیونکہ مسکا لگائیں تو کن پر؟ ان پر جو ہمارے دلوں سے واقف ہیں، ہماری نیتوں، ہماری حرکات وسکنات سے بھی، اس وقت بھی اور ہمیشہ؟ مسکا لگانا کردار کی بدترین صورت ہے اور اس نے دنیا میں بہت غلط قسم کی روایات قائم کی ہیں۔ ہمارا تمدّن مجروح ہوچکا ہے مسکا لگانے والوں کی چالبازی اور عیّاریوں سے۔ باوجو اس کے پہلے ایام میں صاحب کبھی کبھی مجھے ''ڈانبل'' کہتے تھے۔ میں اب بھی اس نام سے لذّت اٹھاتا ہوں۔ اس لذت کو الفاظ کا جامہ پہنایا نہیں جاسکتا۔ میں عاجزی کرتا تھا اور بار بار۔ مجھے اپنے مالک سے دور رہنے کا بہت ڈر ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے اور ان کے درمیان ہر پردہ گراتا۔ میں اس وقت بھی گنگناتا رہتا ہوں۔

تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں صاحب کی اولاد کے بارے میں بھی تصنّع سے کام نہیں لیتا۔ بناوٹ اور جھوٹے موٹے تعلقات میرے پاس پھٹکتے نہیں۔ میرا کردار اس سلسلے میں بہت حسّاس ہے۔

میں نے بہت احتیاط سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی، تو میں قارئین کرام سے معافی چاہوں گا، خاص کر کشمیری کے لئے کیونکہ مجھے کشمیری رسم الخط کی شناسائی نہیں۔ لکھتے لکھتے میری نسوں پر بہت دباؤ رہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں ایک بہت ہی سنجیدہ اور غیر معمولی کام کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دباؤ میں آکر قلم نے کہیں لغزش کی ہو۔

اس خوش قسمت طالب نے صاحب کے ساتھ پورے ستائیس سال اور کئی مہینے گذارے۔ میں خاص وجوہات کی بناء پر انہیں صاحب کے نام سے پکارتا رہا۔ غور سے اُن کو دیکھتا رہا، ان کے رنگارنگ تیور اور موڈ اپنی استعداد کے مطابق گہرائی سے مشاہدہ کرتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ گزر گئے ہیں مگر میں ابھی بھی انہیں اُن راہوں پر چلتے دیکھتا ہوں جنہیں میں عاشقی کی زبان میں اگر بات کریں پوجتا آیا ہوں۔ جامی بھی یہی کرتا تھا:

کوئے تو کعبہ است یا خلدِ بریں یا بوستان یا گلستان ارم یا جنتِ الماویٰ است ایں

یہ تحریر زیادہ تر اسی تجربے پر مبنی ہے اور ان کے کھلے دربار کے انوکھے انداز پر حالانکہ میں نے ان لوگوں کی آرا سے بھی فائدہ اٹھایا جنہوں نے اس کام میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ پھر یہ کہ استعداد کے مطابق علمی تجربے بھی صاحب کی حیات کے ساتھ حسبِ ضرورت جوڑ دئے۔ یہ کام بہت مشکل ہے خاص کر مجھ جیسے کم مایہ کیلئے۔ اس بات کا پورا احساس ہے مجھے۔ میں جو کھم اٹھا رہا ہوں۔ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہو چکا ہوں گا، وہ تو صاحب کے پروانے ہی کہہ سکیں گے یا قارئین کرام!

بضاعت نیا وردم الّا امید خدایا زِ عفوم مکن نا امید

سب سے اہم بات کہ صاحب کے فرزند جناب عطا محمد صاحب اور دیگر اہل خانہ کا بہت بہت شکریہ کروں جنہوں نے کچھ اہم مواد فراہم کیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ مالک ان کی انسان دوستی اور عرفان پسندی میں چار چاند لگائے! آمین۔ میں اپنے بیٹے اعجاز فرید کا بھی شکر گزار ہوں جس نے عقیدتِ تمام اور گہری محبت کے ساتھ کتاب کی پروف ریڈنگ کی اور مشورے بھی دئے۔ خدا اُسے بھی صاحب کی والہانہ محبت سے اور زیادہ نوازے!

حبیب

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

مہرِ تابان مشرق سے نکلتا ہے، یہ کسی سے چھپا نہیں۔ البتہ اب کے جس مشرقی خطۂ ارض کو سر نکالنے [illegible] کا نام عشہ پیر اور وہ سوپور کاشمیر کا خوش بخت محلّہ ہے! احد نام پایا مگر نام بھی کیا کہ نامی ہو گئے۔ اس نام میں سب کچھ ہے، ذات بھی صفات بھی، دنیا بھی عقبیٰ بھی، زمین بھی آسمان بھی، سدرۃ المنتہیٰ بھی، جنت بھی اور [illegible] بھی۔ یہ نام ذرّے ذرّے میں پھیلا ہوا ہے، جس طرح پہاڑوں، میدانوں، جنگلوں، صحراؤں،

گہ نبی بود و گہِ دیگر ولی　　گہ محمدؐ گشت گاہے شد علیؑ
[illegible] نبی آمد بیان راہ کرد　　در ولی از سرّ حق آگاہ کرد
رومیؒ

وادیوں، ریگ زاروں میں اسی طرح لالہ زاروں، سبزہ زاروں، نو بہاروں اور بہاروں کی رنگینیوں میں۔ بلبل کی بیقراری اور آہ وزاری اسی سے اور اس کے گیتوں کی طرح داری بھی اسی سے۔ پھولوں کے شگوفے، اُن کے اوپر شبنم کی ڈھلک، اس ڈھلک کے نیچے کلیوں کی مسکانیں اور رنگ رنگ پھولوں کی بے باک مسکراہٹ، سب اسی نام کی نام داریاں ہیں۔ تتلیوں کے رقص یہی نام پڑھتے ہیں اور ان کے پروں کی نزاکت اور نرمی اسی کی مرہون منت ہے۔ بادِ سحر بھی مشکبوئیوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے اور کھلی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے زمین وآسمان کو معطر کرتی ہے مگر احد احد کا نغمہ گاتی ہے۔ شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہوئی، پھولوں پر بیٹھتی ہوئی، رس چوستی ہوئی شہد سامانیوں کی تیاریاں کرتی ہیں مگر احد احد کا وظیفہ ساتھ ساتھ پڑھتی ہیں۔ تتلیاں، بھنورے، ہواؤں کے جھونکے اور پانیوں کی اچھلتی ہوئی جولانیاں، زیرہ وگل کے ساتھ کھیلتی ہوئی، بیجوں پھلوں کا اہتمام کرتی ہیں مگر احد احد بیجوں بیچ انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ کوئی جھرنا دکھاؤ جس میں احد کا بہاؤ نہیں، کوئی چشمہ دکھاؤ جس کی اُچھلن میں احد نغمہ طراز نہیں۔ دریاؤں میں اس کا زور، ندیوں جھرنوں میں اس کا پانی، اس کا شور۔ سمندر کی گہرائیوں میں اس کا دم اور اس کی فلک بوس لہروں میں اس کا خم۔ دم ہو یا خم، ہر لحظہ، ہر گھڑی، ہر آن احد احد ان کا زیر و بم۔

شاد باش اے عشق بے پروائے ما
اے علاج جملہ علت ہائے ما
رومیؔ

بادل گرجتے ہیں تو گرج کسکی، بجلیاں چمکتی ہیں تو کڑک کس کی، پودے اُگتے ہیں تو اُگاؤ کس کا، فصلیں پکتی ہیں تو پکاؤ کس کا۔ اناج ہو یا پھل، کھیتی ہو یا کھلیان، کون دہقان، کس کے سامان، کون بھرے اپنی آرزوؤں کے دامان، کون داتا اور کس کے دان، کون کھائے، کون پئے، کون جئے، کون جنے، کون پھلے، کون پھولے اور کون چاند تاروں کے جھولوں میں جھولا جھولے، حق سرہٗ پڑھ پڑھ کے زور زور سے یہی نام پڑھے صبح وشام۔ یہی جم، یہی جام، یہی دارالسلام!

یہ تو تھی اس نام کی ایک جھلک مگر اس کی کائنات بہت وسیع ہے۔ سمندر [illegible] کا پانی سیاہی بن جائے اور اس سے اس نام کے افسانے لکھے جائیں تب بھی یہ ادھور[illegible] جائیں گے۔ چاہو تو اور پانی لاؤ، اور سیاہی بناؤ اور لکھو، پھر بھی افسانۂ اسما ادھورا! خو[illegible] کے ساتھ پہلے "ل" جوڑ دیجئے تو اس کی ہئیت ہی بدل جائیگی۔ احد لاحد بن جائیگا۔ [illegible] آپ کہیں گے کہ یہ "ل" کہاں سے آگیا۔ کس کو پتہ ہے کہ یہ آتا کہاں سے، تاہم جب آتا ہے تو قیامت برپا کر جاتا ہے۔ اس "ل" کا نام عشق ہے۔ اگر آپ عشق کا نام لے نہیں سکتے تو دل یا عقل کا نام لیجئے، ایک ہی بات ہے ہمارے لئے۔ ہم ناموں کیلئے لڑتے نہیں، جو دل ہے، وہی دماغ ہے اور جب دل ودماغ جذب وسرور سے بھر جاتے ہیں اور وفور شوق سے تو عشق کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جناب عشق کہئے تو زیادہ مناسب، زیادہ زور دار، پروقار ہوگا۔ جب اس نامدار کا نام لیتے ہیں تو اس کے حضور میں جھک جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے شاہنشاہ کے سامنے۔ مگر اس کے قصے بڑے مشہور ہیں۔ نہ جانے کتنے گھر اور کہاں کہاں اجاڑ دئے اس نے! البتہ جب اجاڑتا ہے تو بناتا بھی ہے اور ایسا بناتا ہے کہ کوئی دل پھینک کہتا ہے کہ میں اگر گھر

جناب عشق کے معیار اونچے
مصر جیسے بہت بازار اونچے
زمانے کو سکھائے زندگانی
محل اونچے بڑے دربار اونچے
بہت باریک ہیں الفت کے انداز
نزاکت کے سنجیدہ کار اونچے
مگر سانپوں کی زہریلی نقاشی
مقدس فن کے یہ فنکار اونچے
شفائی پالکی میں کون بیٹھا
مدھر پایل کے یہ جھنکار اونچے
حبیب

بناؤں گا تو اسی کے ہاتھ کا بناؤں گا۔ یہ انسان کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ کبھی اس کام میں پھنسا دیتا ہے کبھی اس کام میں۔ رات کے اندھیروں میں چراغاں پیدا کر دیتا ہے اور چاند ستاروں سے سرگوشیاں کراتا ہے راز و نیاز کی۔ کوئی خوش مزاج، کوئی جان کی بازی لگانے والا سرباز وہ سرگوشیاں سنے اور پھر اُس جہاں سے لوٹے جہاں پہنچے! اسے دوریاں بھی پسند جو لاکھوں ستاروں کو ملاتی ہیں، پروتی ہیں اور کہکشاں کی مالائیں بناتی ہیں۔ صرف حضرت عشق کی مست خرامیاں کمندوں میں بند نہیں کی جاسکتیں اس لئے بادِ صبائے بہاری بھی اس سے مل مل کے انسانی وجود کو کچھ اس طرح نچواتی ہے کہ ہندوستان کی زہریلی سانپنیاں بھی ڈنک مارنا بھول جاتی ہیں۔ یہ عطر کا بہت پرانا عاشق بھی ہے اس لئے پھولوں میں رنگ بھر دیتا ہے اور ان کی بھینی بھینی خوشبوؤں میں چوری چوری نہاتا ہے کہ اسّی سال کا کوئی بڈّھا بے چارا کہے کہ لو میں بھی نہاؤں گا۔ یہ حیات کی رنگینیاں پیدا کرنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے، اسی لئے فقیر اس کے، قلندر اس کے، اسی کے سادھو، اسی کے سنت۔ یہی وقت کا دھارا بدلاتا ہے اور یہ وقت کو گھوڑا بنا کر اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ کبھی سنگلاخ زمینیں کٹوا کٹوا کر شیریں جھرنوں کی اُچھل کود کے راستے ہموار کراتا ہے اور دودھ جیسی ندیوں کے پانیوں کے ساتھ عاشقوں کا سرخ سرخ گرم گرم خون ملاتا ہے کہ ان کا کام بہاراں ہو جائے اور وہ بھی حیات جادواں کے ساتھ ہمکنار ہو جائیں۔ کبھی بیج بوتا ہے اور بہاروں سے گزرتے ہوئے نئی زندگی کی نئی شوخیاں، نئے سامان پیدا کرتا ہے اور کبھی شوخ دلہنوں کے چنچل ارمانوں کو زرق برق پوشاکیں، چمکتے ہوئے زیور اور چھنچھناتی رنگ برنگ چوڑیاں پہناتا ہے تاکہ ان کے جذبے وجد میں آئیں حسن و جمال کی بھول بھلیّوں میں کھو جانے اور دریائے تخلیق میں غوطہ لگانے کیلئے۔ عشق کا ہی معجزہ ہے کہ ظہور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کے ڈھنگ سکھائے اور علم و فراست کے نئے سامان پیدا کرے جن کی مدد سے انسان فرشتوں کی امامت بھی کرے اور حقیقت ابدی کی

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
غالبؔ

بوگوس آوارہ کورتھم فان عشقو
وندے نا ژُو پنن بیہ جان عشقو
سرو شمشاد قد وچھ وچھ چھو منڈہ چھان
چھوکن مباہن مگر درمان عشقو
ژہ کن وچھ وچھ گلستان گے پشیمان
گلابو ہوت پرن قرآن عشقو
زمینس آنتھ رس رنگ برنہ آمتی
چھ وتھران پایہ نی تل پان عشقو
پھولان رحمان ودچھ ودچھ نازنین جسم
ونان سبحان کیاہ شوبان عشقو
ہران سکھ پوشہ پھوتی رنگ رنگ گرشھان ڈھیر
یہ جانان گرایہ بیلہِ ماران عشقو

حبیب

اوراور نقاب کشائی کرے۔ یہ مثالیں بھی ہیں اورانسان کی شاندار کہانی بھی جو احد کی لاحد کیفیات کے بے باک جلوے بھی دکھاتی ہے اوران کی قلندرانہ جودت کی طرف اشارے کرتی ہے۔انہی جلووں نے ان کے پروانوں کو رقصِ شعلہ ہائے ابراہیم سکھادیا کہ وہ جل جل کے راکھ ہوجائیں اورروایات عشق برقرار رکھیں!

احد نام زبان پر تو چڑھا اوراس کی عجیب ... لطافت سے کام و دہن فیضیاب تو ہوئے مگر وہ پکار ... باقی ہے جس کی گونج صاحب کے دربار میں رات ... صبح وشام سنائی دیتی ہے اور ہر طرف سے۔ کوئی سامنے پکارتا ہے، بالکل قریب، کوئی باہر آنگن میں، کوچے میں، کوچۂ یار میں، باغ میں، بغیچے میں۔ کوئی دور سے پکارتا ہے جہاں بھی ہو اور جس حال میں ہو، مصروف کار یا بے کار، بیمار یا لاچار۔ اپنے بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ مردوں کی پکار بھی یہی ہے اور عورتوں کی بھی۔ بچے، بوڑھے، جوان، امیر، غریب، عالم، فاضل، ان پڑھ پاس آتے ہیں تو یہی نام پکار پکار کر اور دور جاتے ہیں تو اسی کا ورد کرتے ہوئے۔ ان کے چہروں کو غور سے دیکھو کہ کس طرح پگلے ہوئے دلوں کا آئینہ ہیں اور یہ پگلاوٹ اپنائیت اور الفت کا معجزہ ہے۔ اس سیّال پگلاہٹ کی روانی کی تصویر کھینچنا ہو تو چنگ و رباب و ساز وسنطور چاہیے اور کوئی مغنّی جو داودی سماں پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ہم تو بس یہ کہیں گے کہ **بب** ورد زبان ہے۔ اس میں

لاچاری، مجبوری، بے کسی، عاجزی، نیازمندی، احترام، خلوص، عقیدت اور پیار بھرا ہوا ہے، سچ مچ! تقریباً اٹھائیس سال صاحب کے دربار کے ساتھ مربوط رہ کر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ قریب قریب سو فیصدی لوگ ان کو بس اسی نام سے پکارتے ہیں اور یہ بالکل مناسب ہے۔ مگر بب سے مراد؟ بے کسوں، سائلوں، خدا کے طلب گاروں، راہ نجات ڈھونڈنے والوں، معرفت کھوجنے والوں، مریدوں اور عاشقوں کا ضامن، وہ جو ہر وقت تیار ہے دردمندی کی آواز سننے کیلئے، دستِ رفاقت بڑھاتے بڑھاتے۔ ماتھے پر شکن نہیں، فریاد سے عاجز نہیں، وہ جس نے اپنی ساری زندگی انسانیت اور خدائیت کیلئے وقف کردی۔ فرنگی زبان میں پوپ یا فادر کو کہتے ہیں جو دینی باپ ہے اور اس لئے اس میں قرب ہے اور محبت و شفقت کا وفور۔ اس میں قدرتی اپیل ہے جو توجہ کی محتاج ہے یا متمنی۔ اس سے لازماً مترشح ہوتا ہے کہ فریادی اور بب کے درمیان کوئی پردہ حائل ہے نہ رکاوٹ۔

کشمیری زبان میں بب بزرگ باپ کو کہتے ہیں۔ یہاں مشترکہ کنبے یا بڑے گھرانے ہوتے تھے، جن میں ماں باپ اور ان کی اولاد کے ساتھ بھائی بہن اور ان کی اولاد بھی رہتی تھی۔ کنبے کے بزرگ ترین فرد کو بب کہتے تھے جو بزرگ فراخدل، صابر، مدبّر اور ناطرفدار ہوتا تھا اس لئے کنبے کے سب افراد اس کی اطاعت کرتے تھے اور سب چھوٹے بڑے اس کو بب کے نام سے پکارتے تھے۔ اب نہ بڑا گھرانہ ہے اور نہ بزرگی، عقلمندی، دریادلی اور ناطرفداری۔

ساز دل بجتا رہے اور آنکھ سے آنسو رواں
ہم بھی جائیں طور سینا یار سے ملنے وہاں
آگ سے ہم بھی سنیں گے اپنے خدا کا کلام
جلوۂ نور ہم بھی دیکھیں دل جگر کو تھام تھام
کیا کرے فرعون منکر کیا کرے گی اس کی فوج
نیل کھائے گا انہیں منہ کھول اس کی موج موج
رحمتِ حق جاری ہے عرفان کا ساگر ہے رواں
دُھلتی ہیں ساری گناہیں رازِ شفاعت عیاں
حبیبؔ

یوں بھی کشمیر میں بڑے بڑے صوفیوں اور قلندروں کو لوگ بب کہتے تھے۔ میں نے بھی نند بب اور بب جی جیسے قلندر دیکھے ہیں مگر صاحب کے ہاں معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ یہاں کے حالات عجیب وغریب، روایات دل ربا اور طور طریقے روح پرور نظر آئے۔ بب کا لفظ زبان پر چڑھتے ہی ایک زبردست شان، زبردست وقار، بے حد ذمہ داری، بے انتہا صبر وشکر، شگفتہ مزاجی اور گہرے شعور کے دل فریب رنگ آنکھوں

با احد در لحدِ تنگ بگویم اے دوست
آشنایم بتو غیرِ تو بیگانۂ ماست

کے سامنے رقصاں نظر آئے۔ ان سے دل مچل گیا اور آنکھیں روئے یار تکنے بیٹھیں۔ تاہم ہم نے بب کے بجائے صاحب کے نام میں زیادہ سرور اور قرب محسوس کیا۔ اس لئے ہم اسی نام سے انہیں پکارتے ہیں۔ صاحبی پائندہ باد!

بب محبت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ایک انوکھا مفہوم ہے، بب یعنی ماں کی چھاتی جہاں سے دودھ کے فوارے اُچھلتے ہیں اور محبت کے سرچشمے اُبلتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا گرمئی الفت کا زمزمہ ہے جس کا اصلی مطلب ماں کی ممتا کے سوا کسی فرد بشر کو معلوم نہیں۔ پس بب کھیل ہے، تماشا ہے اور بوس و کنار۔ مسکراہٹوں کا باغ و بہار ہے اور گل پاش انگڑائیوں کا چمن زار۔ بب بیدار ہوتا ہے جب اس کا پیار اس کی گودی میں سوتا ہو اور سراپا اختیار جب یہی پیار اس کے شانوں پر چڑھتا ہوا اور ناز کرتا ہوا کھیلتا ہو۔ آپ نے سنا ہے کہ کوئی درد کا مارا بے چارا صاحب کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جائے اور اسے دہی کے ساتھ چاول ملا ملا کر کھلایا جائے اور صاحب بس اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہیں؟ ۱۹۸۵ میں جب صاحب جلال میں ہوتے تھے اور جب شیر بھی ان کے پاس سے نہیں گذرتے

پھر لگاؤ چھاتیوں سے اس یتیمِ زار کو ماں کی طرح پیار کر لو بے کس و لاچار کو

حبیبؔ
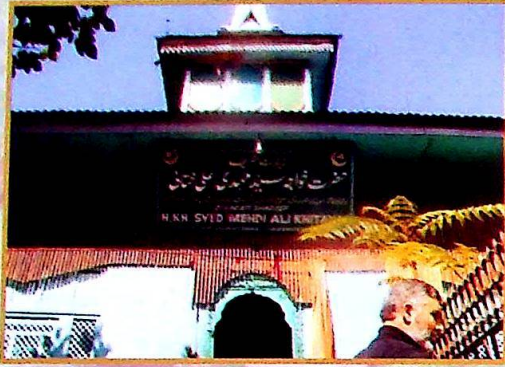
مجھے یہ [illegible] میری آنکھوں کے سامنے۔ بب یہ بھی ہے اور بہت کچھ اور بھی۔ بے قرار دیکھنے کیلئے کہ کب [illegible] (اس کی تسکینِ خاطر بیٹی) پھلے پھولے اور زندگی کے مقدّس منصب پر بیٹھنے کیلئے طیّار ہو جائے۔

هم نے مولانا آزاد کی طرح طیّار لفظ چن لیا کیونکہ یہ "[illegible] تا ہے اور "ّ" سے چار سے پانچ ہو جاتا ہے۔ اس طرح زبان کا حسن بڑھتا ہے اور "ّ" سے معنی کے باب کھولتا ہے۔ بب کا کمال بھی یہی کہ جب کھولنے پر آئے تب سب کچھ کھول دے اور جب اس کا منظور نظر کھُل نہ جائے تب یکدم گھمبیر ہو جائے کہ کھُلتا کیوں نہیں۔ شفقت اور محبت کی کہانی لکھ لکھ کر بھی لکھی نہیں جاسکتی اور کہتے کہتے بھی کہی نہیں جاسکتی۔ "بب" سمجھ لیجئے کہ یہی شفقت اور محبت کی دائمی داستان ہے جس کے ان کھلے باب سننے کیلئے انسانیت محوِ انتظار ہے!

عشہ پیر دریائے جہلم کے کنارے آباد ہے۔
اس محلے میں حضرت سید مہدی علی کا روضۂ مبارک

> "شیخ مہدی علی سوپوری وقت کے اعلیٰ تربیت یافتہ بزرگوں میں سے تھے۔ کافی علوم حاصل کئے تھے اور کافی سیر وسیاحت کی اور بہت سے مشائخ کا دیدار اس سفر میں کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقیؒ کی صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور اکتساب فیض کی۔ جب واپس کشمیر لوٹ آئے قصبۂ سوپور کو اپنا وطن بنایا۔ حضرت مجدّد الف ثانی کے مکتوب جلد دوم میں ان کا ایک خط شیخ مہدی علیؒ سوپوری کے نام ہے، جو تعزیت نامہ کے جواب میں ہے۔ شیخ کا مقبرہ سوپور میں مشہور ہے۔"
>
> واقعاتِ کشمیر
>
> خواجہ محمد اعظم دیدہ میری
>
> مترجم: ظہور شہداد اظہر، ص ۲۶۱

ہے۔لوگ عقیدت اور احترام سے انہیں اب بھی خواجہ صاحب (خوجہ صاب) کے نام سے پکارتے ہیں۔سید صاحب کا شجرۂ نسب سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ جا ملتا ہے۔یہ شجرہ پاکستان میں چھپا ہے اور میں نے اس کا خود مشاہدہ کیا۔صاحب کے فرزند جناب عطا محمد صاحب نے بھی فرمایا کہ حضرت ختائی ختلان سے آئے تھے۔ختلان اپنے خطے یعنی وسط ایشیا کا ترجمان ہے۔اس خطے میں اسلام کے قدم ٹھیک ٹھیک جمے ہوئے تھے اسلئے گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے اسلامی روح سے واقف تھا اور اسلام کی روحانی عظمت سے بھی۔اسلام کا جلال و جمال اس کے اداروں سے نمایاں تھا حتیٰ کہ لوگوں کے قدم بھی کچھ اس طرح اٹھتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا جرس بجنے لگتا تھا۔سنٹرل ایشیا کا یہ خطہ کئی سال سوویت روس کا حصہ بنا رہا مگر کمیونسٹوں کی معیشت اور مادیت بھی اس کی روح رواں چھین نہ سکی۔عین ممکن ہے کہ اس مادیت سے بھی وسط ایشیاء نے روح کی قوت وارتقاء کا اچھا ہی سبق پڑھا ہوگا۔ختلان کی طرف دیکھ کر ایک اور کھڑکی کھلتی ہے جس میں چین کی شاندار تہذیب دکھائی دیتی ہے۔اس تہذیب نے کمال ہی کر دکھایا تھا۔حکیموں اور خدا پرست بزرگوں نے زندگی کا نغمہ اعلیٰ سروں میں گانے کیلئے ساز بھی اچھے بنائے تھے جن سے آواز دوست دور سے سنائی دیتی تھی۔لاوت زے اور کنفیوشیس کی ہی مثال لیجئے۔ان کے تابان ستارے ابھی بھی آسمانِ چین پر چمک چمک کر پیلی پیلی راگنیاں سنا رہے ہیں اور کثیر تعداد میں عوام کی زندگی میں ہم آہنگی اور سوز و سرور پیدا کر رہے ہیں۔اب چین کی کھڑکی بند کر دیں ایک اور کھڑکی کھول دیں، یہ آذر بائیجان سے سارے ایران کی طرف کھلے گی۔اس میں زرتشت پیغمبر بھی نظر آئیں گے اور مشہور و معروف سائرس بھی جن کا ذکر قرآن پاک میں ذی القرنین کے روپ میں آیا ہے۔زرتشت وحدانیت کا پیغمبر تھا اور تابان نور کا طالب۔خدائے لم یزل کو حق الحق سمجھتا تھا اور اسے اہرمزدا کے نام سے پکارتا تھا۔اس کی ذات میں قدرت، جبروت، قدوسیت، علم و حکمت اور خیر دیکھتا تھا۔انسان کی لافانیت مانتا تھا مگر اس کے حصول کیلئے عمل صالح کو لازمی گردانتا تھا۔عمل صالح میں نہ رسمیں آتی تھیں نہ دکھاوے نہ خوف۔عبادت کا مقصود تھا رضائے الٰہی نہ کہ کانپ کانپ کر تھرتھراہٹ میں اس کی پرستش کرنا۔مہر منیر اور آگ کو نور کا منبع گردانتا تھا۔اس کا عقیدہ تھا کہ نور عرفان ہے معبود نہیں۔سائرس بھی پیغمبر تھا اور زرتشت کی راہ پر چلتا تھا ۔(مولانا آزاد نے اس بارے میں قرآن پاک کی شرح میں بہت کارآمد باتوں کا انکشاف کیا ہے)۔یہ وہ تمدنی، تہذیبی اور روحانی ماحول تھا جس میں ختلان اور آس پاس کے لوگ سانس لے رہے تھے۔ہم یہاں خصوصیت کے ساتھ حضرت میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر کریں گے۔یہ صاحب کبروی سلسلے کے ساتھ منسلک ہیں۔انہیں کشمیر کے لوگ محسن قرار دیتے ہیں اور صحیح۔انہوں نے ختلان کو ہی اپنی خواب گاہ چن لیا تھا۔

اس آرام گاہ سے ابھی بھی چہل اسرار کی تازہ تازہ ہوائیں آتی ہیں اور اپنی معانی کی خوشبوؤں سے معطّر کرتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو کاشمیر کی مسجدوں کی صبوحی پی لیجئے۔ کاشمیر جہاں اب بھی دار ورسن کی گہماگہمی کے باوجود اورادِ فتحیہ کی فلک شگاف مگر روح پرور فغان علی الصباح سنائی دیتی ہے یا دائماً بلا فناء ویا قائماً بلا زوال ویا مدبرا بلا وزیر دل میں گھس کر تلاطم پیدا کرتی ہے۔ سید مہدی علی ختائی مرحوم و مشہور بھی اسی خاندان سے اپنا سارا علم وعرفان ساتھ لیکر آئے اور وقت پر صاحب کے حوالے کر گئے۔ صاحب نے اس امانت کو بہت ہی احسن طریقے سے کام میں لایا۔

اے گرفتاران عشقت فارغ از مال و منال
والہانِ حضرتت را از خود و جنت ملال

اور

تا شدم ہمچو علیؑ پادشاہ شہر فنا
اسپ ہمت بسوئے ملکِ بقا میرانم

شاہ ہمدانؒ

عشہ پیر محلّہ بھی ایک اور بزرگ اشرف صاحب کے نام کے ساتھ منسوب ہے۔ اگر اشرف صاحب کی شخصیت جاذب نہ ہوتی، محلے کا نام عشہ پیر کیوں پڑتا۔ فرق اتنا ہے عشہ پیر میں ''ا'' کے بدلے ''ع'' آگئی۔ اشرف صاحب غالباً حضرت مہدی کے نواسے تھے۔ جناب خالق صاحب اور جناب یحیٰی صاحب بھی اسی خاندان سے وابستہ تھے اور دونوں صوفی بزرگ تھے۔ لوگ اب بھی صاحب کو خالق صاحب کے ساتھ جوڑتے
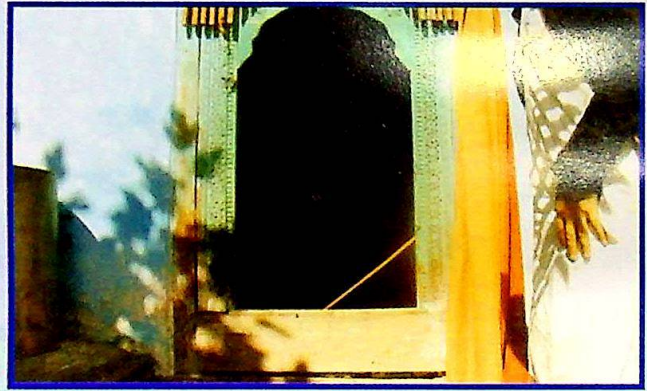
ہیں کیونکہ خالق صاحب کا طریقہ بھی قلندرانہ تھا۔ وہ جلالی تھے اور صاحب جبروت۔ دونوں صفات تصوف کی تقویم میں غیر معمولی ہیں۔ جانیں وہ جنہیں جلال سے گزرنا پڑے۔ یحییٰ صاحب کے طالب علموں میں جناب لسہ صاحب آرم جانے پہچانے بزرگ ہیں اور یہ کل ہی کی بات ہے۔ میں خود بھی ان سے ملا تھا اور ان کے پاس نمکین چائے اور مکّا کی روٹی کھائی تھی، بہت ہی لذیذ چائے! اکل و شرب کی یہ دونوں چیزیں روحانی زبان میں [illegible] ہیں۔ لسہ صاحب مرحوم نے اشاروں میں مسکراتے ہو[illegible] ایک بات کہی تھی جو ابھی بھی کبھی کبھی مجھے مغموم بنا[illegible] ہے۔ صاحب کے ساتھ بھی میرا معاملہ پہلے ہی دن بھٹے سے ہی شروع ہوا تھا۔ انہوں نے جو چائے پلائی تھی وہ تقریباً بلیک ٹی تھی۔ ابھی بھی اس چائے کے نشے حافظے میں تازہ ہیں اور جزو ایمان! روحانی اعتبار سے اس چائے کی نُدرت مسلّمہ ہے۔

عشہ پیر میں صاحب کا پیدا ہونا صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ عام اور سادہ لوح لوگوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ نشاندہی کریں کسی مقام کی اور دکھائیں کہ اس جگہ ان کا جنم ہوا اور اس جگہ ان کی پرورش ہوئی۔ یہاں ان کا گھر ہے اور وہاں ان کا محل، یہاں ان کے باغ باغیچے ہیں وہاں ان کا مزار۔ مگر بڑے لوگ، سعادت مند صاحبان پیدا ہوتے ہیں بڑی دنیا میں یا یوں کہیے کہ بڑی کائنات میں۔ وہ گاؤں میں بھی پیدا ہوتے ہیں اور شہر میں بھی۔ کاشمیر بھی ان کی جائے پیدائش اور ہندوستان، پاکستان،

می نہ گنجد آنکہ گفت اللہ ھو
در حدودِ ایں نظام چار سو
گرچہ آدم بردمید از آب و گل
رنگ و نم چوں گل کشید از آب و گل
حیف اگر در آب و گل غلطد مدام
حیف اگر برتر نہ پرّد زیں مقام
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند
مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند

اقبالؔ

He who has said "God is He"
is not contained
Within the confines of the
dimensioned order.
Although man sprang out
of water and clay,
From water and clay rose-like
drew colour and sap,
Alas, if he wanders for
ever in water and clay,
Alas if he soars not higher than
this station!
Man of reason, the soul is not
contained in dimensions;
The free man is a stranger to
every fetter and chain.

Arberry

عرب، شام، روم، ایران، توران بھی ان کی جنم بھومی۔ مشرق بھی ان کا وطن اور مغرب بھی ان کا دیس۔ دیس بدیس پیدا ہونے والے یہ ہرجائی انسان صورت ہوتے ہیں مگر ان کی صورتوں میں راز چھپے ہوتے ہیں۔ ان چھپے رازوں کو جاننے کیلئے نہ کاغذ درکار نہ قلم، نہ زبان نہ بیان۔ یہ راز ہونٹ سینے سے کھل جاتے ہیں اور چپ چاپ دھیان لگا کر بیٹھنے سے۔ یہ راز کھلتے ہیں تو اندر ہی اندر جھرنے جیسے بہنے لگتے ہیں جو دل کی دنیا بہاراں کرتے ہیں اور آباد۔ ان بہاروں سے گلشن گلشن بستیاں نمودار ہو جاتی ہیں جن کی طرف دیکھ کر فردوسِ بریں بھی [illegible] تکنے لگتا ہے۔ یہ سدا بہار لوگ نہ پیدا ہوتے ہیں نہ مرتے ہیں، ان لامکانیوں کا نہ گھر ہوتا ہے نہ گھر بار۔ گور میں بھی بیٹھے ہوں یا سوئے ہوں پھر بھی گور و کفن سے ہوتے ہیں آزاد!

عشہ پیر محلے میں پیدا ہونے کی بات ابھی جاری! فقیر بڑی ہستی ہوتی ہے، جیسے ہمارے صاحب۔ یہ [illegible] پیدا ہوتی ہے اور نہ ایک ہی دفعہ مرتی ہے۔ اس کا جینا مرنا لگاتار عمل ہے جس کا دوسرا نام زندگی ہے۔ زندگی [illegible] صبح کبھی شام، کبھی دن کبھی رات، کبھی ماہ کبھی سال، کبھی قرن کبھی دوام۔ یہ کبھی خورد ہوتی ہے کبھی [illegible] جوان کبھی کہن سال، کبھی خوش، کبھی ناخوش، کبھی نالاں۔ روئے تو ہنسنے کیلئے، ہنسے تو رونے کیلئے۔ خواب میں بیدار ہے تو بیداریوں میں خوابیدہ۔ گاہے زمینوں پر چلتی ہے، دوڑتی ہے، بھاگتی ہے، اچھلتی ہے، [illegible] کی بلندیوں میں اڑتی ہے، اس طرح کہ اڑتے اڑتے کبھی کسی جگہ ٹھہرے نہیں نہ آشیاں بنائے۔ اس کے بدلے ہوئے یہ رنگ یہ روپ بدلاؤ کا، تغیر کا گہرا احساس پیدا کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہی بدلاؤ، یہی تغیر زندگی ہے یا زندگی کا اصلی روپ۔ ہر وقت بدلنا ہی قوت ہے اور ہر وقت بدلتے ہوئے نکھرنا اور نت نئی صورتیں بنانا حیات ہے۔ اگر لحظہ لحظہ موت نہ ہو تو زندگی کا اگلا قدم کیسے اٹھے اور قدم اٹھنے سے آگے بڑھے۔ پھلنے پھولنے، کھلنے اور کھل کھل کر اور کھلنے کے امکانات کیسے پیدا ہوں۔ پس پیدا ہونا مرنا ہے اور مرنا پیدا ہونا۔ مرجاؤ اس سے پہلے کہ موت تجھے گھسیٹ کر لے جائے، مرجاؤ اس لئے کہ حیاتِ جاودانی حاصل ہو جائے اور اس کے بیچوں بیچ اس طرح کھڑے ہو جاؤ کہ کبھی مرو نہیں!

صاحب کے والد محترم کا اسم پاک احسن تھا اور ان کی والدہ محترمہ کا شاہ بانو آپا۔ دونوں کا احسان ہم پر جو دربار احد کے خوشہ چین ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں کچھ اور۔ فی الحال یہ کہ صاحب کا ایک ہی بھائی تھا مصطفیٰ جو جواں سال ہی صاحب کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ مصطفیٰ پہلے ہی کیوں رخصت ہوا اس میں بھی کوئی مصلحتِ الٰہی ہوگی۔ مگر صاحب کی دو بہنیں بھی تھیں، صرف ماں کی طرف سے حاجرہ اور سگی بہن ستارہ۔ دونوں نام معنی خیز اور پرکشش۔ یہ دل کی آواز ہے یا معروضی حقیقت، اللہ جانے۔ ان کی رفیقۂ حیات کا اسم مبارک بھی

حاجرہ جس کی بھی دنیائے دین میں کافی اہمیت۔ ان کی بطن سے اولاد ہوئی، جناب عطا محمد صاحب اور مرحومہ شریفہ صاحبہ۔ صاحب زادی بھی عین جوانی میں داغِ مفارقت دیکے چلی گئیں اور یہ ایک نئے کربلا کی دل سوز کہانی ہے جو معمّہ بھی ہے۔ فرزند کا دوسرا نام مشتاق جوان کی والدہ کا دیا ہوا نام ہے۔ یہی نام ان کے سرکاری کاغذوں میں درج ہے۔ والدہ مرحومہ سنگرامہ پورہ سوپور کی رہنے والی تھیں۔

نطق کا دم گھٹ گیا مبہوت عالم رہ گیا
کون ہے خونین کفن میں یہ شہید کربلا
شامِ غم میں روز روشن کا جگر مجروح ہوا
بہہ گئے سیّال آتش سینہ چا کانِ وفا

حبیب

احسن صاحب اور شاہ بانو کا درخشاں خورشید نور کا مجسمہ ثابت ہوا۔ یوں تو قرآن پاک کی زبان میں کائنات کی ہر چیز نور ہے مگر صاحب نے میدانِ عرفان میں گھوڑے دوڑائے، اتنی خوبی سے کہ دیدۂ بینا حیرت سے تکتی رہی۔ احسن کے اس نور نے چاہ دیکھے، سودا میر دیکھے، مصر جیسے بازار دیکھے، عزیز اور زلیخا جیسے خریدار دیکھے اور اس طرح دھیرے دھیرے زینتِ محل عرفان بن گئے، غیبی باتوں کی تشریح کرنے لگے اور خدا کا کلام سمجھانے لگے۔ شمس وقمر سمجھایا، تارے ستارے سمجھائے، سجدہ وسجود سمجھایا اور زمین کے خزانوں کی معموری سنبھالی۔ فیض کا دربار عام کیا جس میں ان لوگوں کو بھی جگہ دی جنھوں نے سوانگ رچائے تھے کہ انہیں آلوسہ جنگل میں بھیڑیئے نے کھایا۔ یہ آجکل کے نمرودی نار سے بھی گزر نکلے اور خوب سے خوب تر کی آرزوئیں کرتے کرتے انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا صلے وما انا من المشرکین کی تصدیق قلب سے کرتے گئے۔ قلبی تصدیق سے ہی بادۂ عرفان کے جام ملتے ہیں اور تخلیقی بقا کے انعام۔

شاہ بانو روح کی وہ حساس قوت ہے جو دم سے دم ملا کر مشاہدات، تفکرات اور خیالات وتخیلات کو ایک ہی خطِ مستقیم میں لاتی ہے۔ صاحب کی

شاہ بانو بھی غور و فکر کے پنگوڑے میں پلتی رہی اور صاحب کو دماغی و قلبی طاقتوں کا صحیح صحیح استعمال سکھاتی رہی اور انہیں لامتناہی مقامات کی طرف بڑھاتی گئی۔ خدا ایسی ماں کی گود لعل ہائے بے بہا اور درہائے ناسفتہ سے اور اور بھر دے۔ ہمیں بھی ایسی ہی ماؤں کا دودھ نصیب ہو! احسن اور شاہ آپا کا اقبال تابندہ پایندہ۔ اللہ ھو!

دریائے جہلم کے کنارے عشہ پیر میں صاحب کا جنم غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جہلم یہاں بہت گہرا ہوتا ہے اور وسیع بھی، اس لئے آہستہ آہستہ بھی بہتا ہے اگر سیلاب نہ آئی ہو۔ پانی ہی پانی نے ہمارے صاحب کا استقبال کیا اور پانی ہی زندگانی ہے، حیات جاودانی ہے۔ سکندر حضرت خضر کو ساتھ لیکر حیات ڈھونڈنے نکلا مگر خالی لوٹ آیا۔ یہاں تو پانی استقبال کرنے نکلا، ویری ناگ سے سوپور تک کا تجربہ ساتھ لیکے چلا استقبال کرنے نئے مہمان کو اور اس تجربے میں جھیل ڈل، مانسبل اور ولر جھیل کی کہانیاں شامل تھیں۔ اس میں مچھلیوں اور ماہی گیروں کے متضاد واردات بھی شامل تھے، بادو باراں کے دل دہلانے والی حکایات کی

سلہ وتھی تھی ژیری درایکھ کاڑھس
بدنام کورتھس کھنہ بل کس گاڑھس
کانی التھ نار سوری یے
وولے کستوری یے دورہ مے تراوَ پاری یے
رسول میر

تمثیل آدم پرژھام حُبابس
رندہ چھک زندہ کتھ آبس سیتی
محمود گامی

ملاوٹ تھی اور زمانے کے اتار وچڑھاؤ کی من موجیاں! ختائی روحانیت کا چشم و چراغ جب وتستا کی روانیوں پر غور وخوض کرتا ہوتا تو کن کن بالائی اور زمینی عالموں کے رازہائے پنہاں سے آشنائی حاصل کرتا ہوتا اور وہ اپنے قلبی واردات کو کس کس طرح جذب کرتا ہوتا۔ شاباش اے عظیم قلندر کیا دل وجگر پایا ہے دریا کا پانی پینے کا! احسن ہی احسن ہوا حسن کے سپوت اور سچ مچ شاہ آپا کی گودی میں پلے ہوئے ہو! یہ دریا دریائے جہلم ہے مگر وہ دریا جو ختلان سے آیا ہے اور خالق و یحییٰ کے دلوں میں پلتا ہوا آپ کے حوالے کیا گیا، اس کی دو ایک چھینٹیں ہماری طرف بھی پھینک دیجیو کہ ہمارا بھی بیڑا پار ہو جائے۔

بڑے دریا میں بارش کا پانی گرتا ہی ہے مگر سیلابی پانی اور نالیوں کا نکاس بھی وہاں ہی پہنچتا ہے۔ سیلاب یا تو لگاتار بارشوں سے آتے ہیں، یا سخت گرمی میں برف پگلنے سے۔ اسی طرح ندیوں، آبجوؤں، جھرنوں، نالوں اور چشموں کا پانی بھی دریا کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پانی کے اس ہمہ وقت جمع ہونے سے دریا کا بہاؤ، اس کا زور وشور بڑھتا رہتا ہے مگر جس وقت پانی کم ہو جاتا ہے، کم جمع ہوتا ہے تو دریا کا پانی بھی کم ہو جاتا ہے اور اس کا زور وشور بھی۔ مگر دریا ایک ہی ملک، ایک ہی براعظم میں نہیں بہتے، ساری دنیا میں بہتے ہیں۔ گنگا ہندوستان میں بہتی ہے، ہوانگ ہو چین میں بہتا ہے، دجلہ و فرات عراق میں۔ اور بھی بہت سارے دریا ہیں جو اور ملکوں میں بہتے ہیں۔ پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر مگر سمندر ایک ہی تو نہیں۔ دنیا کے سارے سمندر پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور ذخیرہ نہیں۔ صرف ایک اور بات یاد رہے کہ پانی کروڑوں اور اربوں پیڑ پودوں میں بھی ہوتا ہے جس طرح حیوانوں، پرندوں اور انسانوں کے اندر بھی ہوتا ہے۔ بادل بھی پانی ہے اور گلیشیر بھی۔ پانی ہو، دریا ہو یا سمندر، ہم یہاں ان کو مثال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پانی دراصل علامت ہے عرفان یا معرفت کی یا علم و دانش کی۔ ہم کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے معرفت کے جام جگہ جگہ پیے ہیں۔ مگر معرفت کسی خاص جگہ یا خاص ملک کی میراث نہیں ہوتی اور نہ کسی خاص جماعت کی۔ ہر شخص کم یا زیادہ حقیقت سے واقف ہوتا ہے اس لئے کم یا زیادہ خدا سے قریب۔ جب وہ کسی اچھے آدمی سے تعلق پیدا کرتا ہے تو اس کا عرفان حق بڑھتا ہے۔ جب بہت سارے لوگ کسی بڑے شخص کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہیں، وہ سب اپنی خداشناسی اور اپنے عرفان میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر وہ بڑا آدمی بھی سارے گروپ کی خداشناسی سے واقف ہو جاتا ہے اور اس طرح دھیرے دھیرے بحر عرفان بن جاتا ہے۔ یہ بڑے عارف ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں اور ہر ملک، ہر وقت اور ہر زماں میں۔ کوئی بہت بڑا علامہ بن جاتا ہے، کوئی درویش، کوئی ریشی، کوئی مُنی، کوئی قلندر، کوئی ملنگ، کوئی ولی، کوئی

اوتار، نبی رسول۔ اولیاء میں کوئی ابدال کوئی غوث۔ یہ نام سننے سے نہیں کھلتے، تجربات سے کھلتے ہیں جو حاصل کرنے پڑتے ہیں، خون جگر پلا پلا کر۔ تب کہیں انکا مرتبہ، ان کا کمال، ان کی حیثیت اور ان کا فیض وکرم سمجھ میں آتا ہے۔ کتابیں ان کا سرسری تعارف کراتی ہیں۔ اصلی جان پہچان نزدیک جانے اور جاں فدا کرنے سے ہوتی ہے۔ ریاضت وغور وفکر بس بہانہ ہے!

یہ سب باتیں اس لئے کی گئیں کہ صاحب سوپور میں پیدا تو ہوئے، جہلم کا بھی پانی پیا مگر رفتہ رفتہ سارا سمندر بلکہ سارے سمندر پی لئے اور پی پی کر اور پینے کی چاہ کی۔ میں نے خود ان سے سنا ہے کہ عرفان کا سارا سمندر پورے کا پورا کسی نے نہیں پیا۔ جتنا پیا اتنا ہی اور پینا چاہا۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے سبحانك ما عرفناك حق معرفتك اور اس پر دل وجاں سے عمل کرتے تھے۔ صاحب بھی دل ہی دل میں [illegible] کیا پڑھتے تھے اور کیا پانا چاہتے تھے، اتنے بڑے صاحب عرفان ہوتے ہوئے بھی۔ سبحان اللہ! [illegible] صاحب کی اتنی بڑی آرزو!

عشہ پیر محلے کے پاس دریائے جہلم کے اوپر ایک بڑا پل ہے۔ پہلے یہاں لکڑی کا پُل تھا جس میں لازماً لوہے کے کیل وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ وہ پل جب پرانا ہو گیا اور بوسیدہ تو اس کی جگہ نیا پل بنایا گیا جدید طریقے [illegible] انجینئرنگ کی ماہرانہ صلاحیتوں کا نتیجہ! اس میں باجری، ریت، سیمنٹ اور کافی لوہا استعمال ہوا ہے اور فنکاروں کی فنی صلاحیتیں۔ یہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس طرح تعمیرات کے انداز بدل گئے، طریقے بدل

گئے، زیادہ بوجھ برداشت کرنے کیلئے، زیادہ آمد ورفت ممکن بنانے کیلئے، اسی طرح روحانیت کے انداز اور طریقے بدل گئے۔ اس میں بھی نئی نئی دریافتوں اور نئے نئے علوم اور تقاضوں نے بدلاؤ لائے اور اس کے سامان بھی بہتر ہوگئے اور تربیت وریاضت کے طور طریقے بھی۔ زمانے کی کوئی گردش فضول نہیں، کوئی روش غلط نہیں، صرف یہ کہ انسان ہمہ تن، ہر وقت خدائے پاک کے ساتھ شعوری طور پر جڑا ہوا ہو اور اپنی مرضی اپنی استعداد سے بھی۔ پس زمانہ اپنی تبدیلیوں کے ساتھ انسانی روح کیلئے نئے وسائل پیدا کرتا ہے۔ آج کے روحانی تجربات اور معاملات نئے نئے زاویوں سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی پرداخت کا بھی انہی زاویوں کے پیش نظر انتظام کیا جاتا ہے۔ ہم سوپور کے پل کے نئے انتظام اور نئی بناوٹ کا ذکر کررہے تھے۔ اگرچہ پرانا پل ابھی بھی اپنی جگہ پر قائم ہے، پھر بھی اس کی افادیت بہت ہی کم ہوگئی ہے اور نیا پل سارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ لوہے اور باجری، ریت اور سیمنٹ نے اسے مضبوطی بخش دی ہے اس لئے اس پر سے کافی وزن دار گاڑیوں کا ٹریفک ہر موسم میں بہر صورت چل سکتا ہے، اگر میں اس پل کو فن کا نمونہ ثابت کرنے کی اہلیت رکھتا اور اس کی باجری، ریت اور سیمنٹ وغیرہ کا روحانی تجزیہ کرسکتا تو اس کی اصلی شناخت ممکن ہوسکتی اور میری تحریر بھی ساری کی ساری کھل کے سامنے آتی اپنی نکتہ رس اور نکتہ سنج اداؤں کے ساتھ!

بہر کیف سوپور کا پل یکدم فسٹ کلاس! اس کے اوپر رات دن عبور و مرور رہتا ہے۔ گاڑیاں، موٹریں، چھکڑے، موٹر سائیکل، سائیکل، تانگے، یکّے اس کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ کوئی موٹر چھوٹی ہوتی ہے کوئی بڑی، کوئی اتنی بڑی اور ہائے فائے کہ اس کی قیمت سے دس افراد کا کوئی غریب گھرانہ یکدم سال بھر گزارہ کرسکتا ہے۔ کوئی اتنی بوسیدہ موٹر کہ پیچھے سے بس دھواں ہی دھواں چھوڑتی ہے۔ گویا اس کا معدہ کام ہی نہیں کرتا۔ کوئی موٹر بس ڈم ڈم ڈم ڈم ڈسکو ڈانس پر تیز چلتا ہے کہ نہ آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ۔ لوگ بھی ہر قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ کوئی امیر، کوئی غریب، کوئی زردار، کوئی نادار، کوئی بیمار، کوئی ہٹا کٹا، کوئی سرخم، کوئی سربلند، کوئی مغرور، مسرور اور کوئی غم کا مارا منہ کھولے پل پر سے گزرتا ہے مگر نہ جانے شیخ چلّی کی طرح کیا کیا سوچتا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں، کام ہے تو صبح وشام، نہ آرام نہ تسکین نہ اطمینان۔ کسی کے پاس دس بیس روپے کمانے کا بھی انتظام نہیں۔ پیر ہلاتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ چلتا بھی ہے کہ نہیں۔ کوئی ایسا غازی کہ غازی، کوئی بے نمازی بے چارا گردن جھکائے چلتا ہے کہ گویا صرف اس کو خدا نے بھول ڈالا ہے۔ کوئی مونچھوں کو تاؤ دیکے چلے کہ زہد اور پرہیز گاری پر نازاں اور کوئی بس خدا کی رحمت کا امیدوار افتاں وخیزاں چلے کہ کہیں باد بہاری چلے اور اُس کا جاڑا اپنی یخ بستگی توڑے!

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
جذبی

ایسا ہی ایک پل ہے جس پر سے گزرنا ہے سب کو کامل انسان سے ملنے کیلئے۔ ایسے ہی پل کے نیچے بڑا گہرا، بڑا چوڑا دریا بہہ رہا ہے جس کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھو تو جاں نکل جاتی ہے۔ اس پل کے ایک طرف انسان کامل کھڑا ہے بالکل الف، قد دراز، شمشاد، ٹہلتا ہے اس طرح کہ پھول کھلتے ہیں۔ وہ خوش و خرم ہے اور آزردہ بھی۔ آزردہ اسلئے کہ اسے فکر ہے کہ کوئی پل پار کرنے سے رہ نہ جائے۔ پل خطرناک ہے البتہ۔ نہ اس پر کہیں انسان ٹھہر سکتا ہے اور نہ واپس جا سکتا ہے۔ واپس جائے تو بھی گر جائے اور رکے بھی تو بھی گر جائے۔ گرا تو دریا میں ڈوب گیا اور پانی کی لہروں میں کھو گیا۔ اس لئے جانا ہے ضرور اور اس میں چارہ نہیں۔ انسان کامل سے جو ملنا ہے۔ چلتے چلتے جاتے جاتے مگر سیدھا آگے کی طرف دیکھنا ہے۔ ورنہ اگر کسی چھکڑے والے نے ٹکر ماری تو بے چارا فنا ہو گیا۔

عشہ پیر کے صاحب پل پار کرنے والوں کی مدد کرتے ہیں، گاہے بدیر گاہے بزود۔ اگر انسانِ کامل سے ملنے کی زبردست تڑپ ہے، عشق ہے، شوق ہے تو مدد تیز پہنچتی ہے، اگر سستی ہے، کاہلی ہے، غفلت ہے تو معاملۂ امداد بھی ذرا سست۔ اگر صاحب جوش میں آئیں تو آن کی آن میں مدد فراہم اور راہی کی مشکل

حل۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کبھی دست گیری اتنی جوش میں آتی ہے کہ کوئی تھکا ہوا، ٹوٹا ہوا مسافر پل پار کر لیتا ہے اور انسان کامل کے ساتھ بغل گیر ہو جاتا ہے۔ محبت کی راہیں کچھ ایسی عجیب وغریب ہیں کہ سمجھتے سمجھتے سمجھ میں نہیں آتیں!

عشہ پیر میں پل کے پاس ایک اور دل چسپ مگر نرالی چیز ہے، گھاٹ۔ جس نے اس گھاٹ کا پانی پیا، سمجھ لیجئے کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، ہر طرح کا، اویسی پانی، چستی پانی، کبروی سہروردی پانی، علوی اور قادری پانی، سب رنگ پانی، سب رس پانی، اس میں ملاوٹ نہیں، خرابی نہیں۔ سو فیصدی صاف پانی۔ صحت کیلئے مفید، ہر قسم کی صحت کیلئے، دل کے درد کی دوا، آنکھوں کی شفا، داروئے قوت، شرطیہ صفا، یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھئے۔ مگر اس گھاٹ کا کشمیری نام ہے یار بل، یاروں کے ملنے کی جگہ، یار سے ملنے کی جگہ۔ یار دوست کو کہتے ہیں مگر یار میں جو بات ہے وہ دوست میں نہیں۔ یار میں ادا بھی ہے، ناز بھی ہے اور جلال بھی۔ یہاں کا ملن مختصر، بس پل دو پل کا اور اس کی کہانی بہت لمبی۔ رات ہو یا دن، خزاں ہو کہ بہار، چلچلاتی دھوپ ہو یا ٹھٹھرتا جاڑا۔ زمہریر کی کاٹ ہو یا اس کی بندشیں، یار سے ملنے کی چاہت ہوئی اور آپ مل گئے۔ روکنے والا کوئی نہیں۔ نہ چوکیدار، نہ پہرے دار، نہ پولیس والا نہ ڈنڈا مار، یہاں کوئی یار پیار کے بغیر کچھ نہیں جان سکتا۔ یہاں پیار ہی پیار ہے اور اس کے سلگتے ہوئے لالہ زار۔ اس گھاٹ کے پانیوں کے ساتھ امرت دھارا ملا ہوا ہے اور اس میں مبالغے کی گنجائش نہیں۔ یارہ بل کا سب سے انوکھا راز۔ جو یہاں نہیں آسکتا اس کے پاس یار خود ہی چلا جاتا ہے۔ یار جو ہے! چلا کیا جاتا ہے کہ امرت پلاتا ہے اور داروئے معرفت! اس یار کا پیار کانٹے دار۔ ایک دفعہ دل میں چبھ گیا تو کبھی نکلا نہیں!

صاحب کی تعلیم وتربیت کے بارے میں چند الفاظ! اگر کریما، نام حق، بدائع منظوم، پند نامہ اور گلستان بوستان پڑھنے سے کسی پیرزادہ گھرانے کا بچہ ملنگ بن جاتا تو کشمیر میں، جہاں بہت ایسے گھرانے ہیں جن میں ان کتابوں سے تعلیم شروع ہوتی تھی اور اکثر ختم بھی، گھر گھر قلندر یا ملنگ پیدا ہوئے ہوتے۔ مگر

قلندری مکتبوں اور مدرسوں کی دین نہیں۔ وہاں تو خاکبازی کے سوا کچھ سکھایا نہیں جاتا۔ قلندری سمجھ لیجئے آہوئے تاتاری ہے جو ادب، حکمت، منطق، سائنس، ٹکنالوجی اور ریاضی سے بھی دکھائی نہیں پڑتی۔ اس کیلئے نوائے صبح گاہی اور خونِ جگر کی ضرورت ہے۔ زخمی دل لہو پی پی کر راتیں گذارے، شمع کی طرح پگھلے تب شاید بات بنے گی۔ پھر اگر کوئی نگاہِ کرم اچانک بجلی کی طرح گرے تو ہزاروں سال جو راستہ طے نہ ہو جائے وہ آن کی آن میں منزل مقصود اقبال مند کے سامنے لا کھڑا کرے۔ فارسی قلموں سے تختیاں لکھنے سے کیا ہوگا یا اس زمانے [illegible] یا آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے کیا۔ جب انسان کے دل کا دروازہ کھل جائے، یا یوں کہیے کہ اس کی کھڑکیاں ادھر اُدھر اور ہر طرف یکے بعد دیگرے آناً فاناً کھل جائیں تب عالم غیب سے آوازیں آئیں گی، قلب دیکھنے لگے گا اور بصارت بصیرت میں بدل جائیگی، پھر نہایت ہی طاقت اور شدید القویٰ وجود فی القوی [illegible] کیلئے آجائیں گے اور علم کا ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ ہر آواز آوازِ دوست ہوں اور ہر شجر وادی سینا کا شجرِ نور و نار۔ زمین اور آسماں کا رشتہ بندھ جائیگا اور پاتال کی راگنیاں دست [illegible] کو نغمہ ہائے حوران ارم سنانے کیلئے لے جائیں گی۔ بلا واسب کو نہیں آتا۔ جنہیں آتا ہے وہ بھی سب کے سب اندر نہیں جاتے، یکے بعد دیگرے ہی سہی۔ کوئی اقبال مند، ازلی مقبول ہو عشہ پیر کے احد جاناں کی [illegible] میں بلایا جائے، جس کے ساتھ راز و نیاز کی محفلیں آراستہ کی جائیں اور جس کے سر پر تاج شاہنشہی رکھا جائے سریر علم پر بیٹھنے کیلئے اور دلوں پر خبر و نظر کی طاقت سے حکومت کرنے کیلئے تو بات بنے وہ بھی ایسی کہ باید و شاید۔ بلا شک و شبہ و چوں و چرا ہمارے صاحب یزدانی لاڈلے ٹھہرے، تاجدار زماں بنے اور سب کچھ۔ یہاں نوزائیدہ طفلگی ہے اس موضوع پر لکھنے کی جسارت کرنے کیلئے! بایں ہمہ فاذ کرونی از کر کم واشکرولی ولاتکفرون، لم یکن الذین کفرو، تبت یدا ابی لھب، دلاہر کہ بنہاد خوانِ کرم بشد در جہاں نامدار کرم جیسے اشاروں سے جوان کی زبان مبارک پر دفعتاً کسی کسی وقت چڑھتے تھے، اخذ کیا جاسکتا ہے کہ احسن گھرانے کے اس یزدانی لاڈلے نے اچھی تربیت و تعلیم پائی تھی۔ ان کی وضع قطع، ان کے انداز اکل و شرب اور ان کے پہناوؤں سے جو میں نے ستائیس اٹھائیس برس میں شاذ و نادر ہی دیکھے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ شریف النفس، آراستۂ تہذیب اور کلی مدبّر تھے۔ ان وتیروں نے دل پر جو نقش چھوڑ دئے وہ ایمان کی صورت اختیار کر بیٹھے!

عشہ پیر کا، دریا کا، پل اور گھاٹ کا ذکر آیا مگر سوپور کا نہیں جوان سب کا باوا آدم ٹھہرا۔ یہاں تو اس دیس میں سب اسے ایپل ٹاؤن (apple town) کہتے ہیں بڑے دھوم دھام کے ساتھ اور ناز و ادا کے ساتھ مگر

ابھی سب سے بڑا ناز باقی ہے۔ آپ اسے نازِ سیب کہیں تو نامناسب نہیں ہوگا۔ یہاں کشمیر کے کسی علاقے میں اتنے سیب پیدا نہیں ہوتے جتنے یہاں۔ چھوٹے، بڑے، گرمائی، خزانی، لال لال، پیلے پیلے، میٹھے کھٹے ہر قسم کے سیب پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہیں، کشمیر میں اور کشمیر سے باہر بھی۔ مسلمان بھی کھاتے ہیں اور ہندو بھی، سکھ بھی اس کے مزے لیتے ہیں اور ماشاء اللہ عیسائی بھی۔ اس کا رس پیتے ہیں جس طرح تازہ تازہ مازہ آم کا۔ یہ فرنگی فریب تو نہیں دیتے جب سیب کو فاربڈن فروٹ (forbidden fruit) کہتے ہیں، یعنی میوۂ افسوس؟ میوۂ افسوس کا گناہ معاف کرانے کیلئے ان کی نظر میں عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام دنیا میں مبعوث ہوئے، مگر یہاں عقیدہ کچھ اور ہے۔ ہم سیب کھائیں گے اور مزے لے لے کر کھائیں گے۔ کچھ گ[illegible]نہیں، کچھ برا نہیں۔ اور اگر نہیں کھائیں گے، صحت کیسے پائیں گے؟ تندرست من درست کیسے رہیں گے؟ روز [illegible]ھاؤ اور ڈاکٹر کو چھٹی کرو۔ سچ پوچھئے تو سوپور کے سیبوں کے لال لال رنگ قصۂ آدم کو رنگین بنا دیتے ہیں اور ا[illegible]ود ملائکہ بنا دیتے ہیں۔ آدم خا[illegible] کو وہاں پہنچا دیتے ہیں جہاں سے لی مع اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں کا سیب کھانے والا ستاروں کی جگمگاتی محفل میں ماہتاب کا کھلا رنگ و روپ بھی دیکھتا ہے اور خورشید تاباں کی تپش میں رس بھی ڈھونڈتا ہے، انگور کا ہو یا لیموں کا۔

سیب نے سوپور کو سو پور، سو فیصدی، یا انگریزی میں ہنڈرڈ پرسنٹ بنا دیا۔ سوپوری کو بناتے بناتے سوپر مین بنا دیا یا انسانِ کامل۔ اس سپر مین کا قد ساڑھے چھ فٹ سے اوپر اوپر ہوگا خدا کے حوالے! ہم اس ٹال مین کو دل کے کواڑ کھول کر، خونِ جگر پلا پلا کر پیار کرتے ہیں یعنی لو۔ اور ہمارا لو ہر گز بلائنڈ (blind) نہیں۔ دیکھتا ہے ضرور اور خوب خوب دیکھتا ہے۔

عشہ پیر محلے کے جس مکان میں صاحب کا جنم ہوا تھا، وہاں وہ خود بھی رہتے تھے۔ اسی مکان میں ان کی شادی ہوئی تھی اور وہاں ہی ان کے بچے ہوئے تھے۔ عطاء محمد صاحب ابھی تین سال کے ہی تھے اور ان کی ہمشیرہ نوزائیدہ بچی ماں کی گودی میں ہی تھی کہ صاحب کے انداز بدل گئے اور ان کے اوپر جلالی کیفیات چھا

گئیں، اس طرح کہ ان کی زندگی میں زبردست انقلاب آگیا۔ پہلا ہی قدم اٹھایا کہ مکان کی چھت گرادی اور گھر بار چھوڑ کر چلے گئے۔ پروانہ کیا کہ بیوی بچوں کا حال کیا ہوگا اور وہ کس طرح اپنے ایام بے یار و مددگار گذاریں گے۔ رفیقۂ حیات نے کیا کیا کہ وہ بھی بچوں کو اٹھا کے سنگرام پورہ سوپور چلی گئیں اپنے مائیکے۔ کرتی بھی [illegible] صاحب جلالی، بہت ہی جلالی، گھر چھوڑ کر چلے گئے، مکان کی چھت بھی گری، اس سے پہلے نوکری بھی گئی۔ وہ کرتی تو کیا کرتی۔

ان دنوں گھرانے میں طوفان برپا ہوا تھا اور طوفان اور بھی ہچکولے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ رفیقۂ حیات، حاجرہ صاحبہ [illegible] والدہ، مائیکے تو چلی گئیں مگر ان کا دل روتا ہوتا ضرور جس طرح میرا دل انہی کے ساتھ اس وقت روتا ہے [illegible] ان کا رونا کہاں اور میرا رونا کہاں۔ اس کے بعد وہ جواں سال کہتے ہیں معدے کی تکلیف سے [illegible] گئیں۔ باری تعالیٰ ان کی روح کو اپنی رحمتوں کے بے پایاں سمندر میں دھوئے! بچے ساجدہ صاحبہ اپنی نانی کے دامن میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ساجدہ صاحبہ کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ ایک دن انجانے میں عجیب [illegible] بیچ اس بہادر خاتون کیلئے کچھ کپڑا بھی خرید لایا ہے۔ بہر کیف ہمیں ملال نہیں کہ وہ کیوں چلی گئیں کیونکہ یہ خدا کے اپنے رنگ ہیں اور نرالے ڈھنگ، ان میں ہمارا کیا دخل عمل۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صاحب نے جلال میں یہ کیوں کیا، وہ کیوں کیا۔ پہلے یہ کہ ہم راز ہائے نہاں سے واقف نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ براہیمی روایات قائم کرتے ہوئے اپنا سب کچھ چھوڑ رہے تھے، اپنی معصوم اولاد کو خاص کر۔ تیسرے یہ کہ جب تک انسان پرانا گھر نہ اجاڑے، نیا گھر بنے کیسے۔ چوتھے یہ کہ بگاڑ ایک نئے نظام، ایک بہتر انتظام کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ قلندرانہ جبروت کے سامنے ہماری عقل، ہماری سوچ کی گنجائش کیا۔ رب العالمین اپنی قدرت سے جو چاہتا ہے وہ کر بیٹھتا ہے، اپنی عزت اور اپنی جبروت کو کام میں لاتے ہوئے جو چاہتا ہے اس کیلئے حکم دیتا ہے۔ ہر امر اور ہر کام کا انجام بھی وہی معین کرتا ہے۔ ہر چیز فانی ہے صرف اس کی شکل و شمائل اور اس کا جلوۂ بیباک قائم رہتا ہے۔ ہمیں اپنے تئیں اس کے حوالے کرنا چاہیے اور بس!

عطا محمد صاحب نے اپنی مرحومہ ہمشیرہ کے ساتھ زندگی کے تقریباً ۱۳ سال سنگرام پورہ میں گذارے اور ہماری محسن ساجدہ صاحبہ ان کی دیکھ بال کرتی رہیں۔ ہمارے صاحب نے قریباً گیارہ سال باہر گذارنے کے بعد پھر سوپور کا رخ کیا اور اپنے اجڑے ہوئے دنیاوی گھر واپس چلے گئے۔ عطا محمد صاحب اپنی

کربلا کا زخم تھی نالاں و گریاں بے پناہ
کھل گیا ہے حجرہ کا باغ و بستان واہ واہ
حبیبؔ

ہمشیرہ کے ساتھ سوپور واپس آگئے۔ اس طرح عشہ پیر میں پھر رونق آگئی۔ اجڑے ہوئے مکان کی تھوڑی بہت مرمت کی گئی مگر اب لوگوں کا آنا اور وہ بھی جوق در جوق شروع ہوگیا۔ ان کے کمالات نئے نئے رنگ دکھانے لگے اور ان کی شہرت بھی بڑھ گئی۔ اسی دوران ان کے ایک فدوی مرید عبدالخالق نائیکو کے ایک رشتہ دار نے عشہ پیر محلے میں ہی صاحب کے آبائی مکان کے پاس ہی زمین کا مقابلتاً موزون اور بڑا ٹکڑا صاحب کی نذر کر دیا جس پر ۱۹۷۸ میں بقول عطا محمد صاحب کام شروع ہوا اور نیا گھر بننے لگا۔ بالکل دو قبرستانوں کے بیچ۔ عطا محمد صاحب کا کہنا ہے کہ وہ غالباً ۱۹۸۱ء میں اس نئے مکان میں گھس گئے۔ ۱۹۸۲ء میں عطا محمد صاحب کا نکاح ونہ گام بانڈی پورہ کے مرحوم غلام محمد شاہ صاحب کی صاحبزادی دلشادہ بانو سے ہوا۔ دلشادہ صاحبہ کے آتے ہی نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کے ہی بطن سے عطا محمد صاحب کی دو اولاد پیدا ہوئیں، ارم مشتاق اور گل ریز مشتاق۔ شادی کے ایام تک عطا محمد صاحب نے ویٹرنری سائنس میں ڈگری پائی تھی مگر ریاست سے باہر بہار میں۔ اس سے انہیں سرکاری ملازمت ملی

باغوں کے مالک نائیکو صاحب میووں کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے نوپورہ سوپور میں ان کا مکان دیکھا ہے جس میں صاحب ہفتوں، مہینوں رہتے تھے۔ میرا مشاہدہ معروضی نہ ہو مگر قریباً اٹھائیس سال نائیکو کو دیکھتا رہا۔ صاحب کی خدمت دل سے کرتے ہیں۔ کافی درد محسوس کرتے ہیں ان کیلئے۔ ان کی بول چال سے لگتا ہے کہ وہ صاحب کو چاق و چوبند اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی تکلیف محسوس کرتے ہیں اور ان کا مشکل کاموں میں الجھاؤ دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں۔ نائیکو صاحب گوشت کھانے کے بڑے شوقین ہیں اور صاحب کو بھی دل کھول کر گوشت کھلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اور وہ ڈاکٹر ہو گئے۔ ان کی ہمشیرہ نے افتان وخیزان نویں جماعت تک مروجہ تعلیم پائی اور وہ بھی سرکاری مدرسے میں۔ عطا محمد صاحب نے بھی سرکاری مدرسے میں ہی پڑھا ہے مگر لڑکوں اور لڑکیوں کا پڑھنا ایک ہی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔ اس وقت بھی لڑکیاں تعلیم و تربیت میں اتنی پیش رفت نہیں کر سکتیں جتنی لڑکے، خاص کر دیہات میں۔ عطا محمد صاحب تاہم خود ہی تعلیم کے شوقین تھے۔ اس وقت بھی ان کا علمی شوق صاف نظر آتا ہے۔ ان کی گھر والی بھی بسنت بہاروں کے بیچوں بیچ بانڈی پورہ میں دسویں تک چلتے چلتے رک گئیں! تاہم اصلی علم علم لدنی ہے جس کے سامنے سب کتابیں بند!
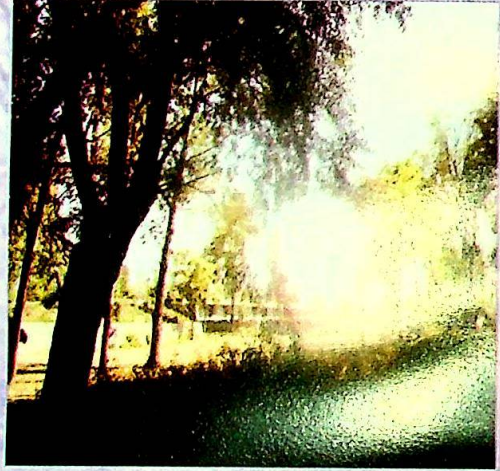
آبائی مکان سے نئے مکان میں منتقلی کے دنوں میں ہی صاحب پھر گھر سے باہر نکل آئے تھے اور سوپور پل کے قریب واقع شمشان بھومی میں ٹھہر گئے تھے۔ یہاں انہوں نے قریباً چھ سات مہینے گذارے تھے۔ بادوباراں اور دھوپ چھاؤں میں، سردی گرمی میں [illegible] کی سختیوں میں وہ کھلی فضا میں بیٹھتے تھے، کھاتے تھے، پیتے تھے، سوتے تھے، جاگتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ کھلی فضاؤں میں زندگی گذارنا انکی عادت بن گئی تھی اور وہ بے گھر جگہوں پر گھر بسانا پسند کرتے تھے۔ اس کے وجوہات کیا تھے اور اس طرح زندگی کے نادر ایام گذارنے سے انہیں کیا ملتا تھا، وہ ہم کیا جان سکتے ہیں۔ ایسے کام بہت مشکل ہیں جو بہادر، اولوالعزم لوگ ہی کر پاتے ہیں اور وہ جو عالم جبروت میں گھوڑے دوڑانے کی مشق کرتے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس لحاظ سے صاحب کی سطح کا کوئی قلندر، کوئی ملنگ یا کوئی عارف کشمیر میں موجود نہیں تھا۔ جہاں تک میرے تجربے، مری سوچ سمجھ اور میری اطلاعات کا تعلق ہے ایسا دل گردہ ہونا بھی چیزے دگر ہے۔ یہاں اس شمشان بھومی پر ایک واقعہ پیش آیا تھا، وہ بھی پراسرار اور نرالا۔ ایک شخص جو نہ جانے صاحب کے نزدیک آنے کی کیوں کوشش کر رہا تھا اور سمجھتا نہیں تھا کہ صاحب جلالی موڈ میں ہیں، ان کے جلال کا شکار ہوا اور ملک الموت کا لقمہ بن گیا۔ حکومت حرکت میں آ گئی اور نہایت محتاط انداز سے صاحب کو سنٹرل جیل سرینگر پہنچا گئی۔ پکی شہادت سے پتہ چلا کہ جب پولیس کی گاڑی شمشان بھومی پہنچی تو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور خود ہی اس میں بیٹھ گئے۔ سنٹرل جیل میں ان دنوں "الفتح" کے کچھ نوجوان مقید تھے جن کی ملاقات صاحب سے ہوئی تھی۔ ان میں جمیل احمد اندرابی اور غلام رسول زہگیر کا نام قابل ذکر ہے۔ جمیل صاحب نے عطا

محمد صاحب کو بتایا کہ صاحب نے زہگیر صاحب کو کہا تھا کہ اسے سوپور نہیں آنا چاہیے۔ اس کا مطلب کیا، ہمیں معلوم نہیں۔ اس کے علاوہ پونچھ یا راجوری کا ایک گجر بزرگ بھی صاحب سے جیل میں ملا تھا اور صاحب کو دوست گردانتا تھا۔ ایک دن اس گجر صاحب کو صاحب کے گھر میں دیکھا کہ بلا خوف و تکلّف اٹھتا بیٹھتا ہے اور صاحب کے ساتھ اس طرح باتیں کرتا ہے کہ ان کے ساتھ مانوس ہے۔ وہ کئی دن صاحب کے ہاں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا۔ وہ صاحب کو گلے لگاتا تھا، ان کے بالکل قریب بیٹھتا تھا اور ان ہی کے ساتھ انہی کے بستر میں سوتا تھا۔ شیر ببر کے ساتھ گجر بزرگ کا معاملہ دیکھ کر میں خوف بھی کھاتا تھا اور حیران بھی ہوتا تھا۔ خلوص اور محبت کی راہیں صراطِ مستقیم کی طرح بالکل سیدھی ہوتی ہیں۔ ان پر چلنا اگر آسان نہیں مگر مزے دار ضرور ہے۔ ایسی لذّتیں میرے خیال میں جنّت الفردوس میں بھی نہیں، جس کے دل میں کھوٹ نہ ہو وہ اگر ڈرے تو کیوں؟ کہتے ہیں کہ سنٹرل جیل سرینگر میں صاحب کا معائنہ کسی ڈاکٹر مس ہاک سے کرایا گیا جو فرنگی خاتون تھی اور دماغی ہسپتال میں کام کر رہی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں صاحب کو ''غیر معمولی'' شخص قرار دیا۔ بظاہر یہی رپورٹ ان کی رہائی کا سبب بنا۔ صاحب نے جیل میں بقول فرزندار جمند اکتالیس دن گذارے۔ سننے میں آیا ہے کہ صاحب جیل میں بہت اچھی طرح سے رہتے تھے اور سبوں کو بہت متاثر کر گئے تھے۔

پھول جب کھلتے ہیں تو کانٹے ساتھ ہوتے ہیں مگر بھنورے اور پتنگے، قمری و بلبل، کوئل اور ہزار داستان بھی پھولوں کا جشن منانے کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پانی، فوارے اور آبشار بھی رقص و سرود میں مست دُرودِ گُل پڑھنے کیلئے شامل ہو جاتے ہیں۔ اس شمولیت سے شوق اچھلتے ہیں، ذوق پنپتے ہیں مگر فیض ہائے گل و مُل اپنا دسترخواں بھی بچھاتے ہیں۔ جب گلاب پورے جوبن کے ساتھ اپنی بے پردہ رنگینیوں کے ہمراہ اپنا جلوہ بے باکانہ بکھیرنے لگتے ہیں تب کھل کھلاہٹ کا چاؤ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور ساکنانِ باغ و بہار کا وفورِ تمنا بھی نشور کی طرح پرزور۔ صاحب کے حق میں کچھ ایسا ہی فرمانِ چرخِ کہن نکلا۔ اس کا سارا وجود مظہر جلال و جمال بنا اور گرداگرد قسم قسم کے آئینوں میں جھلکنے لگا۔ یہ جھلک تابدار تھی، آبدار تھی۔ اس نے چوروں کو رہائی بخشی اور پولیس کے قائم کئے ہوئے اصول اور بندھن توڑ دئے۔ یہ واقعہ نہیں، نشور تھا جس سے حیات آزاد فضاؤں میں جوانیوں کی طرح انگڑائیاں لینے لگی اور شرابور ہو گئی۔ محبت کا بازار گرم ہو گیا، رسوم و رواج، قیود و سلاسل اپنے جمے ہوئے اداروں کے ساتھ اذا ذلزلت الارض زلزالھا پڑھنے لگے اور اسی کے ساتھ ان کا اپنا مکان بھی اپنا سرپوش نذر کر بیٹھا۔ زنجیر و سلاسل اور آزادی فکر دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک طرف خوف و ہراس اور بھٹکتے ہوئے قدم اور دوسری طرف آزادئ باغ و بہار، ایک طرف دوسروں کے بنائے ہوئے قانون اور بندھن تو

کوثر و تسنیم کے سازوں سے آتی ہے صدا
گلستانِ نغمہ داؤد ہے ارض و سما
دیکھتی ہے چشم عالم رنگ و بو کی نوبہار
چھپ کے بیٹھی ہے گلوں میں جلوہ گاہِ لالہ زار
حبیب

دوسری طرف ذمہ داری اور بالیدگی اور بالیدگی سے پیدا شدہ ضابطے اور اصول۔ حیات اور انسانیت کے حق میں آدم نے نعرۂ آزادی دیا تھا۔ آج ہم بلے پکار پکار کر دستور اب وجد قائم [illegible] ہیں۔ یہ نعرۂ بے باک صاحب نے بھی دیا اور خوف و ہراس کو روندتے ہوئے مالک حقیقی کی راہ میں چل پڑے، تخلیقی ہتھیاروں سے لیس اس جنگ میں جو نہ اولاد کی پروا کرتی ہے اور نہ آئین و فرائض کی۔ انہوں نے سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دیا تھا اور وہ نتیجے کے طور پر سب سے کامران اور کامیاب ہو کر کچھ کھوئے بنا لوٹ آئے تھے۔ یہ کہانی دیئے اور طوفان کی سی کہانی ہے جو اس سے بھی جلالی۔ دقیق ہو نہ ہو مگر حقیقت پر مبنی ضرور ہے، مبنی کیا بلکہ حقیقت ہی حقیقت ہے۔

حکایت باغ و بہار کا ایک اور ورق! جو مکان صاحب نے ورثے میں پایا تھا، جس کی چھت اڑ گئی تھی، اِس میں وہ رہ نہیں سکتے تھے نہ ان کی اولاد۔ ان کے پروانے بھی اس مکان میں شمع پروانہ کا رقص رچا نہیں سکتے تھے۔ صاحب قدر دراز احسن الخالقین سے تخلیقی جدّت انعام میں پا چکے تھے تاکہ عشہ پیر کی خواجگی کا نیا باب کھلے۔ اس کیلئے نئے مکان و زمان کی ضرورت تھی جس کا آغاز تو خالق اور اس کے آشنا نے کیا تھا مگر جس کا ایک اور روپ نُور باغ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ یہ مکان دو مزاروں کے بیچ میں تعمیر ہوا۔ ایک مزار صاحب کی رفیقہ حیات نے آباد کیا اور دوسرا ان کی جگر پارہ شفا نے۔ ان زبردست قربانیوں کو ہمارا اسلام اور ایسے آداب کے ساتھ جن کا بیان لب و زبان دونوں کیلئے دشوار! اس نئے مکان میں حیات نے انگڑائیاں لیں اور موت کے سائے بھی نظر آئے۔ اس میں شادیاں بھی رچائی گئیں اور غموں کی سیاہ راتوں نے بھی اپنی لمبی زلفیں کھول دیں۔ یہاں بڑے بڑے پکوان بھی پکے اور نشاط معنی کی محفلیں بھی آراستہ
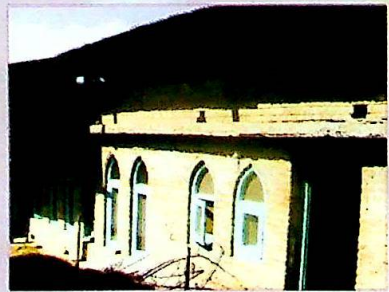
ہوئیں۔ لوگ آئے بھی اور گئے بھی، بنے بھی اور بن بن کے اور بننے کے خواب دیکھنے بھی لگے جن میں کچھ شرمندۂ تعبیر بھی ہوئے ہونگے اور کچھ زلفِ نارسا کی تاریکیوں میں کھو بھی چکے ہوں گے!

وہی شمشان بھومی میں ڈیرہ لگانے کے ایام تھے جب صاحب خواجہ صاحب کی زیارت کے پاس عشہ پیر کی مسجد کے حمام میں گھس گئے اور وہاں ہی ٹھہر گئے، کچھ دیر کیلئے ہی سہی۔ حمام میں ٹھہرتے تو آسان بات تھی اور آرام دہ بھی، وہ تو حمام کی بھٹی کے پاس، آگ کے شعلوں اور تیز دہکتے انگاروں کا تماشہ کرتے تھے۔ شعلے اور انگارے حمام بھی گرم رکھتے تھے اور نمازیوں کی نمازیں اور درود وسلام سرمائی خنکیوں میں آسان بھی بنا دیتے تھے۔ وہاں ہی صاحب کھاتے، اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے اور وہاں ہی ملاقاتیوں سے ملتے جن میں سے کچھ خوش نصیب صاحب کیلئے کھانا بھی پکا کر لاتے تھے۔ کتنے کام حمام کی بھٹی کے پاس! آگ کے شمشان کے اندر بھڑکتے تھے یا بھٹی میں، کوئی کہے یا نا کہے مگر ہم ضرور کہیں گے کہ اندر بھی آگ تھی اور باہر بھی، کیونکہ نارِ انفاس اور نارِ صندل دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آگ تو آگ مگر یہ آگ تھی آگ کا دریا جسے صاحب پاٹتے تھے مگر مسجد کے حمام میں بیٹھ کر۔ یہاں وہ خود بھی سجدہ کرتے تھے اور دوسروں کو بھی سجدہ کرتے دیکھتے تھے۔ حضرت خلیل الرحمن علیہ السلام نے بھی ایک دن آگ میں پھول ہی پھول دیکھے تھے اور یہاں صاحب بھی انگاروں کے پھول دیکھتے تھے پر نہ جانے یہ کس نمرود کی آگ تھی۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو بھی آگ سے ہی آوازِ دوست یا آوازِ حق سنائی دی تھی مگر یہاں حق الحق کے شعلے فروزاں تھے۔ داغ ہو یا اقبال، شاعر ہو یا گویا، فلسفی ہو یا صوفی، اس آگ کے ساتھ کون نہیں کھیلتا، مگر کون اس میں جلتا ہے اور کون اس میں کِھلتا ہے، اپنے اپنے نصیب!

شمشان بھومی سے آگ کی بھٹی تک آگ کے ساتھ ہم آہنگی فنا کا دار تھا یا بقا کا بار، جبروت کے گھوڑوں پر دوڑنے کی آزمائش تھی یا جلال و جمال کی رندانہ تپش، یہ وہ لوگ جانیں جو جان کی بازی لگاتے ہیں اور اپنے آپ کو حریت اور آزادی کے اعلیٰ وارفع مقام پر لیجاتے ہیں۔ ہم اُن جانے اپنے صاحب کی مستی کی پزیرائی کرتے ہیں اور بس!

منظور یہ اشواق گوارا یہ ستم دوست
ہم آپ کی یادوں میں یوں بھی جیتے رہیں گے
جلنے سے ڈریں کیوں اگر جذبات ہوں صادق
شعلوں کو پھول جان کر دم بھرتے رہیں گے

حبیبؔ
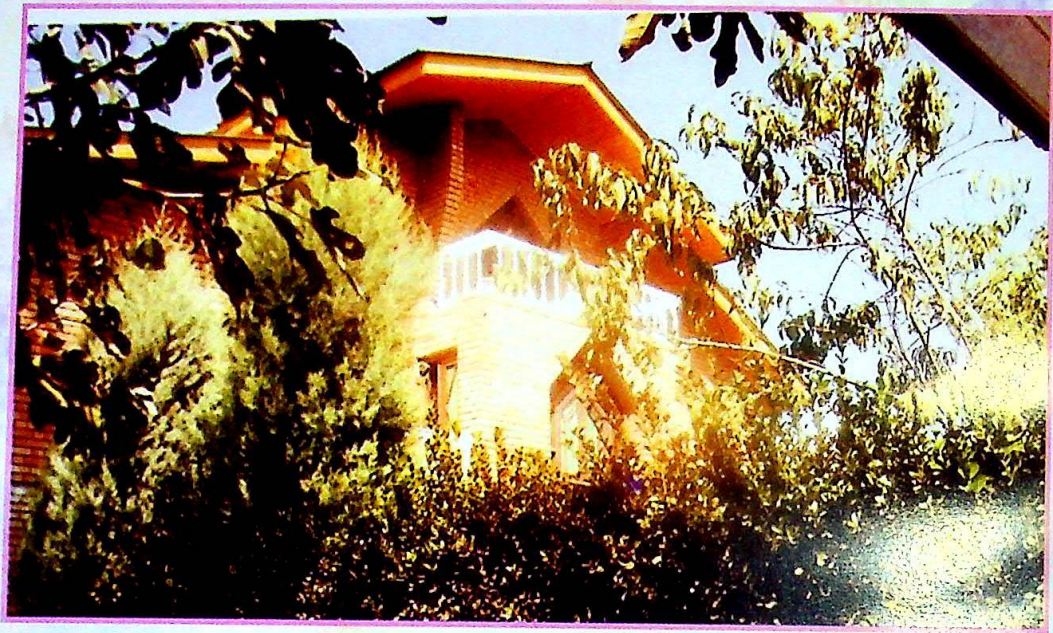
اب چلیں نور باغ جہاں الکہف ہے یعنی ان کا تیسرا گھر جس میں صاحب قریباً تیرہ سال قیام کرتے رہے۔ ان کا خواب گاہ بھی وہاں ہی ہے، الکہف کی مشرق کی طرف۔ یہ جگہ ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے پر ہے جہاں صاحب ہفتہ پیر سے تقریباً روزانہ پیدل چلتے چلتے جاتے تھے اور کبھی کھڑا رہتے تھے مگر اکثر بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی وہاں بھی سائلوں کی مجلسیں جم جاتی تھیں۔ اس مقام کے ساتھ صاحب کا لگاؤ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر ہم اسے ریاضِ طور کہیں گے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ صاحب بہت انہماک سے تیز تیز ان راستوں پر چلتے تھے جو راستے اب الکہف کا حصہ بن گئے ہیں، اس لئے کہ ان ہی پر ان کے سائل، ان کے مرید اور چاہنے والے چلتے ہیں اور روزانہ۔

شفاؔ کی شادی کے ساتھ ساتھ ہی اس مقام پر گھر بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ پہلے تھوڑی سی زمین چکاؤ دھکاؤ کے مرحلوں سے گزرتی ہوئی خریدی گئی پھر اس کے ساتھ ایک اور ٹکڑا خرید کر ملایا گیا پھر ایک اور۔ اس طرح الکہف مرحلہ وار کھڑا ہو گیا۔ معاشی دشواریاں تو ضرور حائل تھیں مگر نابود سے بود پیدا کرنا صاحب کے دربار میں بالکل مشکل نہیں۔ گھر بنتا گیا حالانکہ عقل حیران تھی کہ وسائل کیسے پیدا کریں۔ لنگر بھی بنا، لنگر خانہ بھی بنا، چھوٹا سا باغ بغیچہ بھی بنا مگر وہ نہ بنا جس کی آرزو دل نے کی تھی۔ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلتا ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ایسا باغ بنے جیسا عرب کے ریگستانوں میں آج بنتے ہیں مگر ہم کسی

کنویں کے تیل کے مالک کہاں تھے کبھی! گھر بنتا تھا تو صاحب پٹری پر قیام کرتے تھے شاید ان دنوں دیکھ رہے تھے کہ گھر کیا بن رہا ہے اور ہاتھ کس کے کس جذبے سے کام میں آتے ہیں، یار کی راہوں میں دل کی دھڑکنوں کا کیا عالم ہے اور کہاں دھڑکنوں سے زیرا چھلتا ہے کہاں بم۔ مکان بن گیا مگر ابھی پورا نہیں تو صاحب تشریف لائے۔ کبھی موٹر سے نکلے نہیں، کبھی موٹر گراج میں ہی چوکی پر بیٹھ گئے، سو گئے، کبھی لنگر خانے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قیام کیا۔ مگر جب مکان میں باضابطہ گھس گئے تو بستر ہ کبھی استعمال نہیں کیا۔ سخت زندگی کے ساتھ ان کا لگاؤ آخری دن تک قائم رہا۔

عشہ پیر سے نور باغ کا سفر ایک دن یا ایک ماہ یا ایک سال میں طے نہیں ہوا، اس سفر میں [illegible] کتنے دن، کتنی راتیں، کتنے سال کام آئے اور کتنے غم، کتنے آلام، کتنی دشواریاں اور کتنی محنتیں۔ پیار کی [illegible] چلنا بہت دشوار ہوتا ہے مگر نور باغ کی راہیں دشوار ترین تھیں اس صاحب کیلئے جن کے قدم تیز تیز اٹھے [illegible] اس کی گواہی ان کے پائے نازنین دے رہے ہیں، پاؤں کے چھالے دے رہے ہیں اور وہ زخم جو [illegible] بہار رہے اور کبھی مرجھائے نہیں۔ ریت کے ذروں نے، تیز نوکدار کنکروں نے ان کے قدم چوم چوم ان کے زخم بہاراں کر دئے مگر خونِ یار کے نشان زمین پر ثبت ہوتے رہے تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پھول کھلاتے رہیں اور ان کے پروانوں کو جل جل اور جلنے کا حوصلہ بخشتے رہیں۔ چلتے چلتے ان کے نازنین جسم سے پسینے چھوٹتے رہے اور ہواؤں میں خوشبوئیں پھیلاتے رہے تاکہ مشامِ تیز رکھنے والے جاں نثاروں کیلئے راہوں کی نشاندہی ہو سکے جس طرح سیاہ راتوں میں سمندر کے کنارے روشنی کے میناروں سے کشتیوں اور جہازوں کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ریاض طور جس کا دوسرا نام الکہف ہے ہمارے دلوں پر ہزاروں نقش پیدا کر چکا ہے اور ہم میں سے جو لوگ خوش بخت ہونگے وہ ان نقوش سے اور اور تعمیریں کھڑا کرینگے جن سے نور باغ کے انوار اور اور پھیلتے رہیں گے دلوں کو آباد کرنے کیلئے اور خدائی بارگاہ میں چراغاں کرنے کیلئے!

جہاد فی سبیل اللہ

شجر ممنوعہ کے پاس پھٹکتے ہی انسان کا جہاد شروع ہوا جو ابھی جاری ہے اور جب تک یہ کائنات موجود ہے جا[illegible] اس جہاد میں انسان کی برتری کی داستان ہے جو داستان واضح کرتی ہے کہ جو کام انسان سے ہو[illegible] اور مخلوق سے نہیں ہوسکتا، جس علم وعرفان کا خزانہ اس کے پاس جمع ہے وہ کسی اور کے پاس نہ[illegible] قدرت کی سب طاقتیں سرخم ہیں انسان کے سامنے اور عالم [illegible] قدسی بھی اس کا لوہا مان چکے ہیں۔ ان کو یارا نہیں کہ وہ اس کے ارضی مشن پر حرف لائیں کیونکہ اس سے ان کی لاعلمی ظاہر ہوگی اور وہ بھی حضورِ الٰہی میں۔ یہی قرآن کا درس ہے اور اسی درس سے انسان پروردگارِ دو جہاں کی سب سے بڑی آیت ہے یا نشانی۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاد انسانی سے کیا کیا نتائج اخذ ہوئے، محیر العقول بھی اور جو انسانی ذہن میں آتے ہیں،

''اور اس نے تمہارے لئے مسخر کئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تمام تارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں۔ بے شک اس میں عقلمند لوگوں کیلئے کئی نشانیاں ہیں۔''

''اور رنگ رنگ کی وہ چیزیں بھی جو اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیں۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کیلئے جو نصیحت پکڑتے ہیں''۔

(16:12-13)

''اور وہی ہے جس نے بحر مسخر کیا تاکہ تم اس میں سے تروتازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے زیور نکالو جو تم پہنتے ہو۔۔۔''

(16:14)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گننا چاہو تو انہیں گن نہ سکو۔ بے شک اللہ غفور ورحیم ہے۔''

(16:18)

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور چھپی نعمتیں پوری کردیں ہیں اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔''

(31:20)

کچھ معمولی کچھ غیر معمولی، حالانکہ کوئی بھی چیز معمولی نہیں اور کوئی بات اچھنبے کی بات نہیں۔ اگر عقل وفہم نے ساتھ دیا تب ٹھیک، اگر نہیں تو محیر العقول۔ تاریخ نے پہلے انسان کو آدم کہا مگر جو بھی انسانی بچہ پیدا ہوا، آدم ہی کہلایا۔ آدم کی ہی کہانی دہرائی، نئے ڈھنگ میں البتہ۔ ہمارے صاحب بھی آدم کے ہی روپ میں پیدا ہوئے تاکہ جہاد کریں اور انی جاعل ثابت کریں۔

ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ احد صاحب پیدائی طور پر غیر معمولی انسان ہیں۔ ان کے آباء واجداد ختلان سے جو پونجی جمع کر کے لائے تھے اور جو کچھ یہاں کشمیر میں جمع کیا تھا وہ خالق و یحییٰ جیسے بزرگوں کے ذریعے ان کے حوالے کر دی گئی۔ (خالق و یحییٰ نے بھی ریاضت سے بہت کچھ جمع کر لیا ہوتا) ورنہ ان کا اس مقام تک پہنچنا جس مقام پر وہ فائز تھے، شاید ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی اس حقیقت کے حق میں ایسے شواہد پیش نہیں کئے جاسکتے جیسے تاریخ میں، سائنس یا کسی اور شعبۂ علم وفن میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ عرفان و راز درویشی کے یہ معاملات دوسرے طریقوں سے واضح ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خالق صاحب کا طریقہ [illegible] اور طرزِ فقیری صاحب کے طرز و طریقہ کے ساتھ میل کھاتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خالق صاحب کا تجربہ صاحب کی عارفانہ زندگی اور رند مشربی میں اور بھی گہرا ہوا یہاں تک کہ شاید اب اس تجربے میں صاحب کی اس زندگی میں اور اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کہ عارف، صوفی، ولی، درویش یا اس قسم کے لوگ عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ بڑے حسّاس، بڑے جذباتی اور بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے سینہ صفائی ضروری ہوتی ہے مگر اس حد تک نہیں جس حد تک عام لوگوں کیلئے ہوتی ہے جن کے احساسات، جذبات اور عقلی استعداد ناپختہ ہوتے ہیں۔ صوفیانہ زبان یا روحانی تہذیب میں سینہ صفائی کو الم نشرح کہتے ہیں۔ صاحب جیسے لوگ مجاہدہ سے عقل کل کا فیض حاصل کرتے ہیں۔ اسلئے وہ عقلی اعتبار سے بھی بہت طاقت ور اور بہت دانا و بینا ہوتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو سپر جینیس (super genius) کہیں تو نہ مبالغہ ہوگا نہ غلط۔ ایک اور خداداد طاقت ہوتی ہے ایسے لوگوں میں، صبر وشکر اور برداشت کی اور وہ بھی بے حد۔ اسی طاقت سے وہ زیادہ سے زیادہ جہاد کر سکتے ہیں، سختیاں برداشت کر سکتے ہیں، لوگوں کا برا بھلا پس پشت ڈال سکتے ہیں، وغیرہ۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ نے صاحب کو یہ سب طاقتیں عطا کی تھیں جن کی بدولت وہ صاحب عرفان ہو گئے اور اتنے عظیم! مگر ان کے بارے میں اور اور۔

جہاد جامع اصطلاح (concept) ہے مگر اس میں نفس بھی شامل ہے اور روح بھی۔ دونوں اسی کے راستے میں قربان! نفس بھی روح کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ انسان کے وجود کا بٹوارہ نہیں ہو سکتا،

وہ تو ایک ہی نا قابل تقسیم حقیقت ہے مگر یہاں ہم نے نفس کو زندہ رہنے یا روزمرہ زندگی گذارنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ہمیں کھانے پینے، نہانے دھونے، حاجات رفع کرنے، آرام کرنے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے، کھیلنے کودنے، دوڑنے گھومنے کی ضرورت ہے اور مکان کی، کپڑوں کی، فرش کی، برتنوں کی، کھانا پکانے کی چیزوں کی بھی۔ ہمیں دارو دوا چاہیے علاج کیلئے، کاغذ قلم دوات کتاب چاہیے لکھنے پڑھنے کیلئے۔ مگر دنیا داری یہاں ہی ختم نہیں ہوتی۔ اس کیلئے اور اور چیزوں کی ضرورت ہے جن کا انت نہیں۔ یہ نفس انسانی کے سروسامان یہاں [illegible] کیلئے بہت سے لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں، اللہ کو بھی۔ یہ نہ سوچتے ہیں کہ آئے کہاں سے اور جانا کہاں ہے، کس لئے آئے ہیں، کرنا کیا ہے، ابھرتے کس طرح ہیں اور گرتے کس طرح۔ اس دور میں تو حالات زیادہ [illegible] گئے ہیں۔ لوگ کھانے کیلئے زندہ رہتے ہیں، بیوی بچوں، خاوند دولت، عیش و آرام اور لہو لعب کیلئے سب کچھ قربان کرتے ہیں۔ دنیا کے بازار میں اللہ اور اس کے رسولوں اور نیک بندوں کا سودا کرتے ہیں۔ [illegible] نفس کے دیو کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے انسانیت کا خون کرتے ہیں اور خدا سے بھی منکر ہوجاتے ہیں مذہب، روحانیت کی بات ہی نہیں۔ کبھی خوف یا فریب سے خدا پرستی کے سوانگ رچاتے ہیں مگر صبح شام تمام عمر ایسے کام کرتے ہیں کہ شیطان بھی دیکھ کر شرمندہ ہوجاتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں۔ ہمارے صاحب نے اوائل عمر سے ہی کھایا، پیا تو اللہ کا نام لیکر، سوئے جاگے تو اسی کی یاد میں، دست با کار دل با یار کی عملی صورت بنے رہے اور ان چیزوں کی طرف راغب نہ ہوئے جو دنیا داری یا دنیا پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ دنیا سے بے زار تھے یا گھر بار، بال بچوں سے کہیں دور ویرانے میں زندگی گذارتے تھے، البتہ دنیا کے جنجال میں اپنے آپ کو کبھی بھی اس طرح پھنسایا نہیں کہ باہر نکل نہیں سکتے یا بندھن توڑ نہیں

حسبنا الله لديننا
حسبنا الله لدنيانا
حسبنا الله لما اهمنا
حسبنا الله لمن بغیٰ علينا
حسبنا الله لمن حسدنا
حسبنا الله لمن كادنا بسّوءٍ
حسبنا الله عند الموت
حسبنا الله عند القبر
حسبنا الله عند المسائل
حسبنا الله عند الصراط
حسبنا الله عند الحساب
حسبنا الله عند الميزان
حسبنا الله عند الجنة و النار
حسبنا الله عند اللقاءِ
حسبی الله الذی لا اله الا هو
عليه تو كلت و اليه انيب

اورادِ فتحیه

> اے کریمی کہ از خزانہ غیب — گبرو ترسا وظیفہ خور داری
> دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری
> — سعدی

سکتے۔ ان کی بہنیں تھیں، بھائی تھا جو کہ جواں سال ہی اپنی امانت دو جہاں کے پالن ہار کے حوالے کر چکا تھا، ان کے بیوی بچے تھے، وہ نوکری بھی کرتے تھے اور وہ بھی پولیس کی۔ وہ روپیہ پیسہ کماتے تھے، پیٹ پالتے تھے مگر ان چیزوں میں ان کا دل اس طرح نہ لگا کہ اپنے مقصد حیات کو نعوذ باللہ بھول جاتے۔ کچھ وقت کیلئے المال والاولاد فتنہ کی تیز رفتار لہر سے گھربار کے معاملے معطل کر بیٹھے، تاہم ان کی دانست میں ایسے حالات موجود تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بچون کو سنبھالا اور وہ جہاد فی سبیل اللہ میں ہمہ تن، ہمہ جاں مصروف ہو گئے۔ یقیناً جو بندۂ خدا اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرتا ہے، اللہ اس کے معاملات کو سنبھالتا ہے، باید و شاید کیوں نہ سنبھالے؟ وہ تو ان لوگوں کی نگہبانی بھی کرتا ہے یا ان مخلوقات کی جو اگر [illegible] جا۔ اس کے فرماں بردار بھی نہیں ہوتے۔

گھر بار چھوڑنے سے پہلے صاحب پٹن تھانے میں کام کر رہے تھے۔ پٹن سرینگر اور بارہمولہ کے درمیان واقعہ ہے۔ اس کا مغربی حصہ پہاڑی ہے اور اس لحاظ سے خوبصورت اور خوشنما۔ پٹن کے قریب نہال پورہ میں ایک عارف، صاحب دل رہتے تھے جن کا اسم گرامی مولوی محی الدین خان صاحب علیہ الرحمہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب (احد صاحب) ان دنوں کافی روحانی تجربات حاصل کر چکے تھے اس حد تک کہ وہ مولوی خان صاحب کے روحانی تجربے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ خان صاحب اور ہمارے صاحب کے درمیان روحانی روابط تھے۔ شاید مولوی صاحب کے تجربات کو مدنظر رکھ کر ہمارے صاحب اپنے تجربات کی جانچ فرماتے تھے اور اس طرح اپنا سکہ خود پرکھتے تھے اور ایسا ہوتا آیا ہے عارفوں کی زندگی میں۔ صاحب لوگوں کے ساتھ بھی نوکری یک طرف چھوڑ کر روابط رکھتے تھے۔ اس طرح سے بھی وہ اپنے منازل طے کرتے تھے اور عارفانہ باتوں کا سراغ لگاتے تھے۔ اگر عارف کی زندگی بالیدہ ہو تو ایسے سراغ اسے پختہ سے پختہ تر بناتے ہیں اور کائنات کبیر کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ جو اللہ اکبر کا مقام ہے۔ صاحب شاید یہ مقام کھوجتے تھے جب سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ قرب و جوار میں مولوی خان صاحب کے ساتھ بحیثیت ہم عصر معرفت الٰہی کے ساغرو جام پیتے تھے اور عوام کی زندگی کا بغور مشاہدہ کرتے تھے۔ شاید ان ہی دنوں صاحب کوئل مقام بانڈی پورہ جاتے تھے جہاں منوّر صاحب کا مزار ہے۔ منوّر صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے رہنے والے

تھے اور پاکستانی فوج میں خاص عہدے پر فائز تھے مگر بعد میں سب کچھ چھوڑ گئے اور صوفیانہ زندگی اختیار کی۔ کوئل مقام کے گُل گُورنے مجھے یہ باتیں بتائیں ہیں مگر اصلی حقیقت کیا ہے مجھے معلوم نہیں۔

صاحب کی زندگی کا زبردست مگر بہت ہی مشکل موڑ وہ تھا جب انہوں نے گھربار صحیح معنوں میں چھوڑ دیا اور وہ ایک طرف قطعی طور خدا کے ہوگئے اور دوسری طرف عوام الناس کے۔ یوں تو صوفیانہ زبان میں اس مقام کو مقامِ ترک کہیں گے مگر دراصل یہ ترک سے آگے کا مقام تھا۔ اس میں ترک بھی تھا اور اختیار بھی۔ عام لوگوں کی نظروں میں یہ فنا کا مقام تھا مگر عملی اعتبار سے صاحب فنا سے آگے بقا کی زندگی پا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی روح روایتی زندگی سے آزاد کردی تھی اور وہ اب تخلیقی اور تعمیری لحاظ سے اپنی زندگی کو پختہ سے پختہ تر بنا رہے تھے [illegible] طرح ابراہیمی طرزِ حیات ابدی میں داخل ہوگئے تھے۔ مذہبی زبان میں اس حصول کو اولی الامر منکم کا تخت وتاج کہا جاتا ہے۔ یہ ان ہی لوگوں کو عطا ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے پختہ ہوئے ہونگے اور اتنے اہل بن گئے ہونگے کہ حیات کی تخلیقی ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔ اس مقام پر پہنچتے پہنچتے ہزار دشواریاں پیش آتی ہیں کبھی صبحیں شاموں میں کھو جاتی ہیں اور کبھی اجالے اندھیروں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی سوختم وسوختم وسوختم کی شعلہ بار آہیں بھرنی پڑتی ہیں اور کبھی ”دھتم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا“ کے صبر آزما گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کبھی لیلیٰ لیلیٰ پکارتے ہوئے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کے کٹھن ایام کی شدتیں جھیلنا پڑتی ہیں، رخِ لیلیٰ دِکھے یا نہ دِکھے، التفات لیلیٰ نصیب ہو کہ نہ ہو یا کم سے کم صدائے جرس لیلیٰ کانوں تک پہنچے کہ نہ پہنچے۔ کبھی شماتت اعدا اور کبھی اپنے دوستوں، قریب رشتہ داروں کی کڑوی باتیں سہنا پڑتی ہیں باہر سے ہنستے ہنستے اور اندر سے واویلا کرتے ہوئے۔ کبھی لڑکپن کی نادانیوں کے تماشے جو کنکروں اور ڈھیلوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بھاری پتھر بھی اٹھا اٹھا کر سر بازار پھینکتے ہیں کہ جس سے اگر مجنوں کا سر پھٹے نہیں زخم تو کھائے۔ یہ کلفتیں، یہ آلام یہ ناہموار روزگار آسانی سے سمجھے نہیں جا سکتے۔ انسان جب تک مرزا غالبؔ کی طرح خود سنگ نہ اٹھائے اور سر کے زخموں کی حقیقت معلوم نہ کرے۔ یہاں ہی فرہاد کی نادانیاں سمجھ میں آتی ہیں جس نے خسروی حسن و جمال شیریں کا خواب دیکھا تھا اور اسی کے پیچھے دیوانہ وار چلا تھا پتھر توڑنے کیلئے، سنگلاخ زمینیں کاٹنے کیلئے اور مشکل سے مشکل کام کرنے کیلئے جس میں اس کا فنا ہونا یقینی تھا اگر عشق اسے تکمیلی جرأت نہ سکھاتا اور جوئے شیر لانے کی ہمت۔ پھر بھی کیا ہوا۔ آخر کار شیرین محلوں کی رانی بنی رہی اور فرہاد کی پہنچ سے بہت اونچی اور اس کے ہاتھوں کی لانبی گرفت سے دور۔ بے چارا مرتے مرتے بھی بادۂ رُخ شیرین پی نہ سکا! یہی وہ دور ہوتا ہے جب مکّے کے سب سفیانی اور ابولہبی ٹھیکہ دار، پہرے دار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہوں کی ناکہ بندی کرنے جمع

ہوجاتے ہیں اور وہ لکڑہارن ام جمیل اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کیلئے سینے پر رکھا ہوا مرواریدکا ہار نمائش کرتی ہے تا کہ دل آزاران محمدؐ وجد میں آئیں اور گلی کوچوں اور راستوں پر خود ساختہ بتوں کی حفاظت کے بیڑے اٹھائیں۔اسی دور میں نورِ الٰہی کو پھیلنے نہ ہونے دینے کی تدبیریں کی جاتی ہیں اور وحدت انسانی و وحدت حیات کو

پس پشت ڈال کر برادریوں، خاندانوں، زر پرستیوں اور رسمی بندشوں کو بڑھاوا دینے کیلئے ہر قسم کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ تخلیقی زندگی اور حیات نو کی باد صبا سے پریشان ہوکر بے جان روایات اور مکروہات کے قحبہ خانوں میں پناہ لی جاتی ہے تا کہ مرگ زاروں سے عوام الناس اٹھیں نہیں اور زندگی باغہائے ارم اور بہارانِ خوش خرام کے جامے پہنے نہیں۔ اسی مشکل میں دار و رسن کے قصے نئے سرے سے پڑھے جاتے ہیں، رسومات کے مارے غدار اور نابکار مصلحت کا شکار ہوجاتے ہیں اور حلاج منصور کی سولی خونِ عاشقان سے پھر رنگین بنادیتے ہیں اس طرح کہ رواجوں کی بادشاہت قائم کرتے ہیں اور اسے مملکت اسلامی کا نام دیتے ہیں۔ ایسے ہی کٹھن ایام سے صاحب گذرے اور خوب گزرے۔انہیں اپنا آبائی مکان ترک کرنا پڑا اور کھلی فضاؤں میں اڑان کرنا پڑی۔ یہ بظاہر ایک تخریب تھی مگر اس میں خضر کا سا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ وہ کشتی توڑ رہا تھا تا کہ ملاح نئی ناؤ بنائے اور بیگار میں پکڑا نہ جائے، مرگِ مفاجات کے حوالے نہ ہوجائے، وہ بد بخت نوجوان کو موت کا جام پلا رہا تھا تا کہ ایک نیا جواں سال وجود میں آئے اور نیک لوگوں کی نیک زندگی کا ضامن بن جائے، دیوارِ مسکیں بنا رہا تھا تا کہ اس کے خزانے لُٹیروں کے ہاتھوں سے بچ جائیں اور وہ بالغ ہوکر خود ان کا استفادہ

چوں قلم در دست غدارے بود
لا جرم منصور بردارے بود
یوسفان از مکر اخوان در چہ اند
کز حسد یوسف بہ گرگاں مے دہند
رومیؒ

"من نہ فرمایم چیزے را تا مرا نفرمایند وتا حدیث بیان نکنند" حمزہ بزبان خاکی
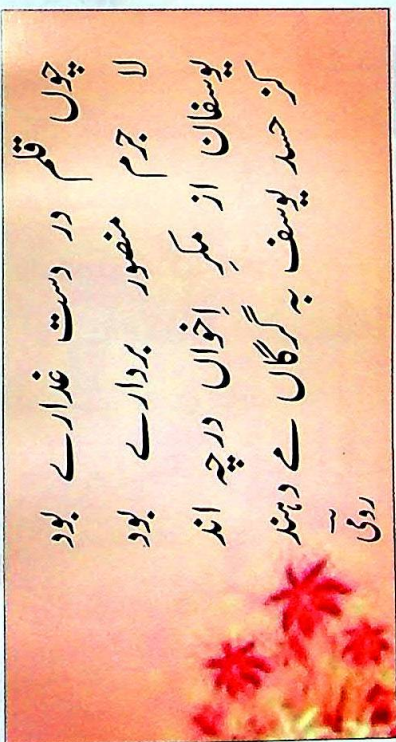
کرے۔ ہندو کہتے ہیں کہ شنکر مہاراج کلہاڑی ہاتھوں میں لئے بنائی ہوئی چیزیں تباہ کرتا ہے اور اس طرح اپنے مہا آتما کو کام میں لاتے ہوئے نئی زندگی، نئی تعمیر اور نئی حیات انسانی کیلئے راستے ہموار کرتا ہے۔ انہوں نے پہلے تجر شریف کی راہ لی، پھر وہاں سے آلوسہ کے جنگل میں ایک بھاری پتھر کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس طرح زینہ گیر، لولاب، کشمیر، ہندپاک، ایران، آذربائیجان کیلئے اس میں سے ایک ایسا زمزمہ نکال بیٹھے جس کا آبِ ضلال ہر دردمند کیلئے شفا ہے چاہے وہ کبر صد سالہ ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے تجر شریف کے نو سال اور وہ بھی بابا عثمان علیہ الرحمہ کی درگاہ پر۔ حضرت بابا عثمان خود بھی علم وعرفان کے مشاق اور شیدائی اور بقول حضرت بابا داوٗد خاکی خود بھی کئی ایک صوفیا کے پیر و مرشد، پاکباز، خوش مزاج، باسلیقہ، دیندار اور شاعر۔ حضرت محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومی و محبوبی ان کے فرزند ارجمند۔ مگر محبوب العالم رحمتہ اللہ علیہ نے والد بزرگوار کی سختیوں سے تنگ آکر ایک دن فیصلہ کیا کہ سری نگر جائیں گے اور وہاں ہی کوہ ماران کی بستیوں میں تعلیم و تربیت پائیں گے کیونکہ ایک دن والد بزرگوار نے ان کی خوب پٹائی کی تھی اس لئے کہ کھیلتے کیوں تھے۔ کھیل کیا تھا، کون بتائے۔ بہر حال محبوب محبوب العالم بنے اور کوہ ماراں ان کی نعمتوں سے فیض و برکت کا سرچشمہ! مخدوم صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شریعت کے پابند تھے۔ قرآن پاک نہایت خضوع خشوع کے ساتھ پڑھتے تھے۔ حضرت سید جمال الدین بخاری سے تربیت پا چکے تھے۔ ساتھ ہی عالم غیب سے بھی تربیت پاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ عالم غیب سے تربیت پائے بغیر کوئی شخص نہ عارف بن سکتا ہے، قلندر نہ ولی۔ جب تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا نہیں ہوسکتا اولی الامر منکم کے سجادے پر عارف یا ولی کیسے بیٹھ سکتا ہے اور نہ صرف اپنے معاملات درست کرسکتا ہے بلکہ لوگوں کی زندگی، خاص کر روحانی زندگی، سدھار سکتا ہے۔ لہٰذا حضرت سلطان العارفینؒ کا قرآن پڑھنا، غالب غیب کی آواز سننا، غیبی مخلوق کے ساتھ وابستہ ہونا، مریدوں کے دلوں کے احوال سے واقف ہوجانا، ان کے دین و دنیا کی بہتری کا بوجھ کاندھوں پر اٹھانا، ان کے بے عدد مشکلات دور کرنا، فیوض و برکات کے چشمے جاری کرنا، حتیٰ کہ مردوں کو زندہ کرنا عالم ولایت کی معمول کی باتیں ہیں، اس لئے ابھی بھی ہزاروں لوگ دربارِ محبوب عالمؒ میں حاضر ہوتے ہیں اپنے پیر کامل سے ملنے کیلئے۔ اولیائے کرام کو دیکھنے کیلئے بصیرت وبصارت کی ضرورت ہے۔ یہ غیر معمولی صحیح مگر مشکل بھی نہیں۔ اگر انسان کا عزم صمیم ہے جیسا کہ احد صاحب کا تھا، اگر وہ مقصد حیات کے پیچھے

دوڑنے کی زبردست خواہش رکھتا ہے اور ہمت مردانہ بھی، تب خدائے لم یزل کی مہربانی سے حاصل ہوگی وہ نظر جو کائنات کے سارے پردوں کو ڈھیر کرتی ہے اور حقیقت ابدی سامنے لاکھڑا کردیتی ہے۔ اندھے لوگ بسنت کی بہاروں سے واقف نہیں ہوسکتے نہ وہ جن کے کان اور جن کے قلب بند کردئے جاتے ہیں، شقاوت کی وجہ سے، شوق نہ ہونے کی وجہ سے اور جن کی آنکھوں پر ایسے پردے لٹکائے جاتے ہیں کہ وہ عالم امثال میں بھی اندھے ہوں ور عالم عرفان میں بھی۔ ہمارے صاحب جو تجر شریف میں نو سال نغمہ ہائے گل سنتے رہے، رنگارنگ جمال یار دیکھتے رہے، لافانی آوازیں سنتے رہے اور اپنا دائمی تعلق معبودِ حقیقی کے ساتھ قائم کرتے رہے، بینا ہیں اور بس نور ہی نور اندر باہر اور اوپر سے نیچے، اسی نور میں غرق اور اسی میں کھڑا۔ وہ معبود حقیقی کے ساتھ اپنا نوری وجود مکمل جوڑ چکے اور اسلئے اپنے داور کے آیات پتے پتے، بوٹے بوٹے اور ذرے ذرے پر پڑھتے رہے، آیات جو دفعتاً ان کے حلق پر چڑھتے تھے اور وہ اپنی داودی لحن میں اس طرح نغمہ سرا ہوتے کہ جگر چاک چاک ہوتا اور انسان اپنے جامے چاک کرنے پر مجبور ہوتا۔ ہمارے صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو قرب الٰہی سے متصف گردانتے ہیں اور اس لئے مانتے ہیں کہ یہاں کی کوئی شے نہ اندھی ہے نہ خدا سے دور۔ سوال صرف شعور کا ہے۔ جتنا زیادہ شعور اتنا زیادہ قربِ الٰہی۔ زینہ گیر کی پہاڑیوں میں مقیم یہ صاحب، یہ مست قلندر، صاحب جمال وکمال، جلال وحال ہیں اور ہم زینہ گیر کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اسے ان کی نو سال مہمان نوازی کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ لوگ، وہ عورتیں اور وہ خادم کتنے خوش قسمت ہیں جنہوں نے خدا مست قلندر کی دل سے خدمت کی ہوگی، ان کو کھلایا پلایا ہوگا اور ان کے نازنین پاؤں کو وقتاً فوقتاً دبایا ہوگا۔ فقیر خدا کی خدمت کرنا فقیر کی ہی دین ہوتی ہے۔ جس پر مہربان ہوئے اس پر ہوئے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے! مگر یہ سب کچھ اپنی جگہ پہ صحیح اور بالکل صحیح۔ کوئی خدا کا بندہ اپنے لاڈلے بیٹے اور اپنی نازنین دختر کو مشکلات میں ڈال کر خود لوگوں کیلئے اور خدائے خلق کیلئے وقف کر کے دکھائے تو ہم بھی صاحب کے سیدھ میں کسی انسان کو کھڑا دیکھیں۔ ایں سعادت بزور باز ونیست۔

اب چلیں آلوسہ اور وہ بھی جنگل میں کسی بڑے پتھر کے نیچے چپ چاپ بیٹھنے، لوگوں کی نظروں سے دور! یہاں صاحب اس طرح بیٹھے جیسے غار میں بیٹھتے ہیں مگر عشق سیدھا کب بیٹھتا ہے۔ بیٹھے گا تو پتھروں پر، کنکروں پر، دیکھے گا تو چاند تاروں کو، تاروں کی جھرمٹوں کو اور وہ بھی رات کی خاموشیوں میں جب چاروں اور ایسا سکوت طاری ہو جیسے کہ قلندر کے لبوں پر جن سے اندر ہی اندر نہ جانے کن پھولوں کے زرگل سے بنا ہوا شہد ٹپکتا ہو، ڈالے گا سر تو زانوؤں میں جیسے کسی بحر ذخار میں ڈبکیاں لگاتا ہو اور لولوئے لالا نکالنے کی سعی کرتا ہو،

اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی سی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لئے چاہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔"

2:261

کون کہدے آب و آتش کون کہدے خاک و باد
جلوہ افروز کھنڈروں میں لالہ و گل شاد شاد
رنگ بھردے پتھروں میں اس کے احمر کا جلال
کیسے خاکی ہوگا ایسا دل ربا عالی نژاد
قدسیاں انگشت بدندان جن و انس بستہ لب
رشکِ نوشیرواں عادل، آرزوے کیقباد
ان کے قدموں سے رواں ہوتا ہے دریائے غنا
گاتی ہیں پریوں کے ہمراہ راگنیاں خانہ زاد

حبیب

سوئے گا تو مٹی میں ملے ہوئے سنگ ریزوں پر یہ دیکھنے لگے کہ سوجانا تمام کائنات کے ساتھ نور کی طرح مل جائے کے مترادف ہے کہ نہیں تا کہ کلفت تک محسوس نہ ہو۔ موت وحیات، دنیا کا احساس جو پتھروں سے ڈرائے، تکلیفوں اور سختیوں سے دور رہنے کی ترغیب دے اور آرام و آسائش کے سروساماں [illegible] حقیقت ابدی کے ساتھ مل جانے کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کس چیز کا بنا ہوا ہے یہ بدن جو آگ کے ڈھیروں کو بھی فرحت گل وگلزار سمجھے اور یار کے ساتھ اوقات گذارتے گذارتے زماں و مکاں کو خیر باد کہے۔ کیا یہ اسی انسان کا بدن ہے جو تمام کائنات کو اپنی خوشبوؤں کی موسیقیت سے بھر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس پتھر سے چشمے رواں ہورہے ہیں جنہوں نے آگ بجھانے کا دائمی انتظام کرلیا ہے، جو اپنے پیداواری معجزوں سے بنجروں کو آباد کر رہے ہیں اور کرتے جائیں گے اور ان سے ایسے بیج پیدا کر رہے ہیں جو قوت لایموت مہیا کرتے رہیں گے اور حیات کے باغ و بہار کھلاتے رہیں گے۔ کھل کھلاتے رہیے اے باغِ عرفانِ محمدؐ! آپ کے قدموں میں کتنی ہریالیاں نمودار ہوئیں اور نمو پذیر۔ رات دن، صبح و شام باغ کھلتے رہے ان ہریالیوں کے بیچوں بیچ کہ ان پر کبھی خزانی ہوائیں چلی گی نہیں اور ان کی شادابی، ہر گھڑی ہر آن بڑھتی رہے گی۔ کون مجاہد ہے ایسا جو ایسی نہریں جاری کرے جن سے جہنم کی آگ اس طرح بجھ جائیگی جس طرح ایران کے آتش کدے ایک دن گل ہوگئے تھے۔

مگر کاروان وجود کبھی ایک ڈگر پر ٹھہرتا نہیں، وہ تو لمحہ لمحہ رنگ بدلتا رہتا ہے مگر نئی آن اور نئی بان کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آلوسہ بانڈی پورہ کا ایک مرکبان جو جنگلوں سے لکڑی لاتا تھا ایک دن پتھر کے اور سے

گذر گیا اور ایک شیر ببر کو دیکھا کہ چپکے سے بیٹھا ہے۔ بس اس کے دل میں تلاطم پیدا کر گیا اور اس کا مہمان بن بیٹھا۔ شیر کو مہمان بنانے والا یہ خوش قسمت مرکبان ثناء اللہ تھا جو شاید اب بھی زندہ ہے۔ اس کے گھر پر صاحب نے تقریباً ڈیڑھ سال گذارا۔ اس دوران قرب و جوار سے مریدان دربار احد آتے رہے اور روحانی و قلبی آسائشوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے معاملات بھی سلجھاتے گئے۔ ان میں شیوسوپور کا ریشی کمہار، غلام محمد گوجری اور سندر دیدی بھی شامل ہے۔ ریشی کمہار خاص مرید تھا جو اب بھی زندہ ہے، اسے گھر کے سارے لوگ ریش مام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ گھر کے معاملات میں کارآمد دلچسپیاں لیتا تھا اور کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ وہ شفا کا قابل اعتماد مرید تھا۔ ان کی خانہ آبادی میں اس نے خوب دلچسپی لی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں رش مام نے مجھے بتایا کہ صاحب نے ایک روز اس سے کہا کہ اگر کسی درماندہ شخص کو راستے پر پڑا
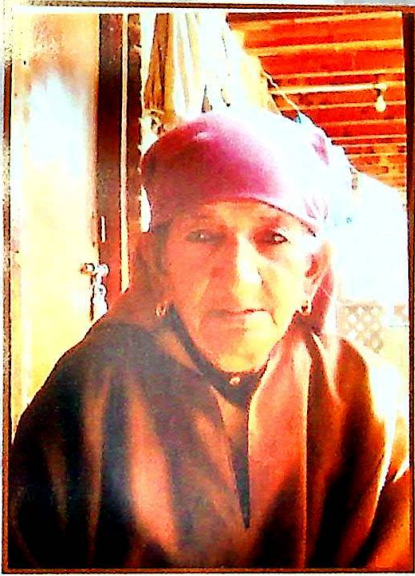
دیکھو تو اسے میرے پاس لانا، میں اسے بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لے چلونگا۔ یہ بات یوں تو معمولی سی لگتی ہے مگر اس میں کتنی گہرائی ہے۔ جو شخص ہر طرف سے مایوس ہو گیا ہو، جس کا کوئی دست گیر نہ ہو، اس کی مدد کیلئے صاحب تیار۔ رش مام کی یہ بات میں نے آواز خلق نقارۂ خدا جان کر جزو جان بنائی ہے۔ غلام محمد گوجری کوئل مقام کا رہنے والا ہے اور تب سے آج تک صاحب کے قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے پیار سے گھر کے سارے افراد گُل گُور کہتے ہیں۔ شفا بھی اسے اسی نام سے پکارتی تھی۔ عطا محمد صاحب اس کی طرف خاص نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ میرا بھی منظور نظر ہے۔ دور دور صاحب کو دیکھتا رہتا ہے اور بہت انہماک سے گاتا ہے۔ سندر دیدی بھی ان دنوں سے ہی صاحب کے گھر کے ساتھ وابستہ ہے۔ آج بھی سوپور میں الکہف کے لنگر کی مہتمم ہے اور وہاں ہی مقیم ہے۔ بہت عرصے تک صاحب کے سامنے بیٹھتی تھی اور اس کی تختی پکڑ کر۔ سندر دیدی بھی کوئل مقام کی رہنے والی ہے۔ اس کے بچے اپنا کام کرتے ہیں مگر وقتاً فوقتاً سوپور جاتے ہیں۔ حفیظہ مقام کی ایک اور فدوی سائلہ ہے۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ صاحب نے کہا کہ میں کسی مرید کو راستے میں چھوڑ کے نہیں جاؤں گا' بہت کارآمد بات ہے جسے بھی میں نے یاد رکھا ہے! گُل گُور نے مجھ سے کہا کہ بانڈی پورہ آلوسہ اور تجر شریف میں قیام کے دوران صاحبہ یعنی صاحب کی رفیقہ حیات ان سے ملنے کبھی کبھی آتی تھی۔ آلوسہ کے ایام میں انہوں نے صاحب

سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے گھر واپس تشریف لائیں۔ صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے۔ صاحب یقیناً سوپور واپس چلے تو گئے مگر رفیقۂ حیات چلی گئی تھی اپنے گھر!

تازہ خواہی داشتن ایں داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ثناءُ اللہ مرکبان کے پاس قریباً ڈیڑھ سال گذار کر صاحب نے آلوسہ کی مسجد میں اور پھر کھلی فضا میں [illegible] گذارے۔ اس طرح تجر شریف سے لیکر آلوسے تک کا گیارہ سال کا سفر پورا ہو گیا۔ اس سفر میں کتنے مشکلات صاحب کو سہنے پڑے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو گھر سے دور رہتے ہوں۔ بیوی بچوں کی فکر سے آزاد ہوں اور جہاد فی سبیل اللہ میں منہمک۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ صوفیائے کرام یا خود پیغمبر ایسی ہی سختیوں سے گذر چکے ہیں، معمول کی زندگی ٹھکرا چکے ہیں خاص کران ایام کے دوران جو فنا سے بقا تک سفر میں گذارے جاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو بھی کچھ تجربوں کچھ واردات قلبی سے گذرنا پڑتا ہو مگر وہ رسیدہ نہیں ہوتے اور کن فیکون کی جرائتوں سے خالی۔ پروردگار اپنے سوا کسی وجود کو پسند نہیں کرتا۔ فنا ضروری ہے اور یہی مطلب ہے لا الٰہ الا اللہ کا!

گ[illegible]ا پر آشیاں سے دور کیوں بیٹھے یہاں
[illegible] جائیں کہاں ہم آپکو اے مہربان
پوچھے نا ہم سے کیسے کٹتے ہیں فُرقت کے دن
[illegible]نا ہے کہ مل کے رہیں ہم جاوداں
بچے بھی [illegible] کرتے ہیں کب سے آپ ہی کا انتظار
[illegible]تے ہیں اشک ان کی آنکھوں سے رواں
کامراں ہے نامور ہے فی سبیلِ اللہ جہاد
[illegible]ھر کی آبادی بھی لازم ہے مگر رندِ زماں
ہم بھی دیکھیں گے بلند اقبال رہ کے ساتھ ساتھ
سونا سونا آپ کی خاطر زمین و آسماں

حبیبؔ

ہم نے ابھی صاحب کے گھر کی تفصیل نہیں دی ہے۔ صرف اتنا کہہ چکے ہیں کہ تجر شریف اور آلوسہ کے گیارہ سال شروع ہونے سے پہلے صاحب نے اپنے آبائی مکان کی چھت گرائی تھی اور وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کے دو معصوم بچے جناب عطا محمد صاحب اور ان کی ہمشیرہ شریفہ صاحبہ جنہیں فرطِ محبت، احترام اور عقیدت سے ہم شفاؔ کے نام سے پکارتے آئے ہیں اور پکارتے جائیں گے، اپنی والدہ جناب حاجرہ کے ساتھ سنگرام پورہ سوپور چلے گئے تھے جہاں صرف ان کی والدہ (یعنی عطا محمد صاحب کی نانی مرحومہ ساجدہ آپا) رہتی

تھیں اور کسی نہ کسی طرح مشکل سے روکھی سوکھی کھاتی تھیں۔ ساجدہ آپا کے کسب معاش کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مال و دولت کا انتظام تو درکنار، ٹکے پیسے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ حاجرہ صاحبہ نہ تعلیم یافتہ کہ سرکاری ملازمت کی کوئی سبیل پیدا ہو جاتی، صاحب کے گھر سے خالی ہاتھ نکلی تھی، کیا کرتیں، کس طرح زبردست اقتصادی بحران کا سامنا کرتیں۔ ان کی ایک پرسنل چیز میرے ہاتھ لگی ہے اور صاحب اس سے واقف ہیں۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب نے طریقۂ محمدیؐ اپنایا تھا مگر ان کی رفیقہ حیات سچ مچ عملی طور پر آگ کی بھٹی میں اپنے معصوم بچوں کو پالتی تھیں۔ عطا محمد صاحب صرف تین سال کے تھے جبکہ ان کی ہجرت سنگرام پورہ ہوئی تھی۔ صاحب تو چلے گئے تھے تن تنہا اور ان سختیوں سے مبرّا جو معصوم بچوں کی پرورش اور کھلانے پلانے میں سامنے ہیں۔ کہتے ہیں جب انسان کا چولہا نہیں جلتا، اس کا پیٹ جلتا ہے۔ یہاں ایک ہی پیٹ کا سوال نہیں تھا، بڑے بڑے دو معصوم بچوں کے پیٹوں اور جانوں کا سوال تھا۔ ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمیں سیدنا امام حسین علیہ السلام کی یاد آتی ہے جب وہ کربلا کے تپتے ہوئے ریگستان میں تھے، بے یار و مددگار کشت و خون کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے چند ایام ہی کربلا میں گذارے نہیں تھے مگر سال ہا سال۔ یہاں کا ایک ایک پل بھی بیسویں صدی سے گذر رہا تھا جس میں عیش ہے، عشرت ہے، روپیہ ہے، مال ہے، سونا ہے، چاندی ہے، جواہرات ہیں، مکان ہیں اور تعیش کا سامان بے حساب! جب لوگ کامرانیوں اور کامیابیوں کے پھول چن رہے تھے، میرا مشتاق اور میری شفا اپنی بے کس، بے بس والدہ کے ساتھ تیز نوک دار کانٹے اپنے چاروں اور دیکھ رہے تھے۔ ابھی سرمایہ دارانہ نظام نے کشمیر پر وہ آفت نازل نہیں کی ہے کہ انسان بھی کانٹے پکائیں، آگ اگر ملے یا مٹی کا تیل، یا گیس یا ماشاء اللہ بجلی البتہ! گیارہ سال کے سیہ دن اور سیہ راتیں صاحب کے بیوی بچوں پر اس طرح گذریں اور ہم یہ نہ سمجھیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کے کیا معانی! انسان خدا نہیں کہ جس کا پیٹ نہیں، جسے خورد و نوش کی ضرورت نہیں اور پیسے ٹکے کی فکر نہیں۔ اگر خدا انسان ہوتا تو اسے گرمئ معدہ اور سردئ ایام کا تجربہ حاصل ہو جاتا اور بلبلاتے بچوں کی سائیکی (psyche) کا اندازہ ہو جاتا مگر وہ اپنے لامکان میں مست ہماری مکانی اور زمانی بے چارہ گیوں کا تماشہ کر رہا ہے جیسے راہ چلنے والے موٹے تازے انسان کوڑھ کے بیماروں کا تماشا کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ! خدا کی بارگاہ میں جذبات کی رو میں بہہ گئے، وہ ہماری خطائیں معاف کرے! نہ جانے صاحب کے حضور میں کہیں گستاخی تو نہ ہوئی، اگر ہوئی ہوگی وہ بھی درگذر فرمائیں گے! ہم سوپور اور گرد و نواح کے ان لوگوں کی سراہنا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے قدمے سخنے اور درمے صاحب کے گھرانے کی حق ادائیگی کی کوشش کی۔ اس سے شاید مشتاق شفا کا تھوڑا سا گذارہ ہو سکا مگر ان کی والدہ مرحومہ معدے کی تکلیف کا شکار ہوگئی اور وفاؤں

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق ایک میر بھاری پتھر ہے
تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

میر

کا جام پیتے ہوئے دربار ایزدی میں "بای ذنب قتلت" کہتے ہوئے داخل ہوگئی۔ ان کا معدہ خوراک کی بے قاعدگی سے کٹا، غم و آلام کی شدتوں سے توازن کھو بیٹھا یا کسی اور گہرے درد سے، دباؤ سے، کون کہہ سکتا ہے ان کے بغیر جو کشاف القلوب ہیں۔

یہ تھا یہاں کا حال اور وہاں شاہِ یوسفؑ تجر شریف کے محل میں بیٹھ کر اپنی شاہنشہی میں مست؟ یہ نہیں کہ انہیں کشف القلوب سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاے اگر ہے تو دودھ نہیں، دودھ ہے تو روٹی نہیں، روٹی ہے تو چاول نہیں، چاول ہے تو ساگ پات نہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کروٹ کروٹ بے [illegible] اور آہوں کے بدلے شراروں سمیت دھواں نکلتا ہے۔ کبھی غم گھربار کبھی بچوں کی حالت زار کا درد، کبھی عید بازار کی محرومیاں اور کبھی نئے نئے کپڑوں کی خوش فہمیاں۔ چیتے کا ان کا جگر اور سنگ خارا ان کا دل لگتا [illegible] کرتا تھا۔ فنا کا جام کسی سلسبیل کے کنارے، کوثر پیتے پیتے، کسی سایہ دار درخت کے نیچے گل و بلبل کی گودی میں بیٹھ کر پیا نہیں جاسکتا۔ وہ قربانی اسماعیلؑ کا ورد کرتے تھے اور صبرِ ایوّبی کی مالا جھپتے تھے۔ مگر رند نہ ورد کرتے ہیں اور نہ مالا چھپتے ہیں، وہ تو صاحب کی طرح جگر کا خون پی پی کر عرفان کے بوٹے لگاتے ہیں تاکہ ثمر پیدا کریں، راہ چلتے مسافر کھائیں اور دل ہی دل میں دعائیں دیں یہ کہتے ہوئے کہ رس اتنا میٹھا اتنا ٹھنڈک پہنچانے والا کہ کسی مرد نے یہ شجر لگائے ہیں!

ایسی بہت ساری باتیں ہوتی ہیں جو لوگ ہمارے پیچھے کرتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ زہر کے گھونٹ پینے کی۔ مگر صاحب کے یہاں معاملہ کچھ اور۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، پرائے ہوں یا اپنے، نزدیک ہوں یا دور، کمزور ہوں یا طاقتور، زاہد ہوں یا گنہگار، صاحب ہر دل سے واقف اور ہر نیت سے آشنا۔ اس کے بعد جو بھی ان کے گھرانے پر گزرتی تھی، جو بھی حالات ان کے صبر و استقامت کی گنجائش پرکھ رہے تھے، وہ ان کو معلوم اور وہ زہر کے گھونٹ بھی پیتے تھے اور جذبات کی لطافت سے بھی واقف تھے۔ خباثت کی دل سوزی ان کے صبر کو آزما نہیں سکتی تھی اور حرص و حسد کے جان کاہ لمحات ان کو متزلزل نہیں کر پاتے تھے۔ اپنی زندگی بھی راہِ خدا میں قربان، اپنوں کی زندگی بھی اسی کے حوالے، نہ دنیا کی پروا

اور نہ آرزوئے شہرت، مارے تو خدا، زندہ رکھے تو وہی، عزت کا مقام بخشے تو اس کے بغیر کون، ذلت اٹھانا پڑے تو دوست کے ہی ہاتھوں، کیا غم اور گھڑی گھڑی جینا مرنا! ہر حال میں وہی کافی، وہی شافی، اسی کی کارفرمائی یا کامرانی! اس طرح ان کے لمحات بیتتے گئے، ان کے اعصاب زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتے گئے، ان کا تن بدن لوہے کا بنتا گیا اور وہ جبروت کے معراج طے کرتے گئے۔ گلستان سامنے آئے تو پریوں اور حوروں کے نغمے سنے اور اپنے راگ بھی دل میں غنا کا حشر بپا کر گئے یا دفعتاً لبوں پر پھوٹ پڑے۔ کوہ و بیاباں سے گزرنا پڑا تو طوفان بن کر اپنا راستہ نکال گئے۔ مشکل پسندی سے کام لیا تو سہل انگاری پر ہنستے گئے۔ جہاد فی سبیل اللہ خون کے دھبوں سے راستوں پر نقش کر گئے مگر اپنے قدموں کو بھی خبر نہ ہوئی! ان نقوش میں جہاد کے معانی جھلکتے نظر آتے ہیں!

صاحب کی رفیقہ حیات غموں کی تاب نہ لاکر آخر رخصت ہو گئیں مگر صاحب کے قدم جمے رہے، ڈٹے رہے، گھر سے باہر قریباً گیارہ سال گذار کر آخر کار انہوں نے سوپور واپس جانے کا ارادہ کر لیا او وہ واپس آ ہی گئے۔ وہ اپنے آبائی مکان میں ٹھہر گئے۔ اس کی تھوڑی بہت مرمت کرائی گئی تا کہ رہائش ممکن ہو سکے۔ عطا محمد صاحب اور شفا بھی اپنی نانی ساجدہ صاحبہ کے ہمراہ واپس آئے۔ اسی زمانے میں ان کا ایک اور مکان بن گیا جو مکان کم تھا مگر رہائشی انتظام زیادہ۔ چونکہ لوگوں کا جوق در جوق آنا شروع ہو گیا تھا اور بڑے لنگر کی بھی ضرورت تھی، اسلئے اس مکان نے دونوں دباؤ برداشت کئے بہت حد تک۔ مگر لوگوں کا آنا جان، دن رات لنگر کا چالو ہونا، موسیقی کی محفلوں کا بہ کثرت انعقاد، شور و غل، گھر والوں کیلئے صبر و برداشت کا ایک نیا باب کھول گیا جس میں سب لوگ خدا کی مہربانی سے عہدہ برآ ہوئے۔ صاحب جلالی رند یا ملنگ کی صورت میں اپنا تخلیقی کام رات دن نبھاتے گئے، کبھی گھر کے اندر ٹھہرے کبھی باہر چلے۔ کبھی پیدل کبھی تانگہ گاڑی، کبھی موٹر گاڑی میں گھومتے پھرتے چلے اور جہاں گئے، جہاں بیٹھے لوگ ساتھ ساتھ چلتے گئے یا آتے گئے۔ اس طرح ان کا اندرون پُرنور ہوتا گیا اور مستحکم، لوگوں کے کام
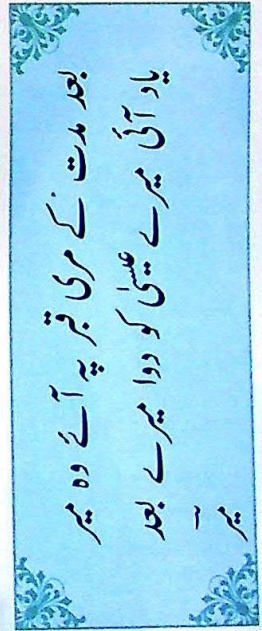
زیادہ سے زیادہ تکمیل پذیر ہوتے گئے اور اب شہر سے دور دور ساری وادی میں ہی نہیں، ان کا جلال و جمال ملک بھر میں پھیلتا گیا۔ کچھ غیر ملکی لوگ بھی مستفید ہوگئے۔ اب شفا کی شادی بھی ہو چکی تھی اور اُن کا ایک لڑکا جہاں گیر پیدا ہوا تھا کہ اچانک ایک دن ان کا انتقال ہوا۔ اس کے فوراً بعد پھر نقل مکانی کا معاملہ درپیش آیا اور صاحب شاید ۱۹۹۷ء میں نور باغ سوپور چلے گئے جہاں وہ اس زندگی کے آخری دن تک قیام پذیر رہے۔ مگر ایک بات صاف دکھائی دی کہ ان کی صحت رفتہ رفتہ بگڑتی گئی، شاید اس وجہ سے بھی کہ وہ چلتے بہت کم تھے اور سفر اگر کرتے تو موٹر میں۔ جسمانی اعتبار سے اگر دیکھیں تو لگتا تھا کہ وہ جوانی کو رخصت کر چکے ہیں اور پوری طرح!

جہاد فی سبیل اللہ کا اگلا قدم اولیاء اور صوفیائے کرام سے ملاقات کے دوران پر مشتمل ہے۔ گھر پر بیٹھے بیٹھے بھی ان سے ملتے تھے، جس طرح جس صورت میں چاہے اسی طرح، مگر شرافت نفس، فروتنی اور تقدسِ روح کا تقاضا تھا کہ خود تشریف لے جائیں اس مقام پر جو کسی ولی یا صوفی سے منسوب ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے مرید انہیں گاڑی میں بٹھاتے تھے یا وہ برضائے رغبت ان کی گاڑی میں بیٹھ کر ان کی تسلی فرماتے تھے۔ مریدوں کے دلوں کی بجا آوری سے انہیں نہ جانے کتنے حجِ اکبر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی۔ جو مریدوں نے کہا، وہی کیا اور ان کے دلوں پر پیار و محبت سے اپنی حکومت قائم کی۔ پیار سب سے بڑی حکومت ہے۔ اپنے لئے بڑی چیز یہ کہ جہاں سے جو بھی حسن و جمال دیکھا، اس کی تحسین و تعریف کی اور اس طرح اپنا جہانِ جمال اور اور آباد کیا۔ جہاں بھی کوئی سبق ملا، وہ اپنے علم و عرفان میں جوڑ دیا اور رب زدنی علما کا عملی ثبوت دیا۔ محمدؐ کو ہند اور چین کے عرفانی ساگروں نے متوجہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے اور چین بھی جانا

> صد ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
> دل بجا آور کہ حج اکبر است
> رومی

> ''یوسف نے کہا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، بے شک میں خوب نگہبانی کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں
> اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں اقتدار دیا، وہ اس میں جہاں چاہتا قیام کرتا، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہیں، نوازتے ہیں، اور ہم نیکیوں کا اجر ضائع نہیں کرتے''
> 12:55-56

پڑے علم کیلئے تو جاؤ۔ صاحب بھی جگہ جگہ گئے کہ دنیا میں ہر جگہ ذرّے ذرّے میں آیات الٰہی بکھرے پڑے ہیں۔ ہم ان مجاہد کی تحسین کرتے ہیں اور ان پر سلام بھیجتے ہیں۔ وہ حضرت بل تشریف لے جاتے اور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب آثار شریف میں نورِ محمدی کو سلام کرتے کہ

خوش آں مجلس و مسجد و خانقاہے ۔۔۔ کہ باشد در آن قیل وقال محمدؐ

حضرت غوث پاک سید عبدالقادر جیلانیؒ کے دربار میں جاتے اور سقانی الحب کا سات الوصال کے سمندر میں [illegible] تے۔ امیر ہمدانؒ کی خانقاہ پر جا کر اسرارِ چہل اسرار واورادِ فتحیہ کا بچشمِ باطن مشاہدہ فرماتے۔ حضرت محبوب العالمؒ کے کوہ ماراں سے سلطان مرا خرم کند، سلطان مرا بے غم کند، سلطان بداند حال ما، سلطان برآرد کارِ ما، آسان کند دشوار ما، محبوب العالم پیر ما کے باطنی اسرار ملاحظہ فرماتے۔ کبھی دیہات کی سیر کرتے اور ریشی صاحبؒ ٹنگمرگ، [illegible] العالمؒ چرار شریف یا ریشی صاحبؒ عشہ مقام کے عرفانی سمندروں کا پانی پیتے۔ پکھر پورہ، خان صاحب، [illegible] شریف، جانباز ولی بارہمولہ، نادی ہل یا دیگر مقامات کا مختصر تذکرہ بھی طوالت کا سبب بنے گا۔

کشمیر کے صوفیوں میں شاعر صوفیوں کا خاصا مقام اسلئے بھی ہے کہ وہ اپنے کلام کے ذریعے بھی دلوں کو منوّر کرتے آئے ہیں۔ شعر انسان کو عالم بالا میں پہنچا دیتا ہے اور اس کی اثر پذیری مسلمہ ہے۔ ہمارے صا[illegible] شوقین تھے سماع کے۔ سماع کے شوقین شاہ غفور، شاہ قلندر، سوچھ کرال، رحیم سوپوری، شمس فقیر، احمد بٹواری، رسول میر، صمد میر اور احد زرگر کی آرام گاہوں پر جاتے اور ان کے تجربوں کو اپنے دل کی وسیع وعریض دنیا کے ساتھ ملاتے۔ ہمارا دل بھی ان کی غنائی کیفیات سے لبریز ہو رہا ہے اس وقت بھی اور ہم خدا سے دست بدعا ہیں کہ ان بزرگان دین وسلوک وولایت کو اپنی بے پناہ رحمتوں سے اور اور نوازے اور ان کی جبروت میں اور اور اضافہ کرے۔ آمین! صاحب ان بزرگوں کی صحبت میں کن روحانی مرحلوں سے گزرتے، کون کون سے جہان جمال و کمال مشاہدہ فرماتے، کن کن جمالی وجلالی کیفیتوں سے لطف اندوز ہوتے، ہمیں نہیں معلوم البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ہم جنسوں کے ساتھ پرواز کرنا اور ان کے ساتھ لمحات گزارنا کتنا روح افزا ہے اور اطمینان بخش۔ خوشا اقبالِ صاحبِ اَحد!

> بادہ نوشاں غمت داودؒ و معروفؒ و جنیدؒ
> سرفروشاں درت عمارؒ و سلمانؒ و بلالؒ
> شاہِ ہمدانؒ

مگر دور دراز جگہوں پہ جانا، لگاتار گاڑی میں بیٹھنا، اکثر و بیشتر بے خور و خواب رہنا بھی کچھ کم مجاہدہ نہیں۔ جسمانی صحت بھی اچھی نہ ہو، جوانی بھی خدا کے حوالے گذر چکی ہو پھر ہچکولے کھانا، ایک جگہ بیٹھنا، اچھی طرح ہاتھ پاؤں بھی نہ

پھیلانا، اور خاص صوفیانہ انداز سے باحضور گاڑیوں میں بھی بیٹھنا آسان کہاں؟ ہر کام دشوار پھر روح کی آبادکاری اوپر سے بھی، نیچے سے بھی مشکل سے بھی مشکل! شاباش اے رندمست مست، آپ نے اپنی عمر کا پل پل بس پائیدار اور وفادار یار کی راہوں میں مشکلات سہتے سہتے گذارا! مبارک آپکی راہیں، مبارک آپ کا گام گام!

صاحب کے دورے صرف درگاہوں اور صوفیوں کے مزاروں تک محدود نہیں ہوتے، اصلاً وہ نزدیک و دور علاقوں کی سیر کرتے، لوگوں سے ملتے، ہریالیوں کا مشاہدہ کرتے اور قدرتی ماحول میں دوسری چیزوں کو اپنی نظروں سے منوّر کرتے۔ ان سیروں میں سیاحت بھی ہوتی تھی، مشاہدات مناظر قدرت بھی ہوتے تھے ذمہ داریاں بھی ہوتی تھیں اور ان کی ادائیگی بھی۔ لوگوں سے ملنا بھی ذمہ داری ہے، گاؤں کے لوگوں سے خاص غربت اور لاچاری، لاعلمی اور بیماری کے مارے ہوئے لوگوں سے، ان کے بلبلاتے ہوئے بچوں سے، ان بوڑھوں اور بوڑھیوں سے جن کی خبر لینے والا اس عمر میں کوئی کوئی ہی ہوتا ہے، شہر میں زیادہ دیہات میں کم۔ ان لوگوں سے ملنا ایک بہت بڑی داستان حیات ہے جسے سننے کیلئے دل جگر بھی چاہیے اور صبر واستقلال بھی۔ اس داستان میں درد ہی نہیں درِ جگر ہے۔ اس داستان کو سنئے تو پیغمبروں کی کہانیاں اچھی طرح سے سمجھ میں آئیں گی جنھوں نے غریبوں، مسکینوں، بے کسوں، بیواؤں، یتیموں، بیماروں، بے علموں، سیدھے سادھے لوگوں، عورتوں، بوڑھی عورتوں، غلاموں اور بے گھروں کی خاطر مصیبتیں جھیلیں۔ یہ مصیبتیں ان لوگوں کی دین ہوتی ہیں جو نہتے عوام کا خون چوس چوس کر اپنی مادی زندگی کی عیاشیوں اور عشرتوں کا سامان بہم کرتے ہیں۔ دولت لوٹ لوٹ کر جمع کرتے ہیں، معاشی وسائل پر قبضہ کرتے ہیں، خود سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ملازمتیں اور سرکاری عہدے بھی، تجارت اور منڈیاں بھی، مگر بے چارے مفلس عوام کیلئے تھوڑا سا بچا کھچا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان ظالم لوگوں کا دل دل نہیں ہوتا، ان کے سینے میں پتھر ہوتے ہیں جو کسی چیز سے آسانی سے توڑے نہیں جاسکتے۔ ان میں

عار نہیں، بے عار لوگ بیگار کے عادی ہوتے ہیں۔ طفیلی کیڑوں کی طرح بے کسوں کے جسم پر پلتے ہیں۔ ابولہب، ابوسفیان، ابوجہل اور منافقین کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جنہوں نے ہمیشہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مشکل بنانے کی کوشش کی اور ان کے دینی وروحانی راستے روکنے کی سعی کی، جتنا ان سے ہوسکا۔ فرعون کی مثال بھی دی جاسکتی ہے جس نے خدائیت کا دعویٰ کیا، جس نے موسیٰ علیہ السلام کو مار ڈالنے کی سرے سے ہی کوشش کی۔ وہ لوگوں کا استحصال کرتا تھا، ان کو پیستا تھا اور اپنی بادشاہت کے نشے میں لوگوں کا دکھ، لوگوں کا درد [illegible] کرتا تھا۔ آجکل ابولہبوں، فرعونوں، نمرودوں اور یزیدوں کی کمی نہیں، ہر ملک میں جگہ جگہ یہ لوگ زندگی کے دشمن بنے بیٹھے ہیں اور آزارِ خلق سے ہوتے ہوئے خداپرستی کے راستوں کی ناکہ بندی کرتے ہیں۔ ہمارے صاحب لوگوں کے دکھ سکھ میں شامل ہوجاتے ہیں، گلی گلی کوچہ کوچہ پھرتے ہیں، خاموش تندہی سے اپنے تخلیقی [illegible] تعمیری طاقتوں سے ان کے دکھ درد دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کو تسلی دیتے ہیں اور ان [illegible] غم و آلام کی، پریشانیوں کی آگ بجھانے کی ان تھک کوشش کرتے ہیں۔ صاحب کے دربار پہنچ کر ہم ان باتوں کی اور کھل کر وضاحت کرتے ہیں انشاء اللہ، حالانکہ گلی کوچے، کھیت کھلیان، باغ وراغ اور نزدیک و دور جگہ جگہ ان کا دربار ہے۔ فقیرانِ خدا خدا کی زمین پر اور آسمان پر اپنا کام کرتے ہیں!

[illegible] لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمارے صاحب، ہمارے قلندر، درختوں، پودوں، ندیوں، نالوں، دریاؤں، چشموں، جھیلوں، پہاڑوں، میدانوں، بنجروں اور چراگاہوں سے بھی ملتے ہیں۔ سوپور کا سارا علاقہ، [illegible] ہندواڑہ، لولاب، زینہ گیر، بانڈی پورہ، بارہمولہ سیب کے باغوں سے بھرا ہے، کھیتوں سے لہراتا رہتا ہے اور چرند و پرند کے دل آویز نقشے بھی پیش کرتا ہے مگر سکیب کا دیو منہ کھولے اس کی خوش خالی کا دشمن اپنا تخریبی کام بھی کرتا رہتا ہے۔ ڈاتھین، کیرتھین اور پتہ نہیں کیا کیا رنگدار کیڑے مار تماشے بار بار چھی چھی کر کے بھی سکیب کو بھگا نہیں سکتے۔ بھگا سکیں تو کیسے؟ اگر سکیب جائے تو کارخانے جن میں دوائیاں پھٹا پھٹ تیار ہوتی رہتی ہیں، کہاں جائیں۔ تاجر بھی کہاں جائیں جنہوں نے کارخانہ داروں کی طرح کرنسی نوٹ کے گاندھی کو لکشمی دیوی کے ساتھ دیوار پر چپکا دیا ہے پوجا کرنے کیلئے اور اصلی گاندھی کو بے کام و دندان نتھو رام گوڈسے کے حوالے کیا ہے اور وہ بھی برلا مندر میں۔ صاحب سکیب کے دیو سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: میرے قدموں کو زخمی کرو، مجھے رات دن اذیت پہنچاؤ مگر میرے سیبوں کو چھوڑ دو۔ یہ میرے زمینداروں کے پھل ہیں جن پر وہ گذارہ کرتے ہیں، سکول چلاتے ہیں، سائیکل موٹر خریدتے ہیں، پکی اینٹوں کے مکان بناتے ہیں، کارخانوں میں بنے ہوئے نئے قسم کے کپڑے خریدتے ہیں اور باور کرتے ہیں کہ ہم بھی خوشحال ہیں۔ میرے جسم پر پلو مگر

ان پھلوں کو چھوڑ دو۔ ندیاں، نالے، دریا، چشمے، جھیلیں فریاد نہیں کرسکتیں مگر صاحب کو دیکھ تو سکتی ہیں، اپنے صاحب کو! ان کے دلوں سے آہیں نکلتی ہیں جو پھر بادل بن کر خوب برساتی ہیں۔ پھر ندی نالے سب پانی سے بھر جاتے ہیں اور سیبوں میں بھی وہ لال لال گلابی رنگ پیدا ہوتے ہیں جو دہلی، کانپور، بنگلور، منگلور، بومبے، کولکتہ کے بازاروں میں سائیکل رکھشوں پر بیٹھے ہوئے مٹھائی خوروں کو اپنی طرف متوجہ کرکے زینہ گیر لولاب ہندواڑہ کپواڑہ کی جیبیں گرم کرتے ہیں۔ جنگل اور چراگاہیں انہی بارشوں سے بھر جاتی ہیں اور گھاس کے ہرے بھرے میدان اور کھیت اپنی ہریالیوں سے گائے بکری بھیڑ کے تھنوں کو دودھ سے بھر دیتے ہیں اور ہم ماکھن چور ماکھن کھانے لگتے ہیں چوری چوری! بھیڑ بکریاں پتوں پر بھی گذارہ کرتی ہیں اور صاحب کو دعائیں دیتی ہیں کہ آپ آئے اور ہمارے ہاں بھی بہاریں کھِل گئیں!

قلندروں اور ملنگوں کی نظروں میں بڑا جادو ہوتا ہے۔ اس جادو سے کیا کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ صاحب کے جادو کا کہنا ہی کیا! جب آپ کی بین بجتی ہے تو پتھروں سے بھی ساز وسنگیت کے ساتھ ساتھ راگ رنگ چھوٹتے ہیں، پیڑ جھومتے ہیں اور پنچھی پھدک پھدک کر نشاط نوا و نغمۂ ادا پر اُتر آتے ہیں، بادِ صبا کے نرم نرم جھونکوں سے اور پھولوں کی مہکی مہکی طرح داریوں سے ہوائیں بے قرار ہو ہو کے کبھی ادھر کبھی اُدھر سر پٹکاتی ہیں۔ شاید جنونِ عشق سے وہ بھی بے حال ہوجاتی ہیں۔ بھنورے بھنبھناہٹوں کے دلدادے اپنا آرائش جمال دکھاتے ہیں اور تتلیاں نرم ونازک نقاشیوں پر اترانے لگتی ہیں۔ سورج کی تیز شعاعیں اپنی تیزیوں کے خمار سے مدہوش ہوجاتی ہیں اور دھوپ سہاونا روپ دھارتی ہے کہ سایے بھی خود بخود اپنا سائبان کھڑا کر بیٹھتے ہیں۔ قسم ہر جمیل وجلیل شے کی جو جادوئے یار سے مخمور ہے، ہمارے قلندر نے ہمیں بھی مسحور کردیا مگر ہم دمادم مست قلندر نہیں! ہم نے مردِ مجاہد کا مجاہدہ دیکھا اور ہم واری ہوگئے! سلام ان پر اور ان کی اولاد پر، اور اولاد کی اولاد پر! اولاد کا سلسلہ بھی دراز کردیا انہوں نے!

ہم پتھروں کو بھول نہ جائیں! ایک فرہاد کا نام کس نے نہیں سنا۔ اس نے تو شیرین کیلئے اتنے پتھر توڑے، اتنے پتھر توڑے کہ کوہ سے پانی کی دھاریں اچھل پڑیں اور افسوس ان کے ساتھ فرہاد کے خون کے لال لال چشمے بھی پھوٹ پڑے مگر چشمے کیا کہ بہاراں ہوگئے، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ صاحب نے پتھر توڑ توڑ کر صرف ایک چشمہ شیریں نہیں بہایا، ہزاروں بہائے۔ ان چشموں کی بہاریں کوئی دیکھے تو۔ ان چشموں کا پانی وہی جنّت کا پانی جو سلسبیل جیسی جوئباروں میں رواں ہے۔ ایسا ہی پانی سمجھ لیجئے کہ جنّت کا باغ و بہار ہے اور جنّت الماویٰ اور ملاء الاعلیٰ کی ٹھنڈک! کیا کریں، کس طرح سمجھائیں ان نادانوں کو جو روحانی کیفیتوں اور روحانی لذّتوں سے نا

> راز پنہاں سے ہوئے ہیں کتنے جگر چاک چاک
> خون خونین گلستان ہیں مرحبا اے روئے خاک
> حبیبؔ

آشنا ہیں۔ پتھروں سے مراد ہے سخت دلوں کو توڑنا اور انہیں موم بنانا تا کہ غیبی سوز و ساز اور غنا کی گنجائش پیدا ہو۔ یہ غیبی آوازیں مثنوی مولانا روم سے بھی شروع ہوتی ہیں اور اس کے اشعار میں سرایت کر جاتی ہیں۔ ان ہی آوازوں سے دیوانِ شمس تبریز غنائیت کا ایک انمول دربار بن گیا اور انہوں نے ہی [illegible] احمد صاحب بٹواری کے نغموں کو لافانی بنا دیا۔ مرکز دل ہی تو ہے جس کا دربار احدی اگلے باب میں کھلے گا اپنی سندرتا کے ساتھ! اس دل کی آبادکاری کا بہت بڑا کام صاحب نے اٹھایا اور یہ ان کے جہاد کا ایک عظیم باب ہے، درخشان بھی اور گل ہائے رنگ رنگ کا گلستان بھی! اس آبادکاری کی چھینٹیں گل گور کے چہرے پر پڑگئیں [illegible] گلشن گلشن پھول کھلے جو میں نے دیکھے۔ اس کے چہرے کے احوال دیکھئے۔ صاف نظر آتا ہے کہ صاحب نے اس کے دل میں ایک کنواں کھود دیا ہے جس میں شاہ یندرار (اندر راجا) کا اک تار اب بجتا رہتا [illegible] شام! ایک اور چھینٹ پڑی شاید بانڈی پورہ کی رہنے والی ایک بڑھیا پر جس کا نام غالباً عشہ مال ہے جو ڈوب کر دیکھتی رہتی تھی گھنٹوں صاحب کے چہرے کو۔ نہ جانے کیا نظر آتا تھا وہاں اس نازنین عارض میں اس [illegible] کے ساتھ بلا تکلف بہت سیدھی سادھی زبان میں باتیں کرتی تھی اور وہ سنتے تھے! پتہ نہیں کہ عشہ مال کو دل نے ڈبو دیا اور وہ چلی گئی کہ نہیں مگر رش مام زندہ ہے اور اس کا گنوار دیہاتی زباں میں گنگنانا بھی جس میں میں نے تان سین اور بڑے غلام علی خان صاحب کے سُروں سے زیادہ پُراسرار سُر پا کے سنے! یہ صاحب کس دیس سے آئے ہیں یہاں عشہ پیر کی زمین پر بیٹھنے کیلئے اور میرا دل چاک چاک کرنے کیلئے!

فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولاتکفرون۔ مختصر یہ کہ الکھف میں رہنے والے ہمارے ملنگ کتنے غاروں میں چھپ کے رہتے ہیں جو بھی انہوں نے پتھر توڑ توڑ کے بنائے ہوں چوری چوری چھپ چھپ کے رہنے کیلئے۔

اس بادۂ و تریاک کا ایک اہم باب صاحب کی تبدیلیٔ مکان کے نرالے انداز ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کے بارے میں کیا جان ہو سکتی ہے کیا پہچان مگر کچھ تو غبارِ خاطر کے طور پر لکھ ڈالیں گے ہی! عبدالخالق نائیکو اور علی محمد نائیکو آج ہمسائے ہیں مگر ایک زمانے میں اتنے قریب نہیں رہتے تھے جتنے کہ آج۔ پہلے ہم ہز ایکسلنسی چیف

> یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
> تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
> غالبؔ
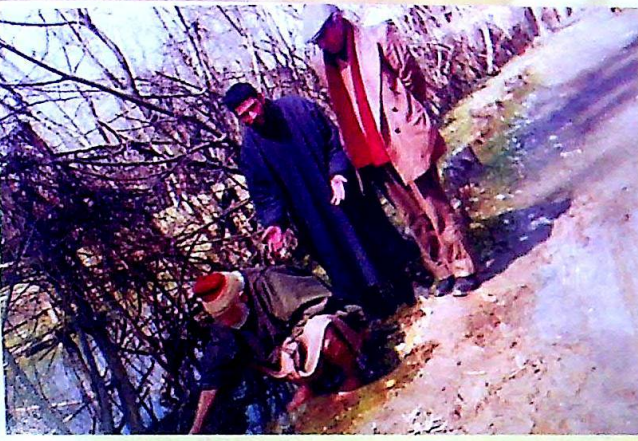
جسٹس جناب نثار احمد صاحب ککرو کے پرانے گھر کانس پور بارہمولہ جائیں گے جہاں صاحب اکثر جاتے تھے اور چھوٹی سی پہاڑی کے پاس ذرا خاموش ماحول میں کچھ وقت گزارتے تھے۔ ان دنوں جسٹس ککرو وکالت کرتے تھے۔ میں اس گھر میں صاحب سے آسانی سے مل سکتا تھا اور کبھی کبھی غذا بھی کھاتا تھا۔ صاحب کبھی بہت سویرے اٹھتے اور باہر چلے جاتے۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے سڑکوں پر، باغوں میں، کھیتوں میں چلے جاتے۔ صاحب ککرو صاحب سے پیار کرتے تھے اور ککرو صاحب ان کے شیریں لبوں سے گالیاں کھا کے بھی بدمزہ نہیں ہوتے تھے۔ گالیاں کھانا ہی اصلی غذا ہے کیونکہ قلندرانہ راز ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیں دنیا الٹی دکھائی دیتی ہے مگر ہوتی ہے وہ سیدھی! صاحب کی مدھر زبان کا ذکر بعد میں البتہ! ککرو صاحب کی کوٹھی چھوڑ کر پھر بادیہ پیمائی اور پھر لیلیٰ لیلیٰ کی تانیں مجھے کم ہی سمجھ میں آتی تھیں۔ رموز قلندری خسرو ہی جانتے ہیں۔ راہ حق میں آرام چھوڑ دینا، گرم گرم اور نرم نرم بستروں کی آسائش ترک کرنا، پھر خورد ونوش کی لذتوں کی فکر نہ کرنا اور نہ پروا، یہ باتیں صاحب کو ہی معلوم تھیں جو سبیل اللہ کی بڑی بڑی اور اہم چیزوں کے مقابلے میں ان چیزوں کی پرواہ ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ کبھی گھنٹہ بھر کیلئے باہر رہتے مگر کبھی بس چلتے رہتے تھے۔ یہ گھنٹے دو گھنٹے کا باہر رہنا بھی ضروری نہیں کہ اتنا ہی ہوتا تھا۔ ہم جسے گھنٹہ سمجھتے ہیں اسے وہ قرن بھی بنا سکتے ہیں اور جسے ہم کانس پورہ سمجھتے ہیں وہ سارے ملک کا احاطہ کر سکتا ہے۔ خیر یہ تو زماں ومکاں کی باتیں ہیں جنہیں رسیدہ عارف جانتے ہیں، ہم تو ککرو صاحب کے چہرے کی طرف بس حیرانگی سے دیکھتے تھے کہ صاحب کب واپس جائیں گے! صاحب صرف کانس پورہ ہی نہیں جاتے تھے بلکہ سرینگر پولو ویو بھی جہاں جسٹس ککرو کی سرکاری کوٹھی تھی۔ ککرو صاحب جسٹس ہوتے ہوئے

یہ جلالی شان یہ انداز یہ قصد سفر　　یہ تفکر کا نرالا موڈ یہ گہری نظر

یہ کلاہِ سروری خوشرنگ پھرتیلا لباس　　ایسے جاموں میں نہیں دیکھا کوئی شیر ببر

بیٹھنے کی یہ نفاست سوچ کی گہرائیاں　　ڈوب کر بیٹھی ہے ان میں زندگیٔ بحر و بر

عقلِ کل کا بوجھ دائیں ہاتھ پر ہوگا گراں　　تیور ہوں سنجیدہ ایسے کیسے ہونگے بے خبر

چومتی ہیں میری نظریں نازنین رو کی دمک　　زخم دل پہ چھا گیا ہے مست آنکھوں کا سحر

بھی صاحب کو دل سے مدعو کرتے تھے۔ میں بھی سرکاری کوٹھی پر صاحب سے ملتا تھا۔ وہاں بھی صاحب نظروں کی شفاعت سے نوازتے، دلوں کو آباد کرتے اور کبھی محفل موسیقی سے اشارے فرماتے، جو حاضر ہوتے ان کو بھی۔ جو نہ ہو [illegible] ایک رات پولو ویو کی کوٹھی پر روتے روتے میں نے کچھ غزلیں لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک غزل:

لیلیٰ لیلیٰ پھر پکارے ہوگیا دیوانہ اور　　مارو پتھر آگ میں پھر جل گیا ویرانہ اور

اڑ [illegible] ہے دھیرے دھیرے رقصاں ریت پر　　پھر برسنے لگ گئی یاں گرمیٔ میخانہ اور

[illegible] میں چنگاریاں محوِ نماز　　آگ کے شعلوں کی اُچھل کود پھر جویانہ اور

آؤ آؤ عاشقو جل جل ترنگ بج بج بہار　　رنگ رنگیلا ناچ گانا، باغ پھر بُستانہ اور

عاشقانہ پھر کوئی فراّت پر رقصِ لہو　　چومتا ہے پھر کوئی خنجر سناں جانانہ اور

سنتی ہے نغمہ وفا کا محل کی رنگین قندیل　　ناچتا ہے آگ کا طالب کوئی پروانہ اور

حبیبؔ

خالق صاحب دل کی گہرائیوں سے صاحب کو چاہتا ہے، گو کہ روپیہ کا پکا عاشق بھی ہے۔ اگر اس کی زندگی کا مرکزی نقطہ بے تصنع سادگی اور بھولا پن ہے تو میں سمجھوں گا کہ وہ صاحب کا بے لوث خدمت گار اور خواہشمند خیر خواہ ہے۔ بے تصنع زبان میں صاحب کے ساتھ باتیں کرنے والا یہ مرید انہیں کھلانے پلانے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا مگر نمبردار چال سایے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ صاحب کی ساری اولاد عطا محمد صاحب سے لیکر گلریز مشتاق تک سب اس کے ساتھ اس طرح کلام کرتے ہیں کہ خالہ صاحب کے ساتھ اپنائیت دور سے دکھائی دیتی ہے۔ کہتے ہیں خالہ صاحب صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے امیر ہوگئے۔ صاحب
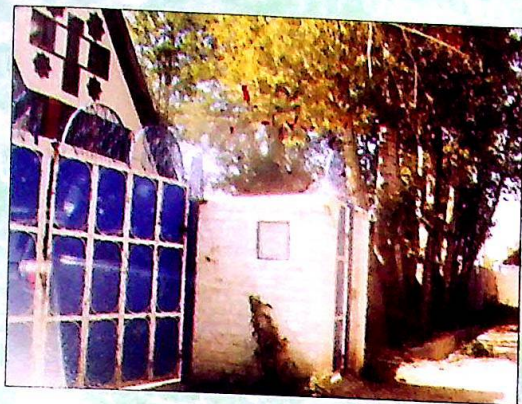
اس کے ہاں جاتے اور ہفتوں، مہینوں رہتے۔ خالہ صاحب کے ماتھے پر میں نے کبھی کم سے کم [illegible] ہیں دیکھے۔ صاحب یہاں سائلوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا اپنے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے کئی بار صاحب کو خالہ صاحب کے گھر پر تنہا یا تو لیٹے ہوئے دیکھا یا سوئے ہوئے۔ یہاں لنگر تو تھا نہیں البتہ سائلوں کی مہمان نوازی ہوتی تھی اور چائے وغیرہ کے دور چلتے رہتے تھے۔ میری عادت ہے کہ میں لفظوں کے اندر جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لگتا ہے کہ صاحب خالہ صاحب کے گھر میں کوئی خاص تخلیقی یا مشکل کام کرتے تھے۔ میری اپنی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں کا فیصلہ بھی یہاں ہی ہوا ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک دن علی الصباح میں اور عطا محمد صاحب صاحب کے سامنے یہاں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے کہ صاحب کی زبان مبارک سے ایک خاص جملہ نکلا جو ہم دونوں کی زندگی کو چھورہا تھا۔ میں نے زندگی میں کوئی ایسا شخص، کوئی ایسا فقیر نہیں دیکھا ہے جس نے میری زندگی میں اس قدر انقلاب لایا ہو۔ کسی وقت میرا دل یاس سے بھر جاتا ہے اور میں کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر تنہا نالے کرنا چاہتا ہوں۔ باور نہیں ہوتا کہ ایسے فقیر ہوتے ہیں جو کسی درماندہ انسان کی دستگیری کرتے ہیں۔ صاحب کے ساتھ اُٹھ بیٹھ سے میرے دل میں بڑی بڑی باتیں آنے لگیں اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کے ہاتھوں بہت گھر آباد ہوئے، یہاں کے گھر ہوں یا نہ، مگر اصلی گھر ضرور۔ زندگی میں کوئی ایسا جانباز فقیر نظر نہیں آیا جو اگر کھلانے پہ آئے تو بہت کچھ کھلا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہیں۔ بھری بزم میں راز کی بات اگر کہیں تو بے ادبی ہوگی ہی ہوگی مگر سزا بھی ملے گی!

خالہ صاحب کی زمین کے پاس ہی نہر کے کنارے صاحب کا گھر ہے جو شایقین احد کا عبادت خانہ ہے۔ صاحب اس جگہ پر اکثر و بیشتر آیا کرتے تھے اور نہر کے کنارے یا چنار کے پاس بیٹھتے تھے۔ مبالغہ نہ ہو تو شاید خالہ صاحب کی محبت بھی اس جگہ پر بیٹھنے کی وجہ تھی۔ یہ مجاہد یہاں نہر کے کنارے پانی کو دیکھتے رہتے تھے

اور پانی کی روحانی اہمیت کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ غور و فکر سے نہ جانے کہاں کہاں پہنچتے تھے اور کیا کیا نتائج اخذ کرتے تھے۔ شاید سوچتے تھے کہ پانی سے ہی انسان بنا، پانی سے اس کی تخلیق ہوئی، پانی ہی اس کی حیات ہے اور حیات ابدی بھی کیونکہ و جعلنا من الماء کل شئی حی قرآن کا درس ہے۔ مگر پانی کے اندر گہرے راز بھی ہیں جن کی طرف پہلے باب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مجاہد ایک دن اسی نہر کے کنارے چلچلاتی دھوپ میں کھڑے تھے۔ شاید اگست کا مہینہ تھا۔ اِن کے جسم سے پانی کی طرح [illegible] تھا۔ میں کم سے کم دو سو فٹ دور چنار کے نیچے کھڑا تھا۔ پسینے میں شرابور صاحب کو دیکھ کر دل نے کہا کہ اگر ممکن ہوتا میں ساری دنیا سے قسم قسم کے پھل لاتا، انہیں نچوڑتا اور صاحب کو وہی رس بوتلوں بوتلوں پلاتا۔ ابھی [illegible] ہی بنا رہا تھا کہ صاحب نے دور سے آواز دی ''ہیو چیو پانس'' ارے ہو، پئو خود! میرے پھل بس خیالی تھے مگر ان کا رس اصلی تھا۔ میں نے ان کے زخمی پیروں کے صدقے خوب پیا اور کئی کئی بار، یہاں وہاں اور ہر جگہ! ساقی ہوں تو ایسے!
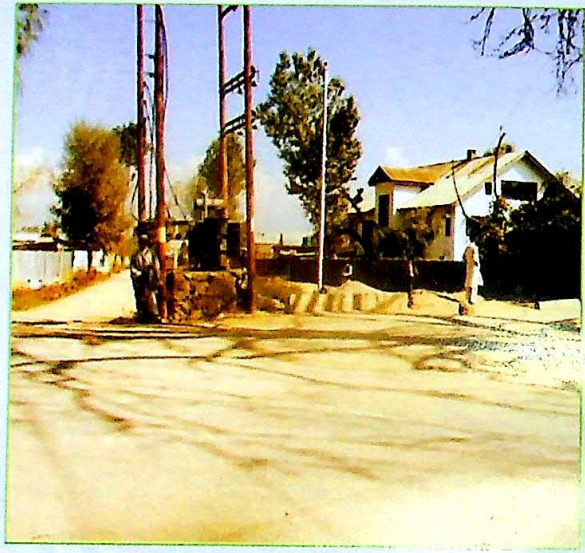
بالکل پاس ہی تقریباً تین سو میٹر کی دوری پر ایک اور خادم کا مکان ہے، علی محمد نائیکو کا۔ یہ زمیندار میوہ پیدا کرتا ہے۔ بڑا پھرتیلا شخص ہے۔ صاحب کے دربار میں علی الصباح آتا تھا اور چائے سے بھرا ہوا چھوٹا سا سماوار لیکر اور روٹیاں۔ چائے اچھی ہوتی تھی۔ علی محمد بولتا کم تھا اور اس کے بچے بھی۔ میں نے رس پلایا بھی نہیں تھا پھر بھی پی رہا ہوں۔ انہوں نے چائے پلائی اور کئی بار۔ انہوں نے کتنی چائے پی ہوگی اور وہ بھی نمکین، کبھی مکا کی روٹیوں کے ساتھ

کبھی لیس دار گندم کی روٹیوں کے ساتھ، جو وہ خود بناتے تھے۔ اسی علی محمد کے مکان میں صاحب ٹھہرتے تھے، کبھی کئی کئی دن، بلاتکلف، لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے، سائلوں کے ساتھ کبھی کبھی اکیلے۔ علی محمد کی بظاہر صحت سے ناساز بیٹی بھی وہاں ہوتی تھی، نیلا۔ صاحب کے ساتھ مدھر زبان میں بات کرتی، بابا آپ چائے پئیں گے، کھانا کھائیں گے، وغیرہ۔ صاحب حسب دستور خاموش۔ پھر نیلا آتی، چائے پلاتی، کھانا کھلاتی انہیں بھی، کبھی کبھی سائلوں کو بھی۔ علی محمد گھر پر ہو نہ ہو، مگر صاحب اپنا دربار جماتے تھے! میں نے بھی دو ایک بار چائے پی لی ہے یا شاید کھانا کھایا ہے مگر میں خالہ صاحب یا گرو صاحب کے گھر میں زیادہ بے تکلفی سے بیٹھتا تھا۔ صاحب نے زمینِ سوپور کا یہ ٹکڑا اپنی اٹھ بیٹھ کیلئے کیوں چنا تھا، کسے معلوم مگر اندازہ ہے کہ نور باغ ان کی عارضی یا مستقل منتقلی روحانی اعتبار سے اہم تھی۔ انہوں نے اس طرح جہاد فی سبیل اللہ کے دھوپ چھاؤں سے گزرتے گزرتے روحانیت میں خاصے اضافے کئے تھے۔ کشمیر میں اگر آزادیٔ گفتار و اظہار ہوتی اور اگر روحانی [illegible] اجازت دیتے تو میں دل کا بوجھ خوب خوب ہلکا کر دیتا۔ یورپ جا کر ایسا کرنا ممکن تھا مگر صاحب کی زنجیر [illegible] اس طرح کس کے باندھ رکھا تھا اور ان کے شہد و شیریں بول، ان کے دل ربا انداز اتنے اچھے لگتے تھے کہ کبھی کشمیر سے باہر نکلنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوشش یک طرف! انکی بظاہر جدائی کیسے برداشت ہو رہی ہے، یہ بھی ان کی کھلی کرامت ہے! خلوتوں میں اپنے مریدوں کے گھروں میں رہنے والا یہ مجاہد چیزے دگر ہے جس جیسا آنکھوں کے سامنے آنا دشوار، بہت دشوار!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
اقبالؔ

نور باغ کے ان کے گھر اور علی محمد نائیکو کے مکان کے درمیان نہر کی پٹری کے شمال کی طرف ایک باغ ہے سیب کا۔ اس کے کنارے پر صاحب بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی مہینے گذارتے تھے۔ اگر زیادہ وقت کیلئے ٹھہرے تو کیمپ کھڑا ہوا اور وہ بھی شاید خالق صاحب کے ہاتھوں۔ بس سائلوں کا تانتا بندھا رہتا۔ طوفان بھی آتے تو صاحب وہاں ہی
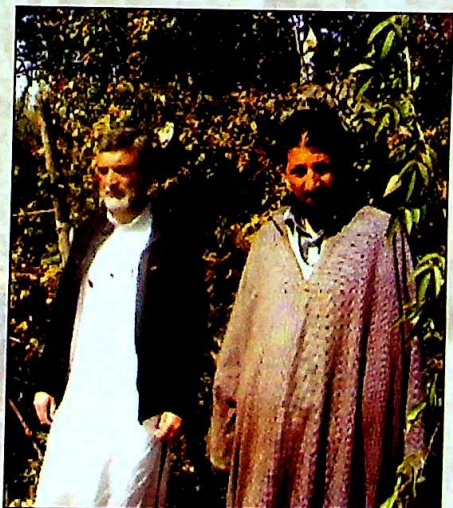
بلاخوف و ہراس، برسات کی بارشوں اور برق ورعد کے ساتھ تیز ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے، نہ شکوہ نہ شکایت، نہ ہلنا، نہ تبدیلیٔ مکان، نہ کچھ۔ سردی ہو یا گرمی، چلچلاتی دھوپ ہو یا بادلوں کا سائباں، صاحب بیٹھے رہتے، کبھی کبھی چہل قدمی کرتے، پھر واپس آتے، کبھی موٹر میں گھومنے جاتے، کبھی سوتے، کبھی بس لیٹے رہتے مگر ہر وقت لوگ اور لوگ اور ان کے معاملات، ان کے مخمصے۔ چائے کے سماوار وہاں ہی پہنچتے، کھانا بھی وہاں ہی پہنچتا، کبھی خالق صاحب کے گھر سے کبھی علی محمد کے گھر سے، کبھی کسی اور جگہ سے۔ جہاں بھی بیٹھے لنگر شروع۔ نہ تیاری، نہ یہ معلوم کہ کتنے کھانے کی ضرورت مگر جتنی ضرورت اتنا کھانا خود حاضر۔ حیران ہوجاتا تھا انسان کہ یہ کون جن وملائک کام پر لگے ہوئے ہیں جو ایسا حسب ضرورت انتظام کرتے ہیں۔ سائلوں کے بغیر زندگی کا کوئی دم نہ گذارنا، رات کے وقت بھی کوئی نہ کوئی موجود، ایک، دو، تین، دس، پندرہ! آرام نہیں، صرف غور وفکر، کبھی جمال اور موسیقی کا سرود! میں جب جب حاضر ہوجاتا اکثر دیکھتا کہ صاحب مشغول ہیں اور چپ چاپ اپنے کام میں مگن۔ مگر جانتے ہیں اور اچھی طرح کہ کون آیا اور کون گیا، کس لئے آیا اور کیوں ٹھہرا۔ زندگی کا کیا تماشہ دیکھے ان کے ساتھ رہ کر۔ یہ حکومت کیسے چلتی تھی ایک فرد کے ذریعے، معلوم نہیں، ایسا لگتا ہے کہ پراسرار خلوق لگی ہوتی تھی کام پر حکومت چلانے کیلئے اور حکمران کو سب کچھ معلوم!

سوپور میں کئی جگہیں ہیں جہاں صاحب گھر چھوڑ کر چلے جاتے اور بیٹھتے یا لیٹ جاتے یا سو جاتے۔ مثلاً عشہ پیر میں غنی پرنٹنگ پریس کے نیچے اپنے دوسرے مکان کے بڑے دروازے کے سیدھ میں۔ ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ صاحب گھر سے نکلے، کبھی رات کے وقت، کسی پتھر کو سرہانہ بنایا، یا پرنٹنگ پریس کے نیچے لیٹ گئے یا سڑک پر سیدھے۔ کسی نے بستر چادر اوپر ڈال دی اور وہ سو گئے۔ یہ نہ دیکھا کہ ریت پر سو گئے، کنکروں پر سو گئے یا کانٹوں پر۔ یہ بھی پروانہ نہیں کہ مچھر کاٹیں گے یا مکھیاں تنگ کریں گی یا رات کے وقت کتے دائیں بائیں بھونکنا شروع کرینگے اور سونے نہ دینگے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ صبح سویرے اٹھتے اور ننگے پاؤں سوپور کی گلیوں میں گھومنے نکلتے، گندی نالیوں میں پیر ڈالتے۔ کبھی کبھی ان نالیوں میں پتھر کے ٹکڑے ہوتے، کیل کانٹے ہوتے یا کوئی چیز جن سے زخمی

پائے مبارک اور زخمی ہوجاتے اور خون بہنا شروع ہوتا۔ کس کی مجال کہ وہ پیر دھوتا، مرہم پٹی کرتا یا دوائی لگاتا۔ کبھی کبھی پیر کیچڑ سے لت پت ہوتے تھے اور صاحب بس اسی طرح چلتے۔ کبھی دریا پر جاکر پیر پانی میں ڈالتے اسلئے نہیں کہ دھونا ہے ان کو بلکہ اسلئے کہ گھاٹ پر پانی کے اندر بیٹھنا ہے۔ کبھی کبھی دریا میں اتنا پانی ہوتا کہ دیکھ کر خوف طاری ہوتا تھا، ان کو نہیں سائلوں کو جوان کے پیچھے پیچھے ہروقت چلتے تھے۔ بارہا گوبر کے ڈھیروں پر سے گزرتے۔ گوبر میں ٹیٹنس کے کیڑے ہوتے ہیں، صاحب کو نہ اس کی پروا اور نہ اس کا کوئی خطرہ۔ یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک مگر صاحب کسی جگہ بیٹھ گئے۔ کچھ وقت کے بعد ان کے نازنین پاؤں بالکل صاف۔ لوگ پیروں کو دباتے ہیں اور وہ اپنی دنیا میں محو و مشغول۔

کنکروں پر لیٹ جانا کہدے گلزارِ خلیل
کوئی نمرودی عداوت ہے کہ صہبائے جلیل
پتھروں کے سینے بھی گاتے ہیں پاتال بھیرویں؟
سختیوں سے نرمیاں ہوتی ہیں پیدا بالیقیں؟
دوستی کے راستے میں سختیاں، آزار کیا
جنت الفردوس کی گل گشت ہے یہ باخدا
مرگ زاری سوسنوں کی کھل گئی میٹھی زبان
بھرنے لگے وہ بھی خوشبو سے زمین و آسماں
مرگ زاروں کا نظارہ دیکھتی ہے خود شفا
موت کے پردے میں ہنستا ہے گلستانِ وفا

(حبیبؔ)

غنی پرنٹنگ پریس کے ساتھ ہی ان کے مکان کے دو طرف دو مقبرے ہیں۔ ان پر بھی صاحب بیٹھتے۔ ان کے شائقین وہاں ہی جمع ہوجاتے۔ اکثر بار وہاں ہی چائے بھرے سماوار لائے جاتے اور روٹیاں۔ اور اس طرح پینے پلانے کا کام شروع ہوجاتا۔ یہاں مردوں کو زندہ کیا جاتا تھا مگر ان مردوں کو جو جسموں کی قبروں میں ہوتے ہیں اس لئے زندہ مردہ کہلاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے مردے وہاں ہی حاضر ہوں۔ مکان کی دوری موت و حیات کے اس عمل میں کوئی خلل پیدا نہ کرپاتی۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صاحب مردوں کیلئے زیرِ لبی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کے نتیجے کیا نکلتے تھے ہمیں معلوم نہیں۔ جسموں کے اندر مردوں کو زندہ کرنے کی طاقت فقیروں اور رندوں کی خصوصی طاقت ہوتی ہے۔ صاحب کا کیا کہنا۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، میں بھی ایک پڑی ہوئی لاش تھا جسے

تس کمیوک آرام اُسی یمی چیومت عشقُن شراب
پانہٕ نشہِ یُس بے خبر گوٚتس وَنان خانہٕ خراب

شاہ قلندر

ان کی عنایت بھری نظروں نے زندہ کردیا۔ عشہ پیرپل کے اس پار کی ایک قبر اس کی گواہ ہے۔ اس کتاب میں کوئی شک نہیں، پڑھئے تو!

ایک واقعہ: مقبول صاحب میرے ایک شاگرد تھے بارہمولہ کالج کے دنوں میں۔ وہ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہے تھے اور شاید ان دنوں ای ٹی او تھے۔ ایک دن مقبول صاحب اور میں اکٹھے صاحب کے پاس چلے گئے جو اس وقت مغربی قبرستان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سائلوں کا انبوہ تھا۔ کچھ کھڑے تھے کچھ [illegible]۔ مقبول صاحب بھی بیٹھ گئے صاحب کے پائے نازنین کے قریب۔ دیکھا کہ ان کے پائے مبارک میں بڑے بڑے کیڑے زخموں کی داد دے [illegible] ہیں اور کنڈل بنا کے آرام کررہے ہیں جیسے [illegible] میں۔ مقبول سے نہ رہا گیا۔ اس نے لکڑی [illegible] اٹھایا، نازک قلم جیسا، اور لگا کیڑوں کو نکال باہر کرنے۔ ابھی شروع ہی کیا تھا [illegible] مقبول پر دھاڑنے لگا۔ بھاگم بھاگ میں نہ جانے میں کہاں پہنچا اور مقبول کہاں۔ [illegible] میں نے کیڑوں کو چھیڑا نہ تھا، ضرور حماقت کی تھی، مگر مجھ کو بھی مقبول کی طرح بھاگنا پڑا۔

کون اپنے جسم پر پالے گا کیڑے میرے دوست
اس طرح کون جان پر کھیلے گا اپنے میرے دوست
مشکلوں سے اس کا دل گھبرائے کیسے ساتھیا
پی چکے ہیں کڑوا کڑوا زہر سا جام فنا
اللہ پڑھ پڑھ ان کی رگ رگ میں پھُدکتا ہے لہو
رقص کرتے ہیں یہ سُن کے دونوں جہاں باوضو
مرد ایسے سیر کرتے ہیں فلک پر صبح و شام
ان کے چلنے سے زمین پر کھلتے ہیں دارالسلام
دردِ شفا ہے وفا کا حوصلہ جان بہار
چبھ گئے ہیں تیر دل میں اب جگر اُن پر نثار

حبیب

بجلی کے کھمبوں یا درختوں کے ساتھ ناک یا ماتھا رگڑ رگڑ کر خون بہانا پراسرار مشقیں ہوں یا نظروں کے الماس تیر دور تک پھینکنے کا شوق، تیز نوک دار کیکڑ کی کانٹے دار شاخوں پر ننگے بدن لیٹنے کی جبروتی مشقیں ہوں یا بلا ضرر، بلا زخم اٹھ کھڑا ہونے کی کامرانیاں، جاڑوں کی یخ بستگی میں اپنے زخم ہائے پا سے نو بہاریں پیدا کرنے کی دور اندیشیاں ہوں یا منفی
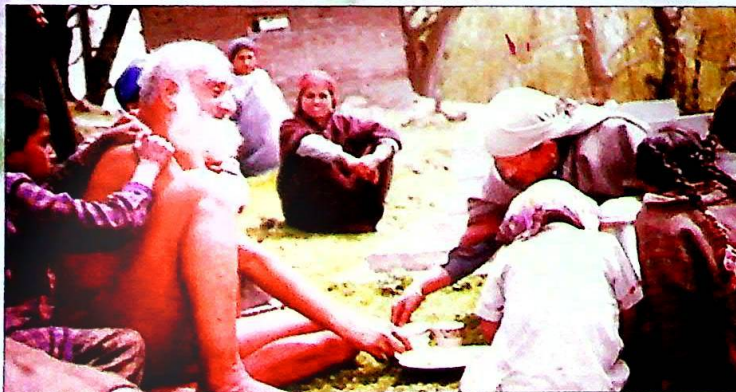
حرارتوں میں عوام الناس کا خون گرم رکھنے کا تخلیقی مشغلہ، ہمہ جا، ہمہ وقت صاحب فنا کے ساتھ ساتھ بقا کا ظہور دکھاتے تھے۔ ''بابابا، میانہ بابا'' (ہماری فریاد سننے والے بزرگ ضامن) کی دل پگلانی والی فریادوں کو سن کر خودشناس ملنگ، ان تھک، رات دن، دل نواز اور مشفقانہ جواب دیتے تھے۔ ٹولی بل آستانے پر جاتے اور لوگوں کی ٹولیاں ساتھ، سوپور ڈگری کالج کے پاس مرگ زار میں بیٹھ کر مدرسۂ عرفان قائم کر کے جامِ معرفت پلاتے پلاتے حیات ابدی کا انتظام کرتے تو حوصلے اور ہمت باقاعدہ۔ جانباز ولیؒ کی زیارت پر جاتے تو قدم قدم پر جانبازی کے بیج بوتے، کریری کے باغوں کی گل شگفتگیاں اور نائیکو ضیافت کی بزم آرائیاں دیکھنے جاتے تو قلندرانہ مستیاں ساتھ ساتھ۔ بستی سے ذرا دور شنکر گنڈ کی کھلی فضاؤں میں مستیاں پیدا کرتے تو ریش کاک کے تانگے کی سست رفتاریاں ساتھ ساتھ! ایک بات چمکتے ہوئے سورج کی طرح صاف دکھائی دیتی تھی کہ صاحب لوگوں کے ہیں اور لوگ صاحب کے۔ محبت کا بازار گرم ہی نہیں بہوت گرم رکھتے مگر اس کے بیچوں بیچ جانانہ خوش خرامیوں سے برباد دلوں اور مرجھائے ہوئے چہروں کی نو آبادکاری کے سامان پیدا کرتے۔

گرم دل گرم سینے میں لئے خدا کے راستے میں محض خدا کا کام کرتے اور رندانہ مجاہدانہ زندگی کا جھنڈا گام گام گاڑتے۔ ان کا نام رشک ایام اور ان کا مقام بلند سے بلند تر مگر نہ خواہشِ زر نہ آرزوئے آرام، نہ تقاضائے انعام واکرام! اپنی ساری زندگی کائنات کی طرح وسیع سے وسیع تر نئے سانچوں میں ڈھالنے والے ہمارے صاحب ہمارے دلوں کے شاہنشاہ ہیں! ہم ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا عقیدت اور احترام سے اکرام کرتے ہیں اور ان کی سرخرو کامرانیوں پر خراجِ عشق و محبت پیش کرتے ہیں!

شخصیت

شخصیت کیسے سمائے گی نگہ میں میرے دوست

[illegible] نور نورانی حقیقت ہمہ اوست

[illegible] آنکھوں میں جھلکتا ہے جلالِ ذات یار

چومتا ہے [illegible] رنگیلا دل نگاہیں بار بار

[illegible] ہے گلستان و بوستان

قدسیاں بھی اللہ اللہ ساتھ ساتھ رحمٰن خوان

[illegible] کھل نہیں پاتے ہیں پردے بے پناہ

زیب وزینت اللہ ھو کی چھپ کے ہیں شاہوں کے شاہ

گنتے گنتے اور گننے کی تمنا ہے شفاؔ

نجد کی ویرانیوں میں پڑھتا ہے مجنون ثنا

حبیبؔ

ہمارے صاحب بہت ہی عظیم شخص اسلئے ان کی شخصیت بھی عظیم ۔ یوں تو ہرایک شے، ہرایک جاندار، ہرایک انسان کی شخصیت ہوتی ہے مگر کجا کانٹے دار جھاڑی کی شخصیت، کہاں گلاب گلبن کی شخصیت، کہاں بے ثمر درخت اور کہاں سیب وانگور وآم وکھجور وخوبانی! زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے کجا، کجا آسمان کی بلندیوں پر
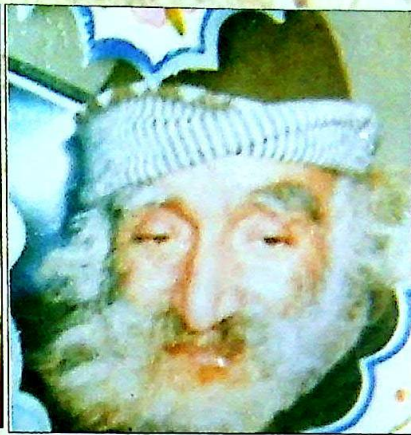
پرواز کرنے والے رنگین طائران خوش بخت وخوش نوا۔مگر چیل کہاں، گدھ کہاں اور شاہین وعقاب کہاں کہ پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور اس طرح سے لہو کی ... گرم رکھتے رکھتے میدان سر کرنا۔ کہاں گیدڑ اور اس کی ڈرپوک شخصیت اور ... سرکس کا شیر اور اس کی سدھائی ہوئی سلطانی، کہاں جنگل اور جنگل کا بادشاہ اور اس کی دھاڑتی ہوئی حکمرانی! مگر بوند بوند سے سمندر بنتے ہیں اور ایک ایک شے جمع ہوجائے تو کائنات بن جائے۔ ایک ایک شے کا جمع ہونا ہی انسانِ کامل کی دلیل اور ہمارے صاحب کی شخصیت کامل۔ کِھلی ہوئی، کُھلی ہوئی، بالیدہ اور ہر لحاظ سے درخشاں، مکمل۔ پیروں کے اس پیر، میروں کے اس میر نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا اور ہم اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ ورنہ دوکوڑی کا انسان بہت بڑے شخص، بہت بڑی شخصیت کو جانچے تو نتیجہ کس نوع، کس قسم کا ہوگا۔ وہ تو معلوم ہی ہے۔ تاہم جانِ جاناں کے بارے میں یہ بیان شخصی، داخلی یا موضوعی (subjective) ہے، کسی بھی طرح معروضی (objective) نہیں، قطعی (absolute) نہیں!

بڑے لوگوں کی شخصیت بڑے دریا جیسی ہوتی ہے جو بہتا رہتا ہے، گہرا ہوتا ہے، پانی ہی پانی سے بھرا رہتا ہے اور ہمیشہ! ہمارے صاحب کی شخصیت بھی بہت بڑے دریا کے مانند ہے، پانی سے بھرے ہوئے، گہرے اور خوبصورت چوڑے دریا کے مانند۔ یہ دریا بھی اونچائیوں سے بہتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے، اس کا زور بھی بڑھتا ہے اور اس کا شور بھی یعنی اس کا سوز و ساز اور فرحت افزا سرود۔ وہ کبھی سرکتا، لچکتا، بل

کھاتا ہوا بہتا ہے اور کبھی سیدھا مقابلتاً آرام سے جیسے کوئی مستیوں میں ڈوبا ہوا آرام کررہا ہو۔ کبھی کناروں سے چھیڑتا ہے اور کبھی کناروں پر اُگے ہوئے خود رو [illegible] ساتھ اس طرح کھیلتا ہوا، چھیڑتا ہوا کہ کسی ڈابو میں رکا ہوا پانی لمبی سانس بھرے کہ آہ میں بھی دریا [illegible] میں بھی پھولوں کے اس کھیل تماشے میں شامل ہوتا کبھی! کبھی بارشوں کا پانی، برف کا پانی اپنے سا[illegible] کیا کیا لاتا ہے اور دریا کے ساتھ بغل گیر ہوجاتا ہے مگر اکثر آب جوئیں، جھرنے، چشمے، ندیاں، نالے اور چھوٹے چھوٹے دریا ملتے رہتے ہیں اس بڑے دریا کے ساتھ۔ کبھی کبھی اس میں طغیانیاں آتی ہیں۔ تب [illegible] بہت ڈراؤنا رخ اختیار کرتی ہیں اور دریا کے چاہنے والوں پر بھی ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ اس دریا سے نہ جانے کتنے لوگ فیض حاصل کرتے ہیں۔ صرف لوگ ہی نہیں، جمادات، نبادات، حیوانات بھی فیضان میں شامل۔ کھیت اسی سے پانی حاصل کرتے ہیں، اُن میں فصلوں کی بہاریں بھی کِھلتی رہتی ہیں اور عالم انسانیت کی غذا مہیا کرتی رہتی ہیں۔ گھاس بھی اس کے پانیوں سے اگتی ہے اور مویشیوں اور دوسرے جانوروں کیلئے روزی مہیا کرتی ہے۔ گھاس اور چیزوں کے کام بھی آتی ہے۔ اس سے ٹوکریاں، رسیاں، جھونپڑیوں کی چھتیں، چٹائیاں، ٹٹیاں بنتی ہیں۔ اس کی مدد سے ڈبوں یا بکسوں میں پیکنگ کی جاتی ہے۔ نئے زمانے میں گاس مشینوں میں استعمال ہوتی ہے اور اس سے چیزیں کھٹاکھٹ تیار ہوجاتی ہیں۔ بے چارے غریب اور پسماندہ لوگ اس سے پہناوے بھی بناتے ہیں اور بستر بھی۔ درخت بھی پانی ہی کی مدد سے زمین کے سینے سے غذائیں حاصل کرتے ہیں اور میوے تو پانی کے بغیر رنگ بھی چڑھا نہیں سکتے اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچ نہیں سکتے۔ کچھ عاشق لوگ میوؤں کے رنگ پر ریچھ جاتے ہیں خاص کر جب ڈالی ڈالی میوؤں سے لدی ہوتی ہے اور باغوں کے باغ رنگ و بو کا اپنا عالم سجاتے ہیں۔ درختوں کی لکڑی جلانے کے کام آتی ہے او انسانوں کو گرم رکھتی ہے اور ان کا کھانا پکاتی ہے اور وازوان بھی جو معمولی غذا نہیں روحانی غذا ہے کیونکہ اس میں تقریباً وہ ساری

> اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں ہر مثال پھیر پھیر کے بیان کی ہے پھر بھی اکثر لوگ ناشکرے ہوئے بغیر نہیں رہتے:
>
> القرآن:17:89

چیزیں شامل ہیں جنہیں اگر سمجھا جائے تو روحانیت کے بہت مسائل سمجھ میں آسکتے ہیں۔ مگر درخت مکان بھی بناتے ہیں جن میں وہ بیگمات بھی بیٹھتی ہیں جن کو مہجور جیسے شاعر گریس کور جیسی نظموں میں چھیڑتے ہیں یا شیلے جیسے انگریزی شاعر سکے لارک میں۔ پانیوں سے وہ پودے اور درخت بھی پیدا ہوتے ہیں جو مشینوں میں خام مواد بن کر جاتے ہیں اور وہاں سے نئی شکلیں بنا کر نکلتے ہیں۔ اسی طرح پانیوں سے پھل پھول بھی پیدا ہوتے ہیں جو انسان کا خون دوسرے طریقے سے گرم کرتے ہیں اور ان کے چہروں کی لالیاں بن کر باہر نکل آتے ہیں۔ ساز بجانا، گانا، رقص و نغمہ کی محفلیں سجانا بھی ان گرمیوں کی بالواسطہ کرامات ہیں۔ دریا میں کشتیاں اور جہاز بھی چلتے ہیں اور نہ جانے کتنے لوگوں کا بیڑا پار لگاتے ہیں۔ بہت لوگ کشتیاں چلا چلا کے نہ جانے کس کس قسم کے گانے گاتے ہیں اور کن کن دھنوں پر۔ سنئے اور سمجھئے پھر معلوم ہوگا کہ شخصیت کا دریائے احد کیا کیا رنگ لاتا ہے۔ مگر آجکل کے زمانے میں بادبانی کشتیاں اور بادبانی جہاز نہیں چلتے، مشینی جہاز چلتے ہیں اور کچھ کشتیاں انسان کے ذہن کی کرامتوں کو مزید مزید توانائیاں بخشتی ہیں۔ بڑے ملکوں نے آبدوز کشتیوں اور بحری جہازوں سے نہ جانے فتح عالم کے کیا کیا منصوبے بنائے ہیں۔ اگر ہمارے عارف ان باتوں پر غور و فکر سے کام لیں اور ان بتوں کو توڑیں تو عرفان کے دقیق مسائل سمجھ میں آئیں گے مگر وما توفیقی الا باللہ۔

دریائے شخصیت کی ایک کہانی حیرت سے بھری ہوئی مگر دلچسپ۔ پانی کی دنیا کا اگر اتا پتا معلوم ہو جائے تو انسان کے شعور میں انقلاب آجائیگا اور اقبال جیسے اسلامی مفکرّ تو انقلابِ شعور کو معراج کہتے ہیں۔ خیر پانیوں میں مچھلیاں ہیں، ہزاروں قسم کی مچھلیاں۔ ان کی شکلیں، ان کے ازدواجی مسائل، ان کی جنگ اور ان کی محبت کی داستانیں ابھی پوری کی پوری معلوم نہیں ہوسکی ہیں۔ تصویریں کھینچنے کے آلات، ٹیلی ویژن اور سی ڈی رات دن کام کرتے ہیں، پھر بھی دریا کی وسعتیں اور اور تحقیق طلب ہوں گی۔ مگر مچھلیاں ہی کہاں، وہاں دریا کے اندر اور بھی ہزاروں عجائبات، موتیوں کے ہی نہیں، صدفوں ہی کے نہیں، عنبر اور دیگر خوشبوؤں کے ہی نہیں، لولو اور مرجان کے ہی نہیں، سانپوں کے بھی، دریائی شیروں کے بھی، مگرمچھوں کے بھی، پودوں اور پھولوں کے بھی، چٹانوں کے بھی، چٹانوں کے اندر خزانوں کے بھی، تیل کے بھی۔ تیل کی بات چھڑ گئی تو ایک اور کھڑکی کھل گئی۔

تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو ایک زمانے میں زبان زد عام تھا۔ اب اس کے علاوہ تیل دیکھو، یار دیکھو، بہار دیکھو بھی اچھا اظہارِ اندرون ہے یا زورِ بیانِ حقیقت۔ اس میں تو تیل کی کھلی اور اَن کھلی حقیقتیں ہیں۔ ان ضرب الامثال کو کھولئے تو بہت لوگ مضروب بھی ہونگے اور مشہور بھی، ساتھ ساتھ روح کی گہرائیاں بھی سامنے آئیں گی۔ آپ نہ مانیں تو ہم کیا کریں تاہم ہم نے تو حضرت یونس علیہ السلام کا دریائی تجربہ بیان ہی نہ کیا اور نہ ہم نے مچھلی کے پیٹ میں جانے کی بات کی۔ یہ معاملے زیادہ گہرے ہیں اور کبھی کبھی انسان کو ہنساتے ہیں، کبھی [illegible] ہے کہ خدا صاحب بھی ظریف ہیں، نعوذ باللہ!

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اشارہ ضروری! ہم دریا اور پانی اور دوسری چیزیں اکٹھا کرتے ہیں۔ یہ محض اشارے ہیں۔ زبان بھی دراصل لفظوں، آوازوں، لب ولہجہ، مثالوں، اشاروں، تشبیہوں، استعاروں، [illegible] سے بنتی ہے۔ مگر یہ زبان کی باہری شکل ہوتی ہے جو ہمیں حقیقت سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ اصلی [illegible] اندرونی زبان ہے۔ جس میں معانی بھی ہوتے ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ بہت گرم ہوتی ہے۔ اسے وہی لوگ [illegible] کہتے ہیں جو عشق کی آگ میں جلے ہوئے ہوں۔ مذہبی کتابوں میں، شاعروں کے کلام میں، حکایات، داستانوں اور تمثیلوں میں یہی مثالی زبان، اشاروں کی زبان استعمال ہوتی ہے تاکہ غور وفکر سے لوگ آہستہ آہستہ زبان کے اندر گھس جائیں۔ افسوس کہ سیدھے سادھے کچھ کم عقل سمجھتے ہیں کہ بیرونی زبان ہی اصلی زبان ہے۔ وہ زبان کے بت توڑتے نہیں، لا الٰہ الا اللہ دریافت کرنے کیلئے۔ اسلام بُت شکن مذہب ہے یعنی بت توڑنے کا مذہب۔ مسلمانوں اور مومنوں کو صرف پتھر کے بت نہیں توڑنے ہیں بلکہ لفظوں کے بت بھی توڑنے ہیں، مثالوں کے بھی بت توڑنے ہیں، ورنہ خسارہ ہی خسارہ۔ پانی بھی بُت ہے۔ اسے توڑو اور معرفت سمجھو۔ دریا بھی بت ہے، اسے توڑو تو شخصیت سمجھو یا معرفت

> مچھیوں کے پیٹ میں ہوتا ہے کیا کیا دوستو
> [illegible] ہے نکتہ ایسا کھلم کھلا دوستو
> خون سے رنگین ہوتی ہے مسلسل عاشقی
> داستان کھلنے کی لکھے رنگ رنگیلی بے کلی
> مارتا ہے ڈبکیاں لحماً طریاً بار بار
> کرتے ہیں سجدے پلنگ بھی دیکھتے ہیں جب کچھار
> مچھلیوں کا پیٹ گہوارہ پیمبر کا عجب
> دیکھ دیکھو پیتا ہے کھاتا ہے کیا عالی نسب
> معرفت کا قاعدہ مجھ کو پڑھاتی ہے شفا
> قالو بلیٰ کہتے کہتے تھک نہ جانا باوفا
> حبیب

کی روانی۔ بندر کو توڑ دو تو نقال سامنے آئیگا یا خوبصورت آزاد جانور۔ بارش توڑ دو تو رحمت کا نزول۔ فاکھۃ و نخل و رمان سے مراد ظاہری طور میوہ، کھجور اور انار مگر باطنی طور ایسی ایسی چیزیں کہ پھر نعوذ باللہ خدا صاحب ظریف نظر آئینگے مگر آپ ضرور کہیں گے کہ اے خدا شکر وثنا آپ کا، میں کس کس نعمت کیلئے آپ کی ثنا خوانی کروں، کیا کیا کرتے ہیں آپ ہمارے لئے، ہم انسانوں کیلئے اور ہاں ہمیں مثالوں کے دریا کو آگ کا دریا سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم اس دریا کو پاٹنے میں کامیاب ہوگئے اور انشاء اللہ ہونگے، ضرور ہونگے تو ہم اللہ ہی اللہ، اللہ ہی اللہ رقص رقصاں اسی طرح پڑھیں گے جس طرح مولانا جلال الدین رومی ذکر کرتے تھے قونیہ کے بازاروں میں۔ رہا سوال اپنے صاحب کا وہ آگ کا سمندر بھی پاٹ چکے ہیں، ہر طرف ہر آں ہر گھڑی اللہ ہی اللہ دیکھ چکے ہیں، پھر بھی خاموش ہیں اور سنجیدہ۔ ان کا دل مبارک رقصاں بھی، جہانِ رنگ و بو کو بھی رقص میں لائے، جن و ملائک کو بھی عش عش کرائے مگر دیکھے گا کون، کس کو ہوگا معلوم؟ ان کے نازنین دل میں ہزاروں منصور [illegible] رہے ہوں، انا الحق انا الحق کہہ بھی رہے ہوں مگر وہ ہیں کہ ہونگے بے زبان، نہ ٹس نہ مس!

پھر صاحب کی شخصیت کی طرف متوجہ ہوجائیں! اس نے کبھی اتار دیکھے کبھی چڑھاؤ، کبھی گرما گرم مجلس آرائی اور کبھی سلجھاؤ کیلئے الجھاؤ۔ کبھی نوائے شوق سے حریم ذات میں شور و غوغا پیدا کر گئے اور کبھی دنیائے صفات میں کتنے کتنے سومنات توڑ ڈالے کہ ذات الٰہی نظر آئے۔ کبھی اتنے جواں کہ عقابی روح سے آسمانوں میں اپنی منزلیں تلاشنے لگے اور کبھی اتنے کہن سال کہ ذہن کی گتھیاں سلجھانے کیلئے نہ جانے کتنے زیرک اور بظاہر چالاک لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے اور ذہنی و قلبی نفاستوں کی جھلک پا کر اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ کبھی جگہ جگہ اپنے آشیانے بنائے اور کبھی عقاب کی طرح آشیاں بندی سے گریز کی کہ حقیر نظر آئی۔ کبھی پلٹ جھپٹ اور جھپٹ پلٹ سے لہو گرم رکھنے کے بہانے ڈھونڈ ڈھانڈ نکالے اور کبھی عقابی روح کی حرارتوں سے اپنی منزلیں لامکانوں میں ڈھونڈنے لگے۔ کبھی آہ و فغاں ہی مقامات کی صورت اختیار کر گئے اور کبھی قلندروں کے راستے پر نہ مقام دیکھے اور نہ آرزوئے منزل۔ کبھی وجود کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں کھا کھا کر کچھ نظر نہ آیا وحدت کے بغیر اور کبھی فثم وجہ اللہ سے آگے اپنے آپ پر فریفتہ ہوگئے کیونکہ شیش محل میں صرف اپنی صورت نظر آئی۔ مکان گرانا، نئے مکان بنانا، نقش مٹانا، نئے نئے زیادہ دل کش، زیادہ خوبصورت نقش بنانا خدا کی کارفرمائی اور کاریگری میں نظر آیا تو خود بھی یہی اوصاف الٰہی اپنے اندر پیدا کرنے میں لگے رہے اور نئی نئی دنیا کے نئے نئے جنم مشاہدہ کرنے میں مشغول ہوگئے۔ بچپن اور جوانیوں کی سریلی راگنیاں سنتے سنتے دادِ عشرت دیتے رہے اور ضعیف العمری یا بڑھاپے میں ایسی جوانیاں محسوس کیں کہ سو سو نوعمریاں ان پر قربان ہوگئیں۔ عالم نسواں کی

نامرادزندگیوں اور ناتوانیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دل برداشتہ بھی ہوئے مگر فصوص الحکم اور ترجمان الاشواق کے ابن عربی کے مشاہدات کی تحسین کرتے ہوئے ان نامرادیوں، ناکامیوں اور ناتوانیوں کا روحانی علاج کرنے پر متوجہ ہوئے اس طرح کہ پیغمبروں کی یاد تازہ ہوگئی۔ تیشہ فرہاد ہاتھ میں اٹھایا تو مشکل پسندی اختیار کی۔ ساحل دریا پر آرام و آسائش ڈھونڈھنے والوں کو دیکھا تو نظر ہٹا کر چلے گئے اور طوفانی موجوں میں کود پڑے۔ان کی راہیں شخصیت کی دشوار منزلیں متعین کرتی ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے تو سہی کہ زخموں کا کیا عالم تھا اور وہ گام گام پر جھنڈے گاڑتے گئے کامرانیوں اور کامیابیوں کے۔ ان راہوں سے کوئی پوچھے کہ چلتے چلتے کبھی خوردونوش کا نام لیا؟ کبھی پیاس بجھانے کا خیال تک آیا؟ کبھی ناہموار موسم میں، ناہموار ماحول میں، ناہموار راستوں پر دل کا بوجھ اتارنے کیلئے آہ تک بھری؟ کبھی تنہائیاں محسوس کیں یا کبھی مجلس آرائیوں کا شوق ایسے لمحات میں پیدا ہوا؟ کبھی دھوپ کی شدّت محسوس کی اور سائے ڈھونڈے؟ ان راستوں کو سب کچھ بھول گیا ہوگا ان قدموں کی لذّتوں کی مدہوشی سے جو اپنی خوشبوؤں سے عالم قُدس کو بھی

[illegible]ہوں پہ سن لے سوز و سرودِ خرام
[illegible] ہیں نغمۂ داؤد دیکھو گام گام
ریت کے ذرّوں کے سینے نرم کیسے ہوگئے
کن [illegible] یوں خواب غفلت سوگئے
پڑھتے ہیں یوں ڈالی ڈالی کس کے قصیدے طیور
[illegible] گلے میں یہ کیسے ساز و سنطور و تنبور
کس نے لوٹا ہے کھلی راہوں میں مجنوں کا قرار
کس کی خاطر کھلتے ہیں یوں زخمِ پائے نامدار
بیجتے ہیں ہم شفاؔ کے ہاتھ الفت کا پیام
''السلام'' عنوان جس کا ''اے قلندر نیک نام''

حبیبؔ

اپنی طرف مائل کردیتے تھے اور وہاں سے 'مرحبا مرحبا اے الوالعزم رہ نورد مرحبا' کے تحسینی کلمات رحمتوں کی طرح برستے تھے۔ مگر ان راستوں کو یہ نہ معلوم کہ ان کے قدم ان کے سینوں پر پڑ پڑ کے بھی نہ جانے اور کہاں کہاں پڑتے تھے۔ زمینی راہوں کو زمان و مکاں کی بھول بھلیّوں کا کیا علم! ان کو کیا معلوم کہ ان پر چلتے چلتے آسمانوں،

> Three things have been made beloved to me in this world of yours: Woman, perfume and prayer.
>
> Hadith

زمینوں اور پاتال کے سفر طے ہو جاتے ہیں، سفر طے کرتے کرتے دنیا و آخرت کے معاملات سلجھائے جاتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی شعور کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں اور دشتِ جنوں میں ملائکہ مقربین کے ساتھ راز و نیاز کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں یا گاہے گاہے قدسیوں اور نبیوں کو بھی رخصت کر کے حضرت حق کی خلوت گاہ میں عاشق و معشوق کے درمیان تفاوت مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی راہوں پر تاریخ آگے آگے نہیں پیچھے پیچھے چلتی ہے اور تاریخ باز، تاریخ ساز کھیل رچائے جاتے ہیں۔ ان راہوں پر یہ بھی ہوتا ہے کہ زمین آگے چلی اور فلک پیچھے رہا اس طرح کہ سب [illegible] زمین کے قبضے میں آ گیا۔ زمین نواز اور زمیں ساز یہ شخصیت زمین کی بھی معراج [illegible] انسانیت کا طرۂ امتیاز! ہمیں اس کی کتنی قدر کرنی چاہیے۔

صاحب کی شخصیت کامیابیوں اور کامرانیوں کی بلندیوں کو چھوگئی [illegible] اس میں انقلاب آتے گئے مگر اس کی وحدت میں کبھی رخنے کا شائبہ بھی پیدا نہ ہوا [illegible] اس کی موزونیت یا اس کے اعتدال میں کبھی بگاڑ پیدا نہ ہوا۔ ان کی حرکی (dynamic) طاقتیں کام کرتی گئیں اور جمود ان کے پاس کبھی پھٹک نہ سکا۔ ان کے جذبات، احساسات بدستور صحیح ڈھنگ پر کام کرتے رہے، ان کی حسب ضرورت تصعید (sublimation) ہوتی رہی اور عقلی و قلبی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے رہے، اس ہم آہنگی کو کبھی بھی افراط و تفریط نے چھوا تک نہیں کیونکہ آہنگ رحمٰن نے اس کی ہمیشہ آبیاری کی۔ اس پر نظر رکھی۔ دو جہاں کے مالک نے اس سر بسجدہ شخصیت کا خیال رکھا اور اپنی رحمتوں سے نوازا تاکہ دنیا کی زندگی کے ساتھ ساتھ یہ بہت ہی ضروری اپنا کردار نبھا سکے، کردار جس کے سامنے تعمیر و تخلیق ہے، انسانیت کی صحیح اور پائیدار نشو و نما ہے۔ ضروری ہے کہ انسانیت میں اونچ نیچ کا فرق ہو اور ہر اعتبار سے، فرق مراتب بھی ہو اور یہ انسانیت کی رنگا رنگی اور خوب صورتی کی نشانی ہے۔ مگر نسل، قوم، تہذیب و تمدن، زبان و بیان، معاشی و سماجی تفاوت کے تخریبی اور منفی اثرات سے آپ کی شخصیت مبرّا رہی اور پاک۔ آپ کی شخصیت

> لی مع اللہ ہر کہ را در دل نشست
> آں جواں مردے طلسم من شکست
> گر تو خواہی من نباشم در میاں
> لی مع اللہ باز خواں از عین جان
>
> اقبالؔ

نے انسان کی زندگی کو پارہ پارہ ہونے سے بچانے کی ان تھک کوششیں کیں۔ ان کے اپنے وجود کے سارے نظام، عصبی، تولیدی، جسمانی، نفسیاتی و عقلی مجموعی وحدت اور توازن کو برقرار رکھتے ہوئے کام کرتے رہے اور ماحولیاتی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ مگر ماحول کے ساتھ ان کے رشتے حرکی رہے اور تعمیری و تخلیقی۔ وہ کبھی ماحول کی غیر منظّم روشوں کی زد میں نہ آ گئے۔ سیلاب نے ان کو کبھی اپنے ساتھ بہایا نہیں کیونکہ ان کے دست و بازو میں سیلاب پر قابو پانے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ غرور کی آگ سے گذرے ضرور مگر براہیمی روایات نے انہیں ہر [illegible] سے بچایا، ہر لحاظ سے نقصان سے محفوظ رکھا اور وہ سرخ رو اپنا تخلیقی کام نبھاتے رہے۔ انہوں نے ویراں جگہوں میں گلستان و باغ و بہار پیدا کیے۔ وحشیوں کو رام کیا، پتھروں سے شیشے بنائے اور زہر سے نوشینہ۔ انہوں نے دریاؤں کے رخ بدل ڈالے اور ان سے برقی توانائیاں پیدا کیں مگر یہ دریا شخصیت کے دریا تھے اور [illegible] دنیا کی روشن طاقتیں تھیں۔ وہ جنگل جنگل گئے اور وہاں کی چھپی ہوئی دولتوں کو سر عام لا کر [illegible] حالی کے نئے نغمے گائے۔ مگر جہاں کہیں ضرورت محسوس کی وہاں زمانہ سازی کے بجائے زمانے کے [illegible] کی۔ انہوں نے نہ قدرت (nature) کی طاقتوں کے سامنے ڈنڈوت کی، نہ معاشی و سیاسی مصلحتوں کی تابعداری۔ اس کے برعکس انہوں نے قدرت میں پھیلی ہوئی الٰہی آیتیں پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھ[illegible] آفاق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے والی اس شخصیت نے نام پیدا کیے۔ ان کا دل مبارک قدرت کی طاقتوں سے منور ہو چکا تھا، پاک سے پاک تر ہو چکا تھا، کُل کے ساتھ جڑ گیا تھا اور عقل کُل سے بنی، اس لئے ان کا روحانی یا نفسیاتی نظام تمام نظاموں پر چھا گیا۔ نہ ان میں کسی قسم کے نقص کا احتمال رہا اور نہ کسی قسم کی کمی۔ پس کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ کوئی کھچاؤ، کوئی اٹکاؤ، کوئی دباؤ یا کوئی غیر صحت مندر جحان ان پر اثر انداز ہو سکے اور ان کی موزونیت کو نقصان پہنچا سکے۔ روح کی بالیدگی نے عالم بالا اور عالمین کے ساتھ ایسا تعلق پیدا کیا کہ ساری قوتیں یک جا ہو گئیں اور یک جٹ ہو کر کام کرتی
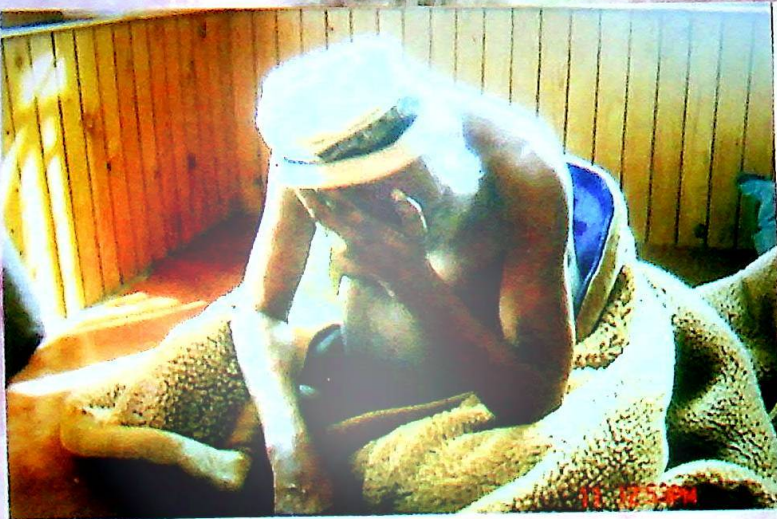
رہیں ان کے وجود کے ساتھ جسے اگر زبان کا جامہ پہنایا جائے تو حقّی وجود کہلائے۔ اس طرح ان کا جسم روح بن گیا اور ان کی روح جسم۔ انہوں نے خاندانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے میناروں ائمہ عالی مقام کے قول کو اپنے قول وعمل سے سمجھایا کہ اجادُنا ارواحنا و ارواحُنا اجادُنا۔

صاحب کی شخصیت کے اور نرالے رنگ! اس کی عظمت اس میں بھی کہ اوپر سے نیچے تک سب کچھ اپنے اندر سما چکی ہے۔ اس میں آکاش گنگائیں ہیں اور اندر راجا کی محفلیں بھی۔ اس میں زمانہ بھی غلطان و پیچان ہے اور اس کی گردشوں کے ساتھ ساتھ اس کے ماہ وایّام بھی۔ موسموں کا تغیر وتبدل اس کی بالیدگی ہے اور رات دن، صبح وشام کی گردشوں میں ہونے والے واقعات وحالات سے اس کی شائستگی کی خمیر بنتی ہے۔ آفرینش اور پیدائش کے رنگین نظارے اس میں محفوظ، رنگ بدلتی دنیا کے عجیب وغریب فسانے اس کے ساتھ مربوط... و بلبل، شمع پروانہ اس کا رنگ وروغن، قمری و ہزار کی داستانیں اور نغمے اس کے درپن۔ اچھلتے ہوئے پانیوں... اس کے سراغ، ہنستی ہوئی کلیوں کی گل کاریوں میں اس کا دماغ۔ اس کی پہنچ کہاں ہے اور کہاں نہیں۔ کون... ہائے حیات اس کی نظروں سے اوجھل اور نقشوں کی کون سی پُرکاریاں اس کی فکری اڑانوں سے دور۔ کوہ وبیاباں، خشک وتر، باغ وراغ، نزدیک ودور، نشیب وفراز پر اس کی نظر۔ اس کے ہنگامے ادھر تالابوں، جھیلوں، چشموں، دریاؤں اور سمندروں پر، ادھر دَل دَل بادلوں، بجلیوں، گن گرجتی آندھیوں پر کہ ان سب سے مل کر کائنات اکبر وجود میں آتا ہے، رواں، دواں اور جوان۔ کائنات اکبر ہی مذہبوں، رسموں، روایتوں، عادتوں کا دھارا ہے کہ بہتا رہتا ہے۔ اسی میں رومی، شامی، چینی، ہندی، مصری، عجمی، عربی، مشرقی، مغربی سب زندگی کے رنگ جماتے ہیں۔ کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی سانولا چھل چھبیلا، کوئی قسمت کا مارا، کوئی راج دلارا آنکھوں کا تارا اپنی اپنی بازی، اپنا اپنا کھیل کھیلتا ہے اور ہمارے صاحب کی شخصیت اپنی سالمیت اور وحدت سے منظّم زندگی کی بازی گاہ کا مشاہدہ کرتی ہے۔ محظوظ بھی ہوتی ہے اور مضبوط بھی، جبّار بھی، قہار بھی، غفار بھی اور ستّار بھی۔ جباری، قہاری، غفاری اور ستاری اس قدر ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ اسی سے کوہ وبیاباں، ریگ وریحان، زمین وآسمان مل مل کے ایسے گیت گاتے ہیں کہ شخصیت کے نت نئے رنگ کِھل کِھل کے کُھل کُھل کے سامنے آتے ہیں۔ کِھلنے کُھلنے کی بات چلی تو ایک اور رنگ شخصیت کا کھل گیا۔ کِھلنا نہ ہوتا تو کُھلنا کہاں ہوتا۔ محبت کہاں ہوتی، شوق وذوق کہاں ہوتا، قُرب کہاں ہوتا، ایثار کہاں، اتفاق، اتحاد، میل، ملاپ، تواضع، تعلق، تلطّف کہاں ہوتا۔ سب سے مل کر سب سے الگ رہنے کا ڈھنگ کیسے ہوتا اور اس ڈھنگ سے مزاج میں نرمی، گہرائی، صبر، تواضع اور کسر نفسی کے امکانات پیدا کیسے ہوتے۔ تعمیر وتخلیق کا روگ کیسے لگتا اور اس روگ کی مرہونِ منّت دو دو ہاتھوں کی

کارگزاری کیسے ہوتی۔ دنیا کا کام آگے کیسے بڑھتا اور بہتر سے بہتر زندگی کے رنگ روپ کیسے کھلتے۔ پس صاحب کی شخصیت کھلنے اور کھُلنے کا خودکار نظام ہے جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر ختم، حالانکہ اللہ، رحمٰن اور رحیم کی نہ کہیں ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ دُنیا دائرے کی طرح گول ہے اور ایک ہی نقطے پر قائم۔ نکتہ بھی کیا کہ بس دل کی دھڑکن!

صاحب کی شخصیت بڑی فیّاض ہے جب ان کے ساتھ عشق و محبت کا تعلق بندھ گیا، تو وہ اپنا دل دے بیٹھے۔ دل کیا دیا کہ آپ کے دل میں زبان و بیان کے بغیر فوّارے چھوٹنے لگے، معنیوں کے، مطالب کے، محاسن کے، احسان کے، آرام کے، توفیق کے۔ زمین و آسمان، چرند و پرند، خلق و ملک، ایک جٹ ہو کر بولنے لگے ''وحدہ گویاں بذیرِ گلبنِ باغ وصال''۔ اللہ نے جس کے ساتھ پیار کیا، اس کی زبان، اس کی آنکھ، اس کے کان، اس کا دل اللہ کا ہو گیا۔ یہ سب اعضاء وہی کرنے لگے جو اللہ کرتا ہے۔ اقبالؔ نے یونہی نہیں کہا۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ۔ اسی طرح جس خوش قسمت انسان کے ساتھ صاحب نے پیار کیا، اس کی زندگی بختاور ہو گئی، آباد ہو گئی، بہاراں ہو گئی۔ اس کے قلب میں صاحب بیٹھ گئے، اس کی آنکھیں منوّر ہو گئیں اور اس کے کان غیبی آوازیں سُن سُن کے وسیلۂ پیامِ حق ہو گئے۔ اس کا تعلق دھیرے دھیرے زمین سے کٹتا گیا اور وہ آفاق کے قریب پہنچتا گیا یہاں تک کہ آفاقی ہو گیا۔ زمین سے اسلئے نہیں کٹ گیا کہ زمین نیچ ہے، بُری ہے، بلکہ اسلئے کہ زمین اگر روح سے جدا کرے اور آخرت کو بھول ڈالے تو اس سے بڑھ کر کوئی جہنم نہیں، پھر تو یہ ہاویہ ہے، نار حامیہ ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
غالبؔ

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
اقبالؔ

یہاں تک ہم نے صاحب کی شخصیت کی چند ایک امتیازی خصوصیات مختصر لکھ ڈالیں مگر ان خصوصیات کی فہرس اتنی لمبی ہے جتنا کارِ جہاں دراز ہے۔ ہم صرف کئی ایک اور کا نام لیں گے۔ وہ حلیم ہیں، کریم ہیں، نعیم ہیں، سلیم و فہیم ہیں۔ ان میں صبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے۔ ان کا صبر صبرِ ایوبؑ کہلائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ پس پشت ان کو بہت برا بھلا کہا گیا حتیٰ کہ بدتمیزی سے اُن کا نام لیا گیا، ان کے منصب پر چہ میگوئیاں کی گئیں، دنیا

کے دستور اُن پر حاوی کیے گئے اور ان کی مدد سے اُن، کا اٹھنا بیٹھنا ان کا وتیرہ جانچنے کی کوشش کی گئی، مگر انہوں نے اُف تک نہ کی۔ ایک دفعہ میں ان کے ساتھ بازار سے گذر رہا تھا اور بہت سارے لوگ، زن و مرد حسب دستوران کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کشمیر میں ابھی بندوق نہیں چلی تھی۔ ایک آدمی دور سے بک رہا تھا اور نہایت ہی ناشائستہ زبان بول رہا تھا۔ میں نے سنا اور

دپیوے بالہ یارس یأرِ لاگو
تمی دوپنم بوزہ ون چھس کونہ لاگو
سوچھ کرال

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جھٹ صاحب بول اُٹھے۔ ''اس کی طرف توجہ مت دو، ہر ایک انسان وہی بولتا ہے جو اس کے دل میں ہو''۔ یہ بول ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اگر چہ اس بدخصلت انسان کی دل آزاری بھی تازہ ہو رہی ہے۔ صاحب برداشت ہی نہیں کرتے تھے، تکالیف سے گھبراتے بھی نہیں تھے اور نہ شکوۂ زمانہ کرتے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ زندگی عادت کا بھی نام ہے۔ عادت سے نہ آج تک انبیاء مبرّا رہے نہ اصفیا، نہ شیخ، نہ عالم، نہ زاہد۔ اسلئے صاحب بھی عادت سے کبھی علیل رہے، کبھی جسمانی لحاظ سے کمزور رہے، کبھی کسی نے ان کے دل کو ٹھیس لگانے کی کوشش کی، کبھی عزیز واقارب کے ساتھ ناروا سلوک ہوا، مگر انہوں نے صبر و شکر سے کام لیا، وہ بھی بدرجۂ اتم۔ بچپنے سے بڑھاپے تک انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے مگر وہ نہ کبھی دل برداشتہ ہوئے اور نہ کبھی تیوری چڑھائی۔ حسد، نفرت، بغض، انتقام جیسی خصلتوں کو اپنے اندر پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کو دیکھ دیکھ، ان کو جان جان کر دل نے صرف یہ کہا کہ اللہ کی پناہ، یہ تو ہرگز ہرگز بشر نہیں ہو سکتے، فرشتہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ بشر ہیں اور اس لئے بھی عظیم کیونکہ گردوں بھی عالم بشریت کی زد میں ہے، کیونکہ بشریت قدوسیت سے بڑھ کر، خاص کر ان کی، اُن جیسوں کی! وہ فرشتہ بھی نہیں کیونکہ انسان بہر کیف فرشتوں سے بڑھ کر، یقیناً اس تناظر میں جس میں ہم انہیں دیکھتے ہیں اور ان کی محنتوں کو، ان کے

ریاض کو اور ان کے قدم قدم پر اللہ اللہ یاد کرنے کو۔ انہوں نے بہت ہی محسن کام کیئے، بہت ہی دشوار گذار منازل طے کیئے، خونِ جگر پیا اور خونِ جگر پی پی کے انسان کامل کی وضاحتیں کیں۔ اُن کے اعمال سے سب کچھ واضح ہوا نہ کہ ان کے بیان سے یا اُن کی وعظ سے۔ نمائش اور دکھاوا ان کے پاس کبھی نہ پھٹکا۔ وہ اصل ہی اصل بنے رہے، شریف النفس۔ نہ امارت پسند نہ چاپلوس، نہ خود غرض! تعلقات کی پاکیزگی سے پوری طرح شناسا، ان کی شخصیت نے اپنی سطح برقرار رکھی، عقاب اور شہباز کا طریقہ اپنایا، زاغ و زغن کا نہیں، ہرگز ہرگز نہیں! بیگانوں کے ساتھ یگانہ رہے اور قرابت داروں کے ساتھ قرابت کا اعزاز! کبھی اگر آوارۂ جنون جیسے نظر آئے تو خرد کی گتھیاں سلجھانے کیلیئے اور کھوکھلے رسوم کی اصلیت دریافت کرنے کیلیئے، کھوکھلے تعلقات کی بے ڈھنگی اور سفلگی دیکھنے کیلیئے۔ کبھی دشت نوردر ہے تو وادیٔ سینا کا سا ماحول پرکھنے کیلیئے کہ جس میں ریگ درشت کا ذرہ ذرہ ''ڈرمت میں حقیقتِ ابدی ہوں جو کائنات اکبر میں جاری و ساری ہے'' بزباں حال بول رہا ہے۔ کبھی اگر بن باس لیا تو یہ دیکھنے کیلیئے کہ شش جہت میں کلام الٰہی کس طرح گونجتا ہے اور سات رشیوں کو جگا جگا کر دل میں اس طرح جگہ کر بیٹھتا ہے کہ کُن کہا اور فیکون ہو گیئے۔ ہم سب کی طرح وہ کھاتے رہے، پیتے رہے مگر ان کا کھانا الگ، پینا الگ، دونوں حیات جاوداں کا زینہ۔ شکم پُری اور شکم پروری سے تو ان کے کتّے بھی محفوظ رہے۔ کتّے کا نام اس لئے نہ لیا کہ وہ ان سے حقارت کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ ہمارا ذہن ذرا ہچکولہ کھائے اور ہم جاگ اُٹھیں۔ کبھی کبھی وہ ہفتوں نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ عقل سے کام لے لے کر بھی سمجھتے نہیں تھے ہم کہ وہ کیسے زندہ ہیں اور چاق و چوبند۔ وہ علی الصباح اٹھتے تھے، غزل کے وقت

جب ہر آواز دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور سوئے ہوئے جذبوں میں حرارتِ معانی بھر دیتی ہے۔ ایک دفعہ میں صبح سویرے جاگ کر بھی نہ اُٹھا کہ نیند پیاری لگی اور جسم کی بے آرامیوں نے قبضہ جمایا۔ مگر خوب جوتے برسے اور میں اب بھی ان کی شیرینیاں بھول نہیں چکا ہوں۔ سویرے سویرے اٹھنا آخری دم تک ان کا معمول رات اور دن کا ملن اُن کو پیارا لگتا تھا۔ وہ سوتے کم تھے، بہت کم، اگر آپ باور کریں تو اُن کا سونا سونا نہیں جاگنا ہوتا، ہماری طرح کا جاگنا نہیں، ایسا جاگنا کہ بس آیت الکرسی سے سمجھ میں آئے۔ بڑے خود دار تھے اور گردن فراز مگر اپنی گردن کو نیچا دکھانے کیلیئے بہت بڑا، سخت تکیہ استعمال کرتے تھے کہ اگر میں کروں، میری گردن ہی ٹوٹ جائیگی۔ مگر بڑے تکیے کے بڑے گن بھی ہیں اور وہ آگے چل کر! کبھی بھی کسی سے کوئی چیز مانگتے نہیں تھے کیونکہ سوال ان کے مزاج سے خارج تھا۔ پانی کا گلاس بھی نہیں مانگتے اور نہ کسی کو اٹھانے دیتے۔ خود اٹھایا، خود پانی پیا۔ ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ اپنا بستر بھی خود ہی سنبھالتے تھے۔ کھڑکی بھی کھولنا ہو تو خود کھولی، دروازہ بھی بند کرنا ہو تو خود بند کیا۔ تانگے پر چڑھنا ہو تو اپنی مرضی سے چڑھے اور موٹر میں بیٹھنا ہو تو اپنے من سے پوچھے بنا نہیں۔ چڑھنے کی بات الگ، موٹر سے اترے بھی نہیں جب تک کہ حق نے نہیں کہا بسم اللہ! ایسی شخصیت تو بدنصیب انسانوں کو بھی بہاراں اور آباداں کر دیتی ہے اور صابہ دیدی کو بھی ''موج'' بنا دیتی ہے۔ یہ سیدھی سادھی خوش قسمت بزرگ عورت محلّہ باغات سوپور سے روز صاحب کیلیئے کھانا لاتی تھی اور کبھی کبھی چائے بھی، روٹی بھی مگر چھوٹے سماوار میں۔ سماوار چائے کو یقیناً چائے بناتا ہے اور کشمیریوں کا وودکا۔ میں نے بھی اس سماوار سے چائے پی لی ہے۔ میں ماڈرن تہذیب کا بانکا یہ جانچنے کی کوشش کرتا تھا کہ دیکھیں ''موج'' صاحب کیلیئے کیسی چائے لاتی ہے۔ مگر یکدم فسٹ کلاس چائے۔ نو نہ چائے! ''موج'' پائندہ باد!

صاحب کی شخصیت علم کا بے پایاں سمندر ہے۔ علم اُن کی زبردست طاقت کا سرچشمہ ہے مگر یہ علم اور ایسا علم آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ علم الف بے پے تے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا اور نہ اے فار ایپل،

بی فار بال کی طفلانہ مشقوں سے۔ یہ اُن زبانوں سے بھی حاصل نہیں ہوتا جنہیں ہم جانتے ہیں، جن پر ہم فخر کرتے ہیں، یہاں مشرق میں یا وہاں مغرب میں۔ ان کی علمی زبان میں نہ حروف ہیں اور نہ الفاظ، حالانکہ حروف بھی ہیں اور الفاظ بھی۔ یہ علم ان کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا جو عام لوگ پڑھتے ہیں مگر خدا جب حسن دیتا ہے تو ان کتابوں میں بھی نزاکت پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی بولنے لگتی ہیں۔ یہ علم اصلاً حاصل ہوتا ہے الکتاب سے جو صرف ایک ہی کتاب ہے، لوح محفوظ میں درج۔ کہتے ہیں کہ لوح محفوظ بھی یہاں ہی ہے یعنی انسان کا دل۔ جس نے دل کی کتاب پڑھنا سیکھی اسے بنیادی طور پر علم حاصل ہو گیا، صرف وقت کی بات ہے۔ وقت کے سلسلے بہت لمبے ہیں۔ ان سلسلوں سے انسان رفتہ رفتہ ہی گزرتا ہے۔ مگر صاحب کی شخصیت کی رفتار زمانے کے اتھاہ سمند[illegible]ست رہی ہے نہ ہے، وہ بجلیوں کی طرح تیز چلتے ہیں اور اکثر۔ ان کے گھوڑے بہت تیز رفتار [illegible] کے رنگ بھی اچھے اچھے اور مختلف۔ سیاہ رنگ کا گھوڑا بہت ہی خوبصورت، بہت چالاک، بہت چاق و [illegible] ہے اور ان کا دل پسند گھوڑا۔ اس کی ہنہناہٹ سے بڑے بڑوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ آج کل کے کچھ سید[illegible]ھے، نافہم لوگ ایسی باتوں پر ہنستے ہیں۔ اصلی باتوں پر ہنسی آ ہی جاتی ہے۔ خالی الذہن لوگ اکثر ہنستے ہنستے دانت بھی دکھاتے ہیں۔

[illegible]ل لوگ کمپیوٹر کو دیکھ کر ناچتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جس نے کمپیوٹر کھولا، اس نے پاتال کا بھی علم حاصل کیا۔ پہلے شاید انہیں معلوم نہیں کہ کمپیوٹر کسی نبی، کسی ولی، کسی قلندر یا کسی ملنگ کے دماغ کی پیداوار نہیں۔ [illegible]لم سے کم بلاواسطہ نہیں۔ عالم و فاضل لوگوں کی پیداوار ضرور ہے اور ہم ان کے عقل و فہم کی داد دیتے ہیں، انہیں مرحبا کہتے ہیں۔ بڑے ہونہار اور کارآمد لوگ ہیں یہ۔ انہیں کسی حد تک عارف بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ عارفوں کے سینگ نہیں ہوتے، مگر ان کا اُس دنیا، اُس کائنات کے ساتھ سمبندھ نہیں جسے دنیائے بے مثال کہتے ہیں۔ اس دنیا کا علم بلاواسطہ ہوتا ہے اور اکثر یکایک اچھلتا ہے۔ ان لوگوں کا علم بس وہی علم ہے جس نے آج کل کی دنیا میں نام پیدا کیا، دو اور دو کو ملا کر چار بنانے کیلئے۔ حالانکہ دو اور دو دوسرے طریقے سے بھی چار ہو جاتے ہیں اور شخصیت کا اصلی مواد فراہم کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کمپیوٹر کا علم جزوی ہے، ناقص ہے، بدلتا رہتا ہے، ساری چیزیں، ساری باتیں اپنے دائرے میں نہیں لاتا۔ یہ علم باہر سے کمپیوٹر میں ڈالا جاتا ہے۔ جو لوگ کمپیوٹروں کے مالک اور خالق بن بیٹھے ہیں، ان کی مرضی ہے کہ وہ کون سی باتیں کمپیوٹر میں ڈال دیں اور کون سی نہیں۔ یہ بھی کہ کن باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کریں اور کن باتوں کو اصلی روپ میں رہنے دیں۔ یہ بھی کہ اصلی نقلی کا جادو یہاں بھی چلتا ہے اور خوب چلتا ہے۔ کیوں نہ چلے؟ کتابوں میں چلے، اخباروں، رسالوں میں چلے، سی ڈی اور سمعی

بصری تعلیمی یا تفریحی وسیلوں میں چلے۔ کمپیوٹروں میں کیوں نہ چلے؟ پیسے جو کمانے ہوتے ہیں، کرسیوں پر بیٹھنا جو ہوتا ہے اور بڑی بڑی کرسیوں پر، موچھوں کو تاؤ جو دینا ہوتا ہے، لوگوں کو ڈرانا، دھمکانا اور دبانا جو ہوتا ہے اپنی چودھراہٹ کیلئے۔ [illegible] اتنی باتوں کی ملاوٹ ہو وہ اصلی کیسے ہو۔ اس میں اصلی کم ہوگا اور [illegible] زیادہ۔ تیسرے یہ کہ یہ علم اپنی طاقتوں کے باوجود دھیرے دھیرے ہی آگے بڑھتا ہے۔ حیرت انگیز انکشافات کیسے کرسکتا ہے، میخوانوں کے اندر کہاں گھس سکتا ہے۔ چوتھے یہ کہ کمپیوٹر علم یہاں سے وہاں تک دوڑ سکتا ہے، سانس پھول کر تھک گیا اور ٹھپ زمین پر۔ اس طرح گرا جس طرح غبّارہ۔ پیٹ سے ہوا نکل گئی اور زمین پر چاروں شانے چت۔ کمپیوٹر کا نصیب کہاں کہ چاند ستاروں کے ساتھ چاند ستاروں پر چڑھنے کے بغیر باتیں کرے، مجھے بتائے کہ زمانے کے گھوڑے پر کون سوار ہوتا ہے اور کس طرح۔ کجا وہ علم جو صاحب کو حاصل ہے، جو نہ مشرق و مغرب کا پابند نہ جنوب وشمال کا، نہ اوپر کا نہ نیچے کا۔ اگر عالموں کا عالم، فقیروں کا فقیر، قلندروں کا قلندر، انبیاء و اولیا کا مالک چاہے تو یہ علم امیوں کو بھی عطا کرسکتا ہے، انہیں الکتاب سے ایسا واقف کرسکتا ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں عالم اس واقفیت پر کتابیں لکھ لکھ کر، تقریریں کر کرا کے وہاں ہی پہنچ جائیں جہاں سے شروع کریں۔ جس کی نظر الکتاب پر پڑھی، جبرئیل بھی اس کے ساتھ ہمیشہ چل نہ پائے اور نہ جبرئیل جیسے مقربین یا انبیاء یا اصفیا! حریمِ ذات صرف ذاتی معاملہ ہے!

دیدو سیتی ووچھ دیدار
دیدن تہ دیدن چھوی ملہ ژار
گوشو منزی چھے ہوشچ تار
دیدن تہ دیدن چھوی ملہ ژار
شمس فقیر

کمپیوٹر کی بات اسلئے چلی کہ صاحب کا سینہ مبارک بھی ایک عجیب وغریب ایک انوکھا کمپیوٹر ہے کہ جس نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگائے۔ اسے ربانی رحمتوں نے اس طرح کھول کر رکھ دیا کہ اس میں کوئی نقص نہ رہا، کوئی داغ نہ رہا، نہ کوئی آلائش۔ اس کمپیوٹر کی کنجی جس کے ہاتھ لگی اس نے اس کی ساری کھڑکیاں کھول کے رکھدیں، دھیرے دھیرے ہی سہی۔ تعجب ہے کہ ان کھڑکیوں کی تعداد بے شمار مگر دھیان تو جبھی ان کی طرف جاسکتا ہے جب صاحب اشارہ کریں، بس اشارہ! اشارہ پاتے ہی بڑے بڑے صوفیوں نے کیا، بڑے بڑوں نے بھی پرہیز توڑ دی اور ایسی پی لی کہ وارث پرویز ہوگئے، رستاخیز بھی برپا کی اور خود نشاط انگیز طربناکیوں کی طرف مائل ہوگئے۔ ایک کھڑکی تاریخ کی طرف کھلتی ہے اور اس میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے، ہر ایک نظر آتا ہے، رعایا، بادشاہ، وزیر، امیر، مال وجائیداد کے مالک، مال وجائیداد سے دنیا کا ہنگامہ برپا کرنے [illegible] داس، عام لوگ جو خداپرست ہیں، خوف اور ڈر سے خدا کی عبادت کرتے ہیں، پتھروں کے سامنے [illegible] ہیں، وہ بھی جو مذہب کے چودھری ہیں اور اپنی چالاکیوں سے خدا کو بھی بوتل میں اتارنے کی کوشش کر[illegible] عابد، زاہد، عالم، فاضل، درویش، قلندر، رسول اور نبی سب تاریخ کو رنگین بنادیتے ہیں مگر تاریخ ہے کہ شیشہ کہلاتا ہے جس میں خدا کی خدائی جھلکتی ہے۔ علم کی کھڑکی بھی کھلتی ہے تو سب علوم آپ کے سامنے [illegible] چاندتاروں کو سر کرنے نکلے ہیں، بیماریوں کا ایکس، وائے، زیڈ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، حساب وکتاب رکھتے ہیں اور قطعی اعداد وشمار پر اِتراتے ہیں، سیاست کے کھیل رچواتے ہیں، معاش سے نئے صرافوں اور نئے زرگروں کو جنم دیتے ہیں، مشینوں اور بموں سے ایک ہی وقت کروڑوں لوگوں کے خون کے ساگر بہاتے ہیں، خدا کو خانوں میں بانٹتے ہیں اور اسے کھلم کھلا دکانوں میں بیچنے کے گُر سکھاتے ہیں۔ مگر اس میں وہ علم بھی دکھائی دیتے ہیں جو انسان کی کایاپلٹ دیتے ہیں اواسے حریم ذات میں پہنچادیتے ہیں، اس کے درد کی ہر دوا مہیا کرتے ہیں، جمال وجلال کی سحر انگیز کائنات اس کے سامنے کھول دیتے ہیں اور وہ مست ومدہوش شیش محلوں میں نت نئے نظارے، نت نئے تماشے رقص رقصاں تماشا کرتا ہے، صحیح دولت پاکر عظمت، عزت، فرحت حاصل کرکے نئے نئے خداپرستی اور خداشناسی کے راستے تلاشتا ہے جو اس کی مہربانیوں سے صرف ایک ہی نام سے جانے جاتے ہیں...... صراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم! یہ علم بھی اسی کمپیوٹر میں جوان کے سینے میں محفوظ اور وہ علم بھی جو دلوں کے راز جانتا ہے، کھرا الگ کرتا ہے، کھوٹا پھینک دیتا ہے، نیتوں سے واقف ہے اور اصلیت کی اصلیت بھی معلوم کرسکتا ہے۔ اس علم کو دیکھ کر اور اس کی ایک جھلک پاکر سب شیطان چوہوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ بلیوں کے ڈر سے نہیں، گھاس کے تنکوں کی معمولی حرکت سے۔ اس علم سے چھپے ہوئے

خزانوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے، الکہف کے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی داستان تازہ کی جاسکتی ہے اور سارے عالموں کو اس کی چھپی دولت سے حیران و ششدر کیا جاسکتا ہے۔ یہ علم چھوٹے بڑوں کے درمیان حقارت یا نفرت کی دیواریں کھڑا نہیں کرسکتا بلکہ دلوں کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اس علم سے پتھروں کے سینے بھی وا ہوجاتے ہیں جو لعل ہائے بے بہا باہر پھینکتے ہیں۔ یہ علم سرمایۂ حیات ہے۔ داروئے ممات ہے یعنی آب حیات جو سکندر کو اس لئے ہاتھ نہ آیا ہو کہ تلوار سے، لڑنے بھڑنے کی طاقت سے، فاتحانہ تکبر سے دنیا کو رام کرنا چاہتا تھا یہاں تک کہ ہندوستان کی پدمنیوں اور بنگالی جادوگرنیوں پر بھی قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ یہ علم دل میں گھس جائے تو نکل نہ پائے جب تک کہ انسان کی زندگی مکمل طور پر بدلائے نہ، گوشت پوست کی زندگی اور گلٹیوں کی، عصبی تاروں اور عصبی مادوں کی زندگی، ہڈیوں اور ہڈیوں کے کیلشم اور فاسفورس کی زندگی کہ انسان کو ارضیات سے اکھاڑ کر آفاقی بنائے، لامکانی اور لازوالی! یہ علم طبائع سے واقف ہے اور ان عوامل (factors) سے بھی جو طبیعتیں بنانے کے کام آتے ہیں، نسلی یا طبعی اعتبار سے یا ماحولیاتی عمل ردِ عمل ہے۔ اس علم کے سامنے سارے مظالم ڈھیر ہیں جنہوں نے خدا کی اس حسین وجمیل کائنات میں ایسے قضیے کھڑا کیے کہ انسان کا دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہونا ناممکن نا سہی، دشوار ضرور ہے، بہت دشوار! یہ تمام پیغمبری پیغامات زندہ کر دیتا ہے اور صاحبانِ فراست کیلئے ایسی کھڑکیاں کھول دیتا ہے کہ جنت الفردوس کیا، اس کے پیکروں میں بھی جان بھر دیتا ہے، ایسی جان کہ انسان کیلئے کوئی صورت نہیں رہتی کہ وہ ان سے مُکھ موڑے۔ مُکھ موڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے خیال میں بھی خار خار جنگل نظر آتے ہیں جن میں غول وعفریت کی حکمرانی ہوتی ہے اور ویرانی ہی ویرانی!

مگر طبائع ہی انسان نہیں بناتے، عقل بھی، وجدان بھی بناتے ہیں۔ عقل اور وجدان دونوں احساسات اور جذبات کے ساتھ دودھ اور پانی کی طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں، چنانچہ خواہشات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مکمل نقش بن جاتا ہے، نقش انسانی۔ صاحب کی شخصیت میں اس نقش کی طرف بھی کھڑکیاں کھلتی ہیں جو دور جا کر ہی سہی، ایک ہی کھڑکی میں ضم ہوجاتی ہیں۔ اس جہاں میں کیسے کیسے رنگ نظر آئے اور اسلئے جہانِ رنگ وبو کہلایا۔ کچھ باتیں اس بارے میں بھی، اچھنی ہی سہی! درد ایک حس ہے اور خوف وغصّہ جذبے۔ جب خوف اور غصّہ اور ان کی حالتیں عقل میں سما جائیں، درد محسوس ہوگا، دوسروں کا درد خاص کر کیونکہ سنگ اٹھا کر ہی سر یاد آتا ہے۔ تینوں مل کر اور وہ بھی دماغ کے ساتھ اگر کام کریں تو ایک نیا ہی معجون تیار ہوگا جو عقل کو بھی آزاد کریگا اور وجدان کیلئے قوت کا وسیلہ بن جائے گا۔ اسی طرح ہمدردی اور مسرّت

جذبات ہیں اگر انہیں بھی دکھ درد کے احساسات کے ساتھ ملایا جائے، ہم آہنگ کیا جائے تو انسان کی خواہشات کا دھارا بدل جائیگا اور انہیں صحت مند ماحول کے موزون و مناسب طریقوں سے پورا کیا جائیگا۔اس طرح سماج کی بے راہ رویاں دور کی جاسکیں گی۔ محبت اور عشق نہایت ہی ضروری جذبات ہیں، ان میں حرارت بھی ہے اور قوت و توانائی بھی۔ انہیں اپنائیت، شگفتگی اور حلاوت کے ساتھ تحلیل کر کے شخصیت کے اعلیٰ معیار اور مقاصد تخلیق کئے جائیں گے جن سے روحانی منازل طے کئے جاسکیں گے اور انسانی رشتوں کی مناسبت اور موزونیت گوندھ دی جاسکیں گی۔ عشق خواہشات کو عام سطح سے بلند کر کے اسے علویت اور ربانیت کے ساتھ بھی جوڑ دیتا ہے اور انسان کے اندر ہی اندر ایسے عالم پیدا کر سکتا ہے کہ ٹیلی ویژن، کمپیوٹر اور تصویر کش آلات بھی انہیں دیکھ کر اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے ہیں۔ صاحب کی شخصیت ان موزون و مناسب مرحلوں سے گذر چکی ہے اور دوسروں کی شخصیت کی تعمیر و ترقی اور تخلیق میں لگی ہوئی ہے۔ وہ تو انسان کے جذبات، احساسات، فکری و قلبی حالات کے اندر گھس کر روحانی عالم کی اور اور شگفتگیوں کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کام میں وہ شخصیات کی روحانی قوتوں سے استفادہ بھی حاصل کر رہے ہیں اور ان کی حسب ضرورت خوب خوب آبیاری بھی۔ اگر ان کے علم کی دنیا اتنی وسیع نہیں ہوتی تو یہ کام احسن طریقے سے کیسے ہوسکتا تھا اور اس کے بار آور نتیجے برآمد کیسے ہوتے! احسن کے فرزند کے احسن کام!

مختصر خلاصہ! صاحب کی شخصیت بہت گہری کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل۔ اس میں سب عالم موجود، ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت! خدا کے نام سے شروع کر کے ناسوت سارے عالم کو سمیٹ لیتا ہے اور انسان بول اٹھتا ہے کہ جہاں بھی ہو تم ہی ہو، اندر بھی باہر بھی، ظاہر بھی باطن بھی۔ ہر چیز پر نظر رکھے ہو۔ ہر چیز سے واقف ہو۔ ملکوت میں روحیں ہی روحیں ہیں، انسانوں کی روحیں، جو انسان نہیں ان کی بھی، روحیں جو پرواز کرنا جانتی ہیں اور جو بوجھ سے دب کر اڑ نہیں سکتیں، روحیں جو عیش کرتی ہیں اور ڈالی ڈالی پھدک پھدک کر نغمہ ہائے نو بہار گاتی ہیں، روحیں جو عشق کے انگاروں کو گلبنوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ روحوں کے اس عالم میں اقبال مندوں کی بڑے سے بڑے لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ جبروت کا عالم جلال ہی جلال لیکر آتا ہے۔ مشکل پسند ملنگ بڑی بڑی طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں اور کبھی کبھی خطرناک خطوں سے گذر گذر کر کمالات کے بے بہا خزانے حاصل کرتے ہیں۔ لاہوت کے عالم میں جاتے جاتے عقل و فکر کے پر جل جاتے ہیں اور ظہور الٰہی کی تپشوں سے حواس سکتے میں پڑ جاتے ہیں۔ جو لوگ لاہوت میں چلے گئے ان کی خبر وہاں سے آئی نہیں۔ آئے بھی کیسے؟ وہاں نہ کلام اور نہ جرأت کلام مگر وہاں آزادی ہے، مکمل آزادی، اور صاحب کی

شخصیت آزاد، بخدا مکمل آزاد!

صاحب کی شخصیت حسن و عشق کا بے پایاں سمندر ہے۔ اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ جو اس میں گر گیا، اسے ساحل کی تمنا سے کیا! اُن کا عشق بھی محدود نہیں۔ وہ تو ہر شے سے محبت کرتے ہیں، کانٹوں سے، گلابوں سے، ریگ زاروں سے، ساگروں سے، درندوں سے اور خوش نما طائروں سے بھی۔ ان کا دل ہر ایک کیلئے کھُلا، بُروں کیلئے، بھلوں کیلئے، نابالغوں کیلئے، بالغوں کیلئے، اپنے ہوں یا بیگانے، دشمنی کرنیوالے ہوں یا دوستی کا ہاتھ بڑھانے والے، گورے، کالے، بدصورت، خوب صورت، سب اس کے اور وہ سبوں کے، اسلئے سب انہیں احد بب کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا عشق زماں و مکان سے آزاد۔ اول سے آخر تک سبوں کے ساتھ جڑا ہوا، یہاں بھی اور وہاں بھی، جہاں جو چلا واپس نہ آیا۔ وہ ہر قوم، ہر مذہب، ہر عقیدے اور ہر ایمان کا مشاہدہ کرتے ہیں، سبوں کی باتیں سنتے ہیں اور سب کیلئے رحمتوں کی سوغات بھیجتے ہیں۔ وہ نظر کے عاشق ہیں، ہر نور اُن کا اپنا نور ہے۔ سیاہ نور کے ساتھ ان کی خاصی الفت! وہ خدا کو، ہر رنگ میں پہچانتے ہیں اور صبغۃ اللہ کا ورد کرتے ہیں۔ ان کی نظریں ہر کسی کی نظر سے ملی ہوئی ہے، عقل و دل کی نظر سے بھی، وہ وجدانی بھی ہیں، منطقی بھی، علمی بھی اور وہبی بھی۔ وہ قاری بھی ہیں اور قرآن کو دل میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ ''یزداں بہ کمند آور'' ان کے شعور کی شوریدگی نہیں، شوریدہ و پراگندہ شعور تو جدید معاشیات سے پیدا شدہ شعور ہے۔ ان کے من کی آواز صبح و شام، دن رات، ہر موسم اور بہر صورت گونجتی رہتی ہے اور وہ ہر سُو سے آوازِ دوست سنتے ہیں۔ انہیں تو ہر شے اسرار ازل کی کتاب کھول دیتی ہے مگر وہ ہر وقت دل با یار کہتے رہتے ہیں کہ ''مجھے حقیقت اشیاء اس طرح دکھایئے کہ معروضیت اور قطعیت کے بغیر کچھ نظر نہ آئے''۔ اس عاشق جانباز کی کہانیاں پڑھ پڑھ کے، سن سن کے دلچسپ بنتی جاتی ہیں اور مگر مہر انگیز بھی۔ ہم انہیں سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور اب ان کے ساتھ کہیں اور جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

آکاش پاتال پر سبق اکھ سرِ ژندرم تارکھ
درو جور پُر معنی ہے یتہ سوی چھے تتہ سوی چھے
شمس فقیر

بارِگاہ جلال و جمال......دِل
(گرہِ میانہ در بارشاہ سوندری)

ب کی بارگاہ
بڑی، اتنی بڑی کہ
کے نامور صاحبِ
دل سالک شمس صاحب
فقیر بھی اپنے تجربے کو
مدنظر رکھتے ہوئے کچھ
کہنے سے عاجز! یکے بعد
دیگرے تین مکانوں پر
مشتمل صاحب کی رہائش گاہیں اس بارگاہ کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور نہ اُن پروانوں، مریدوں، عقیدت مندوں، سائلوں، خادموں کے گھر جو جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، سوپور سے زینہ گیر تک، زینہ گیر سے لولاب تک، لولاب سے بارہمولہ تک اور وہاں سے سرینگر یا سرینگر کے قرب وجوار میں کسی بھی مقام تک۔ ان کی بارگاہ کے حدود زمین و آسمان یا پاتال کو

کامہ دیوہ یارہ میانہ ژام عشقہ زر
وندیو سر مدنو
نامہ لیکھیو کتہ چون گھر
وندیو سر مدنو
شمس فقیر

انسانوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو نہیں سمجھتے اس پر ہنستے ہیں اور حسن و خیر کے جلوے کی تاب نہیں لاسکتے تو غرّاتے ہیں: گوئٹے

بھی پار کر گئے ہیں کیونکہ کائنات بجائے خود لامحدود بھی ہے اور تغیّر پذیر بھی۔ مقاماتِ آہ وفغاں نہ جانے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری نظر کوتاہ ہے اس لئے اسی پر اکتفا کرسکتی ہے کہ وہ ہرجائی ہیں، گیرائی و گہرائی کے ساتھ۔ یہ ساری آفاقی وسعتیں اور گہرائیاں دراصل ان کے اندروں، ان کے دل کی کائنات کا خارجی ظہور ہیں اور اس میں واللہ باللہ کوئی مبالغہ نہیں، کوئی تمسخر نہیں۔ وہ پیر کامل ہیں، بہت کہن سال، یقیناً اس سے پہلے بھی موجود جب کائنات بنی اور آدم کا ظہور خارجی دنیا میں ہوا۔ یہ جو حسن و جمال، تجلی و جلال کا اتھاہ سمندر ہے، ان کے اندر اور باہر جلوہ افروز ہے۔ انسان کی زبان اور اس کے قلم کی کیا طاقت کہ وہ اس کا صحیح اور قطعی جائزہ لے۔ تاہم جتنی بضاعت، جتنی توفیق، اتنا مشاہدہ اور اتنا بیان اور اس کے ساتھ ساتھ فضلِ الٰہی۔

چلئے شروع کرتے ہیں جمال وجلال یار خورشیدِ تاباں،

عارضِ گُل گوں نگاہوں کا رنگیلا
دل جگر کا ولولہ ایماں کا بھڑکیلا
دیکھو دیکھو کس طرح دیکھے ہے عرفاں
اس کی آنکھوں میں کھلے ہیں لاکھ نشاط شالمار
اس کی پلکوں سے ہویدا نیم کش تیروں کا شوق
اس کی بھنوؤں کی کشاکش بادۂ عرفان کا ذوق
اس کے چہرے پر دلِ آباد کا گہرا سکون
اس کا آئینہ چھپائے جلوہ گاہِ بے چگون
رنگ عمامے کا سنائے داستانِ صندلین
درسِ سدرہ خود پڑھائے رونقِ ماہِ جبین
شکل و شمائل میں گھولا ہے حقیقت کا شعور
جرعہ جرعہ پی رہا ہے خود بخود یاں کوہِ طور
موئے مبارک کی سفیدی میں جبروتی جلال
عاشقوں کا دیں و ایمان تابشِ حسن و جمال
لعل ہائے بے بہا کی کان زنخدان کا چاہ
آب داری تابداری صبر آزمائے نگاہ
کس نے دیکھا ہے نرالا ایسا رنگین اعتدال
جھک گیا ہے دائماً سجدے میں میرے دل کا حالِ
اُن کی گردن میں شرابیں کس نے رکھ دی ہیں شفا
پی رہا ہوں پے بہ پے رندانہ ہے طرزِ ادا
حبیبؔ

رُوح: سیلاب ہست و بود میں، طوفانِ جدوجہد میں، ارض وسما میں منڈلاتی ہوں، شرق وغرب میں آتی جاتی ہوں! میں مہد بھی ہوں، لحد بھی، ابدی سمندر ہوں، نیرنگِ تغیر ہوں، شعلۂ حیات ہوں، زمانے کے راچھ پر تخلیق کے تانے بانے سے قبائے زندگی بُنتی ہوں جو معبودِ حقیقی کی پوشاکِ مجازی ہے۔''

گوئٹے (فاوسٹ)

ماہتابِ شب تاب اور محفلِ انجم سے کہ جو ماہ و سال، روز و شب ہر حال میں سورۃ الرحمن کی وضاحت بھی کرتے ہیں اور اس لازوال حسن کی بھی جس کے بارے میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرامایا کہ اللہ جمیل ہے اور اسلئے جمال پسند۔ یہ نورانی قندیلیں مخلوقاتِ ارض و سما کو بقدر مقدور فیض پہنچا رہی ہیں، اتنا ہی جتنی ان کی وسعت، گنجائش اور ضرورت۔ سوز و ساز سے بھری ہوئی کائنات میں لاتعداد مخلوقات ان نورانی فضاؤں میں کیا کیا پا رہے ہیں اور کیا کچھ، یہ تو ایک راز ہے رازہائے پنہاں میں جو ہمارے صاحب پر منکشف ہوتا رہتا ہے اور ان کے عمل پر علم [illegible] نے لگا تار رہتا ہے۔ یہ تجلیات ساکن نہیں اور نہ دلِ جانان۔ ایک طرف [illegible] اور تغیّر سے پیدا شدہ تغیر پذیر حالات اور دوسری طرف دل مبارک کی [illegible] دھڑکنیں صلے علیٰ کہیے، حمد و ثنا کہیے پڑھتی رہتی ہیں اور آگے بڑھتی رہتی [illegible] منزل کی طرف جس منزل پر پہنچنا اولوالعزموں کا کام نہیں اور نہ ان کی [illegible]، بس جلوہ مست لمحات کی بادہ آشامی اور مزید مزید جلوؤں کی تلاش ہی حصولِ تمنا! نور کے اتھاہ اور بے انتہا سمندر میں کھڑا رہنا اور جلوؤں کی تپش سے اور اور چمکنا جلالِ قلندری و رندی کی تگ و دو بھی ہے اور بازی بھی۔ زہے اقبالِ جلیلی، زہے اقبالِ سعادت مندی! نوری حضوری تیرے سپاہی!

صاحب کی نوری بارگاہ میں سورج کی خاص حثیت ہے۔ اس کی زور آوری بھی حسن اور اس کی نور افشانی بھی حسن۔ تپتے ہوئے ریگستانوں میں اس کی ناقابل برداشت حرارت حسن اور اونٹوں کی گھنٹیوں کی صدا ''چل چل مسافر چل اب تو منزل بھی دُور نہیں'' بھی حسنِ معنی و حسنِ ادا۔ پہاڑوں، کوہساروں اور جنگلوں کی نباتاتی بہتات میں اس کی دھوپ چھاؤں کا آرام حُسن اور جھاڑیوں اور پودوں کے بیچوں بیچ حشرات الارض کا اس کی مدھم گرمی اور مدھم روشنی کے ساتھ گہرا لگاؤ بھی حُسن۔ بھاپ اڑانا، بادلوں کا نچوانا اس کا کھیل، بوندا باندی کی چنچل چھیڑ خانی اور موسلا دھار بارشوں کا سیلابی جنوں اس کا میل۔ بادلوں میں زبردست کھچاؤ پیدا کرنا اور بجلی گرانا اس کا تنک مزاج اور ژالے کی بربادیاں اور تباہ کاریاں اس کا رسمِ بے رحم تاراج۔ یخ بستہ آبوں کی پگلاہٹ اور اس کے بیچوں بیچ مسلسل بہاؤ کا اہتمام، پانیوں کی پیہم دواں جولانی اور اس کے فیوض و برکات کی فراوانی شمسی کرامتوں کا کھلا اظہار ہے جس سے سب لطف اندوز ہوتے ہیں اور طرب و نشاط سے اس کی سراہنا کرتے ہیں
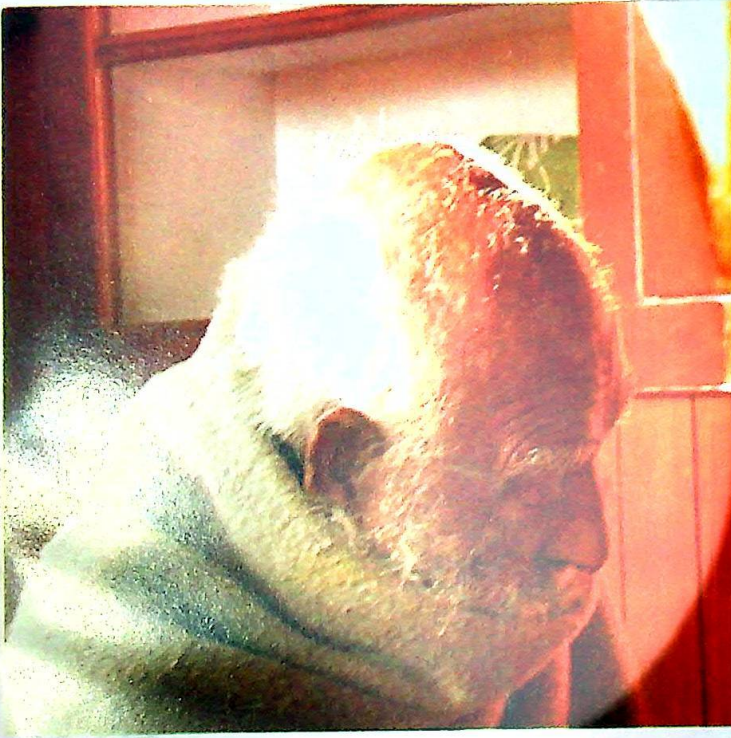
> اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
> حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں
> غالب

اور تحسین۔ کہا جانا چاہیے کہ مہر منیر نہ صرف فیضاں کا سر چشمہ ہے بلکہ آیات الٰہی کا وسیلہ بھی ہے، آیات جنہیں پڑھ کر سوئی ہوئی قومیں جاگ اٹھتی ہیں بشرطیکہ انہیں اپنی زندگی کی گونا گوں مصروفیات میں جگہ دیں اور ان پر ان تھک عمل کریں۔ فرد فرد آباد اگر اس کی شعاعوں اور نور پاشی کا شعور رکھتے ہوں اور فبای الاءِ ربکما تکذبن پڑھتے ہوں، اقرار باللسان اور تصدیق باالقلب سے، دو دو ہاتھ ملا کر عمل پیرا کہ دل بھی آباد اور زبان کا تمدن بھی صدق و صفا سے ضیا پاش! سارا عالم نورانی، رانگینوں میں ڈوبا ہوا، صاحب خاموش مگر شاہد اس طرح کہ کوئی بھی دیندار کہے کہ شہود، شاہد اور مشہود گتھم گتھا!

> درویش خدا مست نہ شرقی و نہ غربی
> گھر میرا نہ صفاہاں نہ دلّی نہ سمرقند
> چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
> کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند
> اقبالؔ

صاحبان فکر و نظر خورشید تابان کو علامتی روپ میں دیکھتے ہیں اور اسے شعور، انا یا

خودی کہتے ہیں، وہی انا یا شعور جو کائنات کا جوہر ہے مگر اس کا رازِ دروں بھی ہے، راز جس کا عرفان ہمارے صاحب کو حاصل ہے، باید و شاید۔ راز اسلئے ہے کہ اس میں بے پناہ جلوے ہیں حسن و جمال کی چکا چوند ضیا پاشیاں ہیں اور کبھی کبھی اتنی تیز اور ناقابل بیان شعاعیں کہ صاحبان جلال بھی و یبقی وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام پڑھتے ہیں اور اگر صاحب کی طرح بے ہوش نہیں ہوتے مگر موسیٰ کی طرف دیکھ کر ضرور کہتے ہیں کہ علیہ السلام کو خر موسیٰ صعقا کا جو مزہ چکھنا پڑا وہ یونہی نہیں تھا۔ مگر یہ شعور، یہ انا، یہ جوہر کہاں سے آیا اور جانا کدھر ہے اس کو، اگر ہمیں معلوم ہوتا ہم بھی صاحب کی طرح اپنے گھر میں لازوال محفلِ حسن و جمال جمائے ہوئے بیٹھتے اور ان کی طرح سرمست۔ تاہم عام لوگ تگ و دو میں رہتے ہیں اور یہاں وہاں اور ہر جگہ حسن [illegible] بھی اس کی پرچھائیں تو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ یہ شعور زمانے کے [illegible] بہتا ہے شاید اسی لئے حکم ہے زمانے کو برا بھلا مت کہو کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں۔ زمانے کے دریا [illegible] بہتا ہوا شعور رنگہائے بے چگوں دکھاتا رہتا ہے اور اس کی رنگا رنگی آنکھوں کو خیرہ کرتو دیتی ہے مگر عقل و دل کو

حُسن ہو یا جان ہو یا جان کا ارمان ہو
یا خودی کا پاسبان ہو یا انا کی شان ہو
بیٹھنا سنجیدگی سے کھاتے کھاتے سوچنا
کاروبارِ دو جہاں ہو ساز ہو سامان ہو
جسم کا موزون ترنّم روح کی بالیدگی
واہ چہرے کی وجاہت معدنِ احسان ہو
یہ شعورِ ذات ہے یا فکرِ پیمانِ وفا
بوجھ شانوں پر اٹھائے کتنے مہربان ہو
کیا مُہر کیا پنجہ کیا نقاشیٔ دستِ حبیب
رہنمائی کا نمونہ دردؔ کا درمان ہو
توشۂ راہِ وفا ہو یا شفا کا ہاتھ ہو
یا جمالی کان یا ہیروں کا بدخشان ہو
حبیبؔ

عاشقی برمن پریشانت کنم
کم عمارت کن کہ ویرانت کنم
گردو صد خانہ کنی زنبور وار
چوں مگس بے خان وبے مانت کنم
ورتو افلاطون و لقمانی بعلم
من بیک دیدار نادانت کنم
برگلویت تیغ ہارا دست نیست
گرچو اسماعیلؑ قربانت کنم
چوں خلیلؑ ہیچ از آتش مترس
من زِ آتش صد گلستانت کنم
دامنِ ماگیر اگر تردامنی
تاچومہ از نور دامانت کنم
ہین قراءت کم کن و خاموش باش
تابخوانم عینِ قرآنت کنم
رومیؔ

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود رانمی دانم
نہ ترسانہ یہودم من نہ گبرم نہ مسلمانم
نہ شرقیم نہ غربیم نہ برّیم نہ بحریم
نہ از کانِ طبیعتم نہ از افلاکِ گردانم
نہ از خاکم نہ از آبم نہ از بادم نہ از آتش
نہ از عرشم نہ از فرشم نہ از کونم [illegible]
نہ از دنیا نہ از عقبیٰ نہ از جنت [illegible]
نہ از آدم نہ از حوّا نہ از فردوس [illegible]
ھوالاول ھوالآخر ھوالظاہر ھوالباطن
بجز یا ھو ویامن ھو کسی دیگر نمے دانم
اگر در عمر خود روزی دمی بے تو برآوردم
ازآں وقت وازآں ساعت زعمر خود پشیمانم
الا ای شمس تبریزی چنیں مستم دریں عالم
کہ جز مستی و مدہوشی دگر چیزے نمیدانم
رومیؔ

بھی بیدار کرتی ہے۔ اک رنگ اس کا کہ مشرق سے سر نکالتا ہے اور مغرب میں چھپتا ہے مگر نہ مشرق کا ہے اور نہ مغرب کا۔ دونوں جلوؤں کی اچھل کود اور گھما گھمی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ میں مشرق ہوں، میں مغرب ہوں، میں اِدھر ہوں، میں اُدھر ہوں، اوپر ہوں، نیچے ہوں، مگر اصلاً یہ کہ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آئے گا کہ کوئی آبلہ پا میرے بعد
میرؔ

ہے۔ میں نے صاحب کو اس کعبے میں کھڑا پایا اور اس کا کھڑا رہنا صلوٰۃً دائماً بھی ہے اور سجوداً قائماً بھی۔ یہ تو ٹھیک اور بالکل

وَلِلّٰہِ المشرق والمغرب ج فاینما تولو فثم وجه اللّٰه

قرآن 2:115

رب المشرق والمغرب لا الٰه الاهو فاتخذه وکیلا

قرآن 73:9

ہی ٹھیک مگر زندگی کے سمندر میں چلتے چلتے یا بہتے بہتے روح انسانی کو کیا کیا دیکھنا پڑتا ہے اور کیا کیا سہنا پڑتا ہے۔ ازل سے ہی مصائب کا سلسلہ اور خون جگر پینے کا دور شروع ہوا۔ نکلا بہادر بن کر انسان انا کا بوجھ اُٹھانے، بوجھ جو فرشتوں اور جنوں پر تو در کنار، پہاڑوں، سمندروں اور خشکی و تری میں رہنے والی ساری مخلوق پر بھی گراں گزرا۔ یوں بھی کہیئے جہاں بھی جو مخلوق تھی، بول اٹھی حاشا ثم حاشا! ہم سے اٹھایا نہیں جائیگا۔ اس کے ستم کی داستان سننے کیلیئے عام انسانوں کی بیاضیں در کنار، خود پیغمبروں اور اللہ والوں کی حکایات پڑھنے کیلیئے بھری پڑی ہیں۔ بصیرت اور بصارت سے دیکھنے کیلیئے رنگ رنگ عالم سینے کھولے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کوئی شوق کا مارا ہو تو آگے بڑھے۔ آدمؑ بھی کھڑا اور اس کے ساتھ حوا بھی منتظر اور وہ شجر ممنوعہ دور سے دیکھ رہا ہے کہ کب ایسے جال میں پھنسے یہ جوڑی کہ سمجھ میں آئے انہیں کہ کارِ جہاں کتنا دراز ہے۔ نوحؑ بھی موجود اور سیلاب بھی ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہیں کہ کب اترے نیّا میں اور ساتھ ہی آواز دے دھیرے دھیرے بہو دھیرے انہیں تو پار اترنا ہے، صرف پار۔ ادریس، ہودؑ، صالحؑ سب اپنی اپنی مگن میں مست سیلاب ہست و بود کو پاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، اپنے عزم کو آزما رہے ہیں اور اپنی زندگی کو بہاراں بنا رہے ہیں خون کی ایک ایک بوند سے۔ آسمان کیا کریگا، زمین کیا کریگی، آندھیاں اور طوفان کیا بگاڑیں گے، جس کو آگے بڑھنا ہے عزم صمیم سے اور پیہم عمل سے، جس کا یقین جس کا خون ہے، اس کیلیئے سب سر بسجود جیسے یوسف کے سامنے اس کے بھائی، جیسے آدم کے سامنے ملائک اور سب! ابراہیم خلیل اللہ "من تو شدم تو من شدی"

نار نمرود کو کیا گل زار — دوست کو یوں بچا لیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

داغ دہلوی

من تو شدم تو من شدی من جان شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

خسرو

کے سوز و سرود میں شرابور نمرود کی آگ میں کھڑا ہے ایک ایک انگارے کو گل گلستان بنانے کیلئے، اسماعیل علیہ السلام سرخم ہے اس کی گردن پر ساطور ہی سہی۔ گلزار ابراہیم بھی سدا بہار، حاجرہ کا عالمِ رازِ نہاں بھی اشاروں اور کنایوں میں کھلم کھلا اظہار ہی اظہار۔ اسحٰق علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کے شانہ بشانہ باغِ جہاں میں رنگا رنگ پھول، رنگا رنگ پھل اُگا رہے ہیں۔ سارا عالم توحید اور محبت سے آباد ہو رہا ہے۔ نمرود سر کے بل گر جاتا ہے اور عیسیٰ کے منافق پیرو خود پھانسی پر لٹک رہے ہیں اور عیسیٰ روح الہ در دست علمِ عشق و رضا! انسانیت آباد، محبت کا میخانہ کھلا سرِ عام، کوئی بڑا نہیں، کوئی چھوٹا نہیں، کوئی حقیر نہیں، کوئی فقیر نہیں۔ دوڑ و دوڑ واللہ کا دروازہ کھلا ہے مگر میری طرح خالی ہاتھ جاؤ۔ وہ ایسی جھولی بھرے گا کہ کبھی خالی نہ ہوگی۔ یعقوب کی آنکھوں ... مصر میں زلیخا اور زنانِ مصر کو کھلے عام روشن کر رہا ہے اور ہم جا... ہوگا۔ جب حُسن یار پورے آب و تاب کے ساتھ چمک اُٹھتا ہے ... فیضیاب ہونے کیلئے پردۂ عصمت سے بھی باہر آجاتی ہیں۔ یوسف کی شان دیکھو۔ کنوئیں میں بھی گرا، بھیڑیئے کے تیز دانتوں کا فریب بھی اس پر چلا نہیں۔ بازار میں بھی بِکا، نام پر بھی حملہ ہوا، جیل بھی گیا مگر سب اس کے سامنے سر بسجود، یعقوب علیہ السلام بھی۔ سجدہ احترام کا ہو یا حمد و ثنا کا، سجدہ سجدہ ہے اور سجدے میں سب۔ خدا بھی فاتحہ میں دعا مانگ رہا ہے، نہ جانے کس کیلئے! ایوب کیڑوں کو پال رہا ہے اور یہی ذات الٰہی کا وظیفۂ خاص ہے۔ صبر سے سب کچھ حل ہو رہا ہے اور پھول کھلتے ہیں گلشن گلشن۔ موسیٰ علیہ السلام ہارون کے ساتھ مل کر نقلی خداؤں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور نار نمرود جیسی آگ کو بجھا رہے ہیں۔ آج بھی طور ہے نور سے بھرا ہو مگر نار سے بھی آواز نکلتی ہے، ڈرمت میں تمہارا خدا ہوں، مجھ سے ڈر کا ہے کا۔ جو دوست سے ڈرے وہ محبت کے رمز سے نا آشنا۔ آج بھی موسیٰ علیہ السلام لاٹھی پھینکتا ہے تا کہ اس سے سانپ نکلیں اور نقلی جادو کو اصلی طاقت یعنی معجزہ سے پھنکاریں۔ داؤد لوہے کو موم بنا رہا ہے اپنی لحن داؤدی سے کہ جس سے جگر چاک چاک ہو جاتے ہیں۔ پتھر پگلتے ہیں، لوہے کا موم ہونا کوئی

> من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
> کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را
>
> حافظ شیرازی

> انہِ گٹہِ وننہ نم ننہِ کتھے لال فروش کنہِ منزہ چھُ نیران جوہرے بال مریو
>
> (رسول میر)

بڑی بات ہی نہیں۔ آج بھی سلیمان چرند و پرند پر حکومت کر رہا ہے اور بلقیس اس کے قدموں میں اپنے تخت کے ساتھ ڈھیر۔ آج بھی ہُد ہُد کام کر رہا ہے اور روحوں کا پریذیڈنٹ بن بیٹھا ہے اور آج ذکریاؑ خود اپنے سر پر آرہ چلا رہا ہے کہ سارا مسئلہ طے ہو جائے اور آدم خاکی کو ایسا عروج نصیب ہو جائے، ایسا عروج کہ کمپیوٹر بھی سجدہ کرے اس کے آگے اور یقیناً لیزر شعاعیں بھی!

مگر صرف سورج ہی علامت کے طور پر استعمال نہیں اند بھی ہوتا ہے۔ مثلاً دوستان خدا کی مدد کرتا ہے راز کی دوں میں چھپانے کیلئے یا اشاروں کنایوں میں دوسروں پانے کیلئے، بھری محفلوں میں ایسی باتیں کہنے کیلئے جن کے سننے کیلئے نابالغ فرد، نابالغ لوگ، جاہل یار نہیں ہوتیں۔ مثالیں دے سکتے ہیں ہم مختلف قسم کے لوگوں کی زندگی یا کارناموں سے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کو لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ کے روئے پاک کی تعریف کرتے ہیں تو اسے چاند کہتے ہیں۔

میر سد عید کشتۂ آنم
کہ کند غمزۂ تو قربانم
تیغ از کشتم دریغ مدار
کہ برآمد دریں ہوس جانم
عید خود خوانمت و لے از عید
ہمہ خندان من از تو گریانم
جامی

یہاں بھی سورج ہے مگر اتنا تیز نہیں، اتنا گرم نہیں جتنا کہ دن میں۔ یہاں اس کی روشنی مدھم مدھم۔ یہاں اس کے گرداگرد چکور جمع نہ جانے آنکھوں آنکھوں میں کیا کیا اشارے کرنے کیلئے۔ یہاں اندھیری رات کا مداوا ہے چاند اور اس کی روشنیاں جو آبوں کے ساتھ مل کر دھیرے دھیرے کھیلنے لگتی ہیں کہ کوئی دل کا مارا، عاشق دلارا خواب غفلت سے باہر نکل آئے کسی ندیا کے کنارے بیٹھے اور دل برباد کے بسانے کی تدبیر سوچے۔ یہاں چاند کی رحمت کسی کھڑکی سے جھانکنے لگتی ہے اور کوئی زندہ دل دفعتاً اُٹھ کھڑا ہو جاتا ہے، کھڑکی کھولتا ہے، چاند کی پیلی پیلی راگنیوں کو کمرے میں بٹھاتا ہے۔ اپنا ستار اٹھاتا ہے اور ریاض کرنے لگتا ہے۔ جب وریدیں اور شریانیں اکٹھے مل جائیں اور تاروں کو دھیرے دھیرے چھیڑنے بیٹھیں تب کہیں پیلی راگنیوں کو دل کھولنے کی ترغیب ملے اور سماں کیا ہوگا کہ اوپر سے نیچے تک گرہ میانہ دربار شاہ سوندری (My home is the grand palace of the monarch, O my beautfiul soul)

ڈیکس تس نور ڈیوٗٹھم دِلس تصوبر بیوٗٹھم
اما یوسف ما چھُم زُلیخا چھس وو بالی
رسول میرؔ

بجنے لگے اور سارا عالم غنائی رحمتوں میں ڈوب جائے! نہ روک، نہ روک، نہ روک میرے دل مجھے، میں بھی ڈوب جاؤں گا غنائی رحمتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ بالکل سیدھ میں سامنے اور میں ان کے قدموں میں بیٹھا ہوا اور کھویا ہوا! ابھی اندھیروں میں اجالے کی بات اٹھی۔ جب عالم بہک جاتا ہے اندھیروں میں، جب پیٹ کی آگ انسانوں کے ذہن اور ان کی روح کو دبوچ لیتی ہے، جب مال و دولت، مکانوں اور سامانوں کی بے پناہ حرص، اولاد کیلئے لوٹ مار کا بازار گرم کرنے کا خوفناک چہرہ اور اقتدار کی ہوس انسانی اقدار اور صلہ رحمی کا تاراج کرتی ہے، تب چاند نمودار ہوتا ہے بنی نوع انسان اور حیات کو اندھیروں کی آگ سے بچانے کیلئے اور اپنی تابناک روشنیوں سے کشش کرتے ہوئے۔ پھر جامی گانے لگتا [illegible] است این یا قمر یا لالۂ حمر است ایں"۔ اور یہ چاند حسن جانِ جاناں دنیا و عقبیٰ بن کر ایسے کھلنے لگتا ہے [illegible] ہے کہ اس کا ماتھا زرق برق شعاعوں کا اجتماع بن جاتا ہے تب اسے جبین تابدار کہتے ہیں اور ز[illegible] کروڑوں حسینائیں اس پر ریجھ جاتی ہیں، کچھ تو بدحواسی کے عالم میں اپنے ہاتھ ہی کاٹ ڈالتی ہیں اور یہ چاند اپنے جمال سے عالم انسانیت کو ہی منوّر نہیں کرتا بلکہ مٹی کے تودوں، چٹانوں اور پتھروں، گھاس پھوس کے بکھرے ہوئے کوڑوں اور کرکٹوں کو بھی اس قدر سندر بنا دیتا ہے کہ سندریاں اور سندر شرم و حیا اور عزتِ مردانگی بھول جاتے ہیں اور اس کے نور سے کھیلنے لگتے ہیں، چوری چھپے ہی سہی، پردوں میں رہ کر ہی سہی، ٹٹی کی آڑ میں ہی سہی۔ یہ نہ کہنا کہ اربوں کھربوں، چھوٹے بڑے، پیلے ہرے، وضع داری سے بنے ہوئے پودوں اور درختوں کے پتّے یا ان کے بیچوں بیچ بنی ہوئی شاخیں اور ڈالیاں اس کے نور سے محروم ہیں! ہرگز نہیں! پھر چاند چاند نہیں، رحمت کا دھارا نہیں۔ اس کا جمال آنکھ مچولی کھیلتا ہوا، اچھلتا ہوا، پھسلتا ہوا، پتّوں اور شاخوں کے بیچوں بیچ نکلتا ہوا آبوں کے ساتھ، آبوں کے گہواروں کے ساتھ، آبشاروں کے ساتھ اور فواروں کے ساتھ کھیلتا ہوا نہ جانے کتنے صاحبانِ ذوق وشوق کو للچاتا ہے اور اپنی رحمتوں کی آغوش میں لے لیتا ہے مگر بچے چاند کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ اسے چندا ماموں کے نام سے پکارتے ہیں۔ چاند گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور اڑتے ہیں۔ بچوں کو، معصوم بچوں کو جوڑنا سکھائے اس سے بڑھ کر کون۔ محمد مصطفےٰ صلعم بھی بچوں سے پیار کرتے تھے اور بچے ان سے۔ ہمارے صاحب بھی بچوں سے بہت پیار کرتے تھے، ان کے ساتھ کھیلتے تھے، انہیں کافی لفٹ دیتے

پھر بھی اے ماہِ مبین میں اور ہوں تو اور ہے　　　درد جس پہلو سے اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے

اقبالؔ

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام [illegible] چیزے دیگری

نقش وفی بندد فلک کس را نداند این نمک [illegible] فرزند آدم یا پری

تھے۔ وہ تو تقریباً ان کی گود میں بیٹھتے تھے، اتنے نزدیک بیٹھتے تھے کہ لگتا تھا کہ وہ صاحب سے ڈرتے نہیں۔ معصوم جانیں ڈرتی نہیں اسلئے کہ ڈر انہیں لگتا ہے جن کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔ چاند کا ایک اور رُخ یہ کہ ستاروں کی محفل میں دور سے دکھائی دیتا ہے، اکیلا جیسا لگتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ خاموش رہتا ہے محفل انجم میں، اسلئے نہیں کہ اس کی روشنی اپنی روشنی نہیں بلکہ اسلئے کہ سب تارے اس کے ارد گرد گھیرا لگائے ہوتے ہیں اور وہ اکیلا، تنہا ان کا تماشہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ہجوم انجم چاند کا عاشق، اسلئے چاند کو شعور نفسِ معشوقی ہے۔ عاشق ہی ریجھتا نہیں اپنے محبوب پر، محبوب بھی اپنے عاشق کیلئے تڑپتا ہے۔ اور یہ محبوبی تڑپ عاشق کو جاں سے مار ڈالتی ہے اس کا سب کچھ لُٹاتی ہے، جیسے میرے صاحب نے میرے چاند نے میرا سب کچھ لوٹ لیا، میری جان بھی۔ اور میں اس حالت پر بہت خوش کیونکہ میں نہ رہا، وہ رہے۔ ماہ و انجم کی داستان کا ایک اور پہلو یہ کہ عالم بالا میں سب الگ الگ۔ اپنی سرشتوں، اپنی خصلتوں، اپنی مزاجی گرمیوں، اپنی تابناکیوں میں مست مست کثرت کا عالم آباد کئے ہوئے ہیں اور کسب نور کرتے ہیں۔ مگر یہاں زمین پر صاحب کے نازنین وجود میں وحدت کے عالم کے ساتھ گھل مل گئے ہیں اور ان کی جمالی بارگاہ میں اپنا حصۂ جمال پیش کر رہے ہیں۔ واہ باہر اتنا وسیع عالم ماہ و انجم اور اتنا بڑا سامان رنگ و نور اور یہاں ان کے وجود کے اندر بارگاہ جمال کا صرف ایک پہلو! وسعت و اعماقِ (depths) جلال و جمال، سبحان اللہ!

جب سے ازل سے کن فیکون کی آوازیں گونج اٹھی ہیں، اس کائنات، اس خلا میں سحر انگیز، پُر اسرار عجائبات موجود ہیں مگر ان کے اثرات ابھی پوشیدہ ہیں گو کہ انقلاب انگیز ہیں۔ اس دل مبارک کی تابناکیوں کا کیا عمل اور ان کی جبروت کا کیا کمال کہ بس خاموشی طاری ہے گو کہ سب کچھ محسوس کر رہے ہیں اور جانچنے کی

My vagrant eye
Did ne'er descry
A fairer form than thine:
Is it of earth?
or heavenly birth?
Or Fairy's, half divine?
The world I rov'd,
And frequent lov'd
Those charms which all adore:
Maids who excelld
I oft beheld-
But thou art something more.

Translated : J H Hindley

مزید مزید گنجائش موجود ہے۔ پھر بھی سبحانك ما عرفنا حق معرفتك کی آوازیں اندر ہی اندر کروٹیں لیتی ہیں۔ جب سینہ الم نشرح ہو جاتا ہے اور چاک چاک، جب فرش سے عرش تک تعلقات قائم ہو جاتے ہیں، ایسی وسعتوں، ایسی گہرائیوں اور ایسی گنجائشوں کا عالم بھی دھیرے دھیرے پیدا ہوتا رہتا ہے اور اور اور عالموں کو اپنے اندر سمانے کی قوت پیدا

نالندہ تیرے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خون ریز کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبالؔ

کرتا رہتا ہے۔ کیا عالمِ جذب ہے یہ، کیا حسن، کیا جمال اور کیا توفیق! صاحب یونہی دل ربا [illegible]
ماہ و انجم کی حکایات ادھوری جب تک اس عالم ماہ و انجم کا بیان نہ ہو جو صاحب کے [illegible] بلو

گر ہے اور یقیناً گرِہ میانہ دربار شاہ سوندری کی خاصی وضاحت کرتا ہے، محتاط زبان میں ہی سہی۔ باہر کے ماہ و انجم اس دنیائے انجم و ماہ کے سامنے ہیچ نہ سہی، ہیچ پیچان ضرور ہیں۔ یہ عالم سروساماں عشرت دائمی ہے اور انسان کی روح کی نشاط انگیز سدا بہار! مگر صاحب کی داخلی محفلیں شمسی بھی ہیں اور قمری بھی اور ایک ہی شمسی نہیں ایک ہی قمری نہیں۔ لاتعداد محفلیں ہیں جن پر اگر خام عاشقوں کی نظر پڑے تو وہ ان کی نذر ہو جائینگے۔ ان محفلوں کی اربوں داستانیں ایسی ہیں جو ابھی لکھی نہیں گئیں۔ اگر عاشقی صبر طلب بھی نہ ہوتی اور تمنائیں بھی بے تاب نہ ہوتیں تب بھی جلوہ ہائے رنگارنگ کا نیا پن تجسس کا باعث ہوتا اور ضرور ہوتا۔ نیا پن اپنی انوکھی داستان لئے ہوئے آتا ہے۔ ہر پردے کے پیچھے ایک نئی دنیا ہوتی ہے جو حیرت میں ضرور ڈالتی ہے۔ حیرت بڑے بڑوں کو بھی خاصے وقت کیلئے محو خیال رکھتی ہے اور فکر کے چرخے گھمانے پر اکساتی ہے۔ بارہ گاہ احد کے نت نئے جلوؤں کی طلب پیغمبروں، ولیوں، درویشوں

اور ملنگوں کی میراث ہے۔ یہ حیات کا ازلی سرمایہ ہے اور اسی سے کل یوم ھو فی شان کی عظمت ٹپکتی ہے۔ اس میں جمال و جلال کے شیدائیوں کی دلچسپی ہے اور دل بستگی بھی۔ اسی میں آرام دل و جاں ہے اور آرام کو ہلا دینے والے نت نئے عجائبات بھی۔ یہ سرمایہ اس لازوال اور بے انتہا عالم کی طرف دوڑنے کیلئے چابک مارتا ہے جسے عالم انفس کہتے ہیں۔ یہاں سب روحوں کا اجتماع ہے اور ملن بھی۔ یہاں ہی روحوں کی پراسرار باطنی دولت بھی ہے اور اس کی شناسائی بھی۔ کسی روح کے پاس کم دولت ہو، کسی کے پاس زیادہ، مگر دولت کے بغیر کوئی روح نہیں۔ صاحب جیسے ملنگوں کیلئے روحوں کے ساتھ ملن ان کے شوق و ذوق اور ان کی تشنگی کو ہردم بھڑکاتی ہے۔ ان کی نفسی اور آفاقی کائنات ہردم جواں ہوتی چلی جاتی ہے، ہر پل نئی آن، نئی بان اور نئی شان کے ساتھ اور اور کھِلتے کے اور اور کھُل کے سامنے آتی ہے اور اسی طرح زندگی کا ہنگامہ شان کے ساتھ قائم ہے! زہے شان!

سماوات سے اُتر کر زمین کا رخ کرنا لازمی، یہ دیکھنے کیلئے کہ قدرت نے مٹی میں کیا گل کھلائے ہیں اسی طرح ابلیس کا نظریہ غلط ثابت ہوا ہے۔ اسی مٹی میں ہمارے صاحب نے بھی گھر بسایا اور ایسا گھر کہ فرشتے بھی لاجواب۔ و خلقنا کم ازواجا سے شروع کریں۔ کتنے کتنے جوڑے اور کن کن مخلوقات کے بکھرے پڑے ہیں اس زمین پر اور پھیلے ہوئے ہیں اس دھرتی پر۔ نباتاتی، حیوانی، انسانی جوڑے! ان میں تفاوت اور رنگینیاں! کنول کا پھول جوڑے کی برکت مگر پہاڑوں کے اوپر چھوٹی چھوٹی وادیوں میں یا نشیب و فراز میں چھوٹے چھوٹے خودرَو پھولوں کی کثرت لاکھوں جوڑوں کی داستانیں سنا رہی ہے۔ کوئی پھول سدا بہار لگتا ہے کہ بس اپنی جھاڑی یا اپنے شجر سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ میں دیرپا ہوں۔ کوئی بس کھِلا اور ختم۔ دوسرا دور سامانِ ثمر کا شروع۔ یہاں بھی جوڑے، وہاں بھی جوڑے مگر کسی نے اس طرح کھیل کھیلا کہ سدا بہار گل کھلائے۔ کسی نے اس طرح کہ کلی بھی مسکرائی اور زندگی نے بھی الوداع کیا۔ کوئی جوڑا گل آفتاب پیدا کرتا ہے جو جس طرف سورج چمکتا ہے اسی طرف مکھ موڑتا ہے۔ کوئی ڈالیا پیدا کرتا ہے جسے دیکھ کر
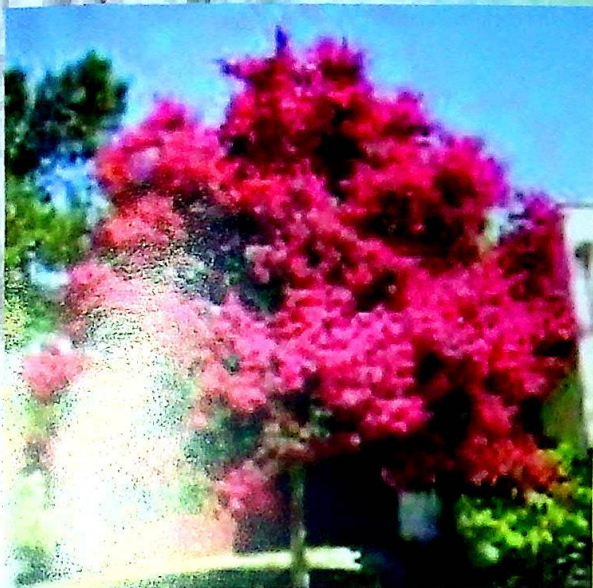
ہمیں باخس کی یاد آتی ہے، بڑا مخمور و مست دکھائی دیتا ہے گویا نشیلی آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر نرگس کی طرح آبدار آنکھوں سے نہیں۔ کوئی بہار کی رنگیلی، چنچل جوانی، نرگس کی طرح گھورنے لگتا ہے اور داستان سناتا ہے کہ ہم آنکھوں سے بند کرنے والے ہیں اور بغل گیر ہونے والے جب تک کہ گل کھلے۔ کوئی ریحان ہے جو اپنی خوشبوؤں کا کھیل رچا کر نر مادہ داستاں کو ابدی جامہ پہناتا ہے اس زمانے میں بھی یاد آنے کیلئے جو نہ گل کا زمانہ ہوتا ہے نہ مُل کا۔ کوئی گلاب، رنگیلا، بادشاہ سلطنتِ گل، بڑے چاؤ کے ساتھ شبنموں کی آرسی میں منہ دیکھتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ خاردار بسترِ گل بھی نر مادے کا کھیل کھیلنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اسلئے برگ در برگ، پیچ در پیچ، گل رُخ ہے اور خوش بو بھی! بالکل اسی طرح چھوٹے چھوٹے جراثیم، چھوٹے چھوٹے کیڑے زندگانی کا بھی مہیا کرتے ہیں، زندگی بھی کرتے ہیں، آرائش جمال میں بھی محو ہیں اور تخلیق میں بھی کارفرما۔ حیرانگی ہے کہ چیونٹی جب انسان کی زبان پر چڑھتی ہے تو مورِ ناتواں کہلاتی ہے مگر ہے وہ بڑی بہادر، بڑی والی، بڑی عقلمند کہ ہر وقت سو برس کا سامان بنانے میں مگن کہ کل کام آئے جب غار کا اندھیرا سامنے آئے باہر نکلنا دشوار۔ اسی مورِ ناتواں کو ہمارے صاحب نے ہمیں پڑھانے لکھانے کیلئے معمور کیا۔ کیا یہ سب چھوٹے چھوٹے جراثیم خدائیت میں حصہ لیتے ہیں ان سب مشغولیات کے آئینے میں؟ اڑنے والے پنچھی اس بارگاہ کے گویّے اور دنیائے جمال کے پکے شیدائی بڑے چالاک اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ مستعدی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں تو سلیقے سے، ان کو کھلاتے پلاتے ہیں تو حیران کن طریقوں سے، ان کی تربیت گاہیں کھولتے ہیں تو اطمینان بخش طریقے سے۔ گھونسلے بناتے ہیں تو احساس جمال سے کام لیتے ہوئے کہ جہاں کوئی بھی رنگین چیز دیکھی، کوئی نرم اور خوش آئندہ چیز دیکھی، گھونسلے کی تعمیر میں لگادی۔ پروں کی رنگینیوں پر اترانے والے یہ دودو پر والے گرد وغبار سے نہاتے ہیں مگر کوئی آب جو دیکھی، اس کے کنارے جا بیٹھے اور لگے اس کے شفاف پانیوں کے ساتھ کھیلنے اور پر دھونے اور وہ بھی سہاونی دھوپ میں جب سارا جمال الٰہی کھل کر جذبات کا کھیل رچواتا ہے ان سے اور ہم سے بھی۔ ہم انسانوں سے جو عقل کو بھی بالائے طاق رکھتے ہیں سہانی دھوپ میں نہانے کیلئے! یہ پنچھی خود بھی حسین ہوتے ہیں اور حسین چیزوں کو بہت پسند کرتے ہیں (خدا کی طرح؟ نعوذ باللہ کہنا ضروری؟)۔ حسن کے شیدائی یہ چھوٹے چھوٹے اڑتے ہوئے جمال کے مجسمے اپنی خوبصورت بولیوں سے بہار کا رنگ دوبالا کرتے ہیں۔ اور درود وثنائے الٰہی میں محو ہو جاتے ہیں۔ بہار کی

> جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ڈالیوں میں ہُد ہُد کی سرگمی تان گھوڑوں اور گھوڑیوں کو بھی جگاتی ہے تخلیقی ہنہناہٹ کیلئے اور کچھار میں شیروں کے پنجوں کے کھیل شروع ہوتے ہیں دنیا کو سمجھانے کیلئے کہ ہم وحشی سہی، بہادر اور غیور سہی مگر محبت کا راگ سن کر ہم بھی رام ہو جاتے ہیں اور چوہوں کی طرح اپنے جوڑوں کے ساتھ کھیل تماشا کرتے ہیں، کچھ مدت کیلئے ہی اگر چہ۔

جوڑوں کی رنگین بیانی بس اسی پر ختم نہیں ہوتی، زمین کی وسعتیں اور اس کی دار و گیر اس رنگین بیانی کا ہنگامہ ہے اور حشر انگیز قصیدہ۔ اس قصیدے کا ایک ایک شعر حسن و جمال کی نغماتی کیفیت ہے جس کے سننے اور جس کی تحسین کیلئے دھڑکتے ہوئے دلوں اور اُچھلتے ہوئے جذبات کی ضرورت ہے۔ سمندروں کا پانی چاند کی طرف دیکھ کر اُچھلنے لگتا ہے اور یہ آفاقی کشش اور رمزی توانائی کی ایک دلیل ہے۔ اسی طرح نغمۂ جمال جو جوڑوں کے کھیل تماشے میں محفوظ بھی ہے اور مبین بھی، جذبات کی اُچھل کود کا دل موہنے والا عالم ہے۔ اس بارگاہ حسن و جمال کو دیکھ کر فرشتوں کی زبان سے سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا دفعتاً نکلتا ہے۔ اگر ہم اس بیان میں آگے

میں بھی تری دھن پہ گاؤں گا بہاروں کیلئے
میں بھی نغموں میں بھروں گا رنگ نظاروں کیلئے
میں بھی تری طرح کرلوں گا ثنائے ذاتِ حق
رقتوں کے جام چھلکیں اشکباروں کیلئے
ڈالی ڈالی تیری اُچھل کود کتنی دلنواز
باغ میں گھوموں گا میں بھی گل عذاروں [illegible]
طائرِ خوش لحن ہو تم مجھ کو ہے سرگم کی [illegible]
گائیں لافانی ترانے پختہ کاروں [illegible]
میرے دل میں ہے خلش تو بھی شہیدِ آرزو
آ گلے مل مل کے گائیں دل فگاروں کیلئے
رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے زندگانی دل فریب
چار دن ہم بھی جئیں گے دوستداروں کیلئے
تم تو ہو آزاد پنچھی میں اسیرِ قید و بند
پرکمند میں پھینکتا ہوں چاند تاروں کیلئے
تیری طرح میں بھی اڑنا جانتا ہوں پنچھیو
کھلتے ہیں پر معنیوں کے ہوشیاروں کیلئے
بارگاہ پھولوں کی آئی دیکھنے خوش دل شفا
ہم بچھائیں راستوں میں جان پیاروں کیلئے

حبیبؔ

بڑھنے کی کوشش کرینگے تو تجلی کے فروغ سے ہمارے پر بھی جل اُٹھیں گے۔

اب ہم انسان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ انسان پر رحمان کے رحمانی وار تو کچھ زیادہ ہی چلتے ہیں اور زیادہ کام بھی کراتے ہیں۔ قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے بیان ہوئے ہیں۔ ایک قصہ تو احسن القصص کہلاتا ہے اور بہت گہرائی اور معنویت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دوسرا قصہ بھی کچھ کم نہیں۔ ایک قصے میں زلیخا بے قابو ہو جاتی ہے اور مصر کی زبان دراز مگر شریف عورتیں تو ہاتھوں کو ہی شہید کر ڈالتی ہیں۔ دوسرے قصے میں بلقیس سلیمان علیہ السلام کے سامنے بے بس۔ اسے تو شیشہ شیشہ پانی ہی پانی نظر آتا ہے اور وہ اپنی پنڈلیاں کھولتی ہے۔ جامیؔ نے احسن القصص کو تو اور بھی پھیلا دیا اور اس کے ذریعے مجاز کی باطنی حقیقت بھی کھول کے رکھ دی یعنی مجاز کو حقیقت کے ساتھ اس طرح ملایا جس طرح آنکھ اپنے نور کے ساتھ ملتی ہے۔ ایران کی عرفانی سرزمین کے ایک اور عارف نظامی گنجوی نے خسرو و شیرین لکھ کر عاشقی کا چہرہ فرہاد کے لہو سے پھر گُل گوں بنا دیا۔ فرہاد پہاڑ نہیں کاٹ رہا تھا، وہ اپنے وجود کے مشکل ترین مراحل طے کر رہا تھا۔ وہ وہی کام کر رہا تھا جو بت شکن کرتے ہیں۔ وہ وہی پیغمبرانہ فرائض انجام دے رہا تھا جو دورِ جدید کے بتوں کی شکست و ریخت کیلئے درکار ہیں۔ اس نے بت توڑ توڑ کر اپنے وجود کے اندر پانی کی نہر ہی نہیں بلکہ پانی کے جھرنے بہائے تھے، گاتے ہوئے، بل کھاتے مچلاتے ہوئے جھرنے۔ ان جھرنوں کے سوز و ساز و سرود پر ہمارے لطیف جذبے قربان۔ ہمیں بھی سنگلاخ زمینیں کٹوا کٹوا کر ایسی ہی آب جوئیں بہانی ہوں گی تا کہ ہماری زندگی بھی اس نمرودی دور میں سپھل ہو جائے اور ہم اس ضررِ روح سے بچ جائیں جو ہماری زندگی کو اسفل السافلین میں دفن کر دیتا ہے اور ہمیں زخم ہائے روح سے بچنے کیلئے سونے چاندی، لعل و جواہرات، اقتدار اور استحصال کی ہوس پر مائل کر دیتا ہے۔ اگر چہ یہ میلان طبع ہمارے زخموں کو اور بھی گہرا بنا دیتا ہے۔ اور ہاں شیرین خسروی سلطنت کی ملکہ تھی اور خسرو کو چاہتی بھی تھی۔ ایک سنگ تراش یا تیشہ چلانے والا مزدور اس کی آرزو کرے، یہ کیسی حماقت تھی یا اپنے حدود سے باہر نکلنے کی فضول کوشش۔ مگر عزم صمیم کے سامنے نہیں، عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے نہیں، ذوق و شوق کے سامنے نہیں۔ ذوق خون آشام ہو تو ہو مگر ستاروں پر کمند پھینکنے کی اہلیت رکھتا ہے اور ”یزداں بہ کمند آور اے ہمت
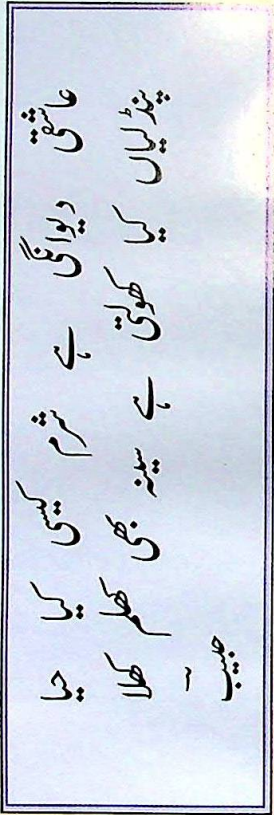
> عاشقی دیوانگی ہے شرم کیسی کیا حیا
> پنڈلیاں کیا کھولتی ہے سینہ بھی کھلم کھلا
>
> حبیبؔ

> وا کردئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
> غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
> غالبؔ

مردانہ" حفظِ جان کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ اس میں وہ لیاقت ہے کہ نجد کی ویرانیوں سے گذرتے گذرتے رخِ زیبائے لیلیٰ ریت کے ذرے ذرے میں مشاہدہ کرسکتا ہے۔ رحمان کے وار کب نہیں چلے؟ تب بھی جب شیخ صنعان بقول حضرت شیخ فرید الدّین عطّار عیسائی دوشیزہ کے عشق میں گرفتار ہوا اور اپنے پیروں اور مریدوں کی پروا کئے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلا یہاں تک کہ دوشیزہ نے سوروں کی دیکھ بال شیخ صنعان ... شیخ سور پالنے لگا مگر یہ اس کے عشق کا امتحان تھا اور اسے اس مرحلے سے گذرنا تھا۔ سب خدا ... دامانِ صنعان نے اسے چھوڑ دیا، اس کے ساتھ ترکِ موالات کیا مگر شیخ نے عشق کا دامن نہ چھوڑا ... کی رحمت سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مدد کی اور وہ اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دوشیزۂ صنعان نے بلقیس کی طرح شیخ کی روحانی عظمت کا لوہا مانا اور شیخ پھر واپس آ گیا۔ ایک اور مثال شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی ہے جو نظام پر ریجھ گیا جس طرح کشمیر کے مقبول شاہ کرالہ واری کا عجب ملک ... پہ ریجھ گیا، جس طرح کشمیر کے شعبان ڈار اور احد زرگر کی گل اپنے شہنشاہ صنوبر پر اس قدر مسلّط ہوگئی کہ صنوبر گل گل کہتے کہتے عجیب مگر لازمی مخمصے میں گرفتار ہوا۔ مگر ابن عربی نے ترجمان الاشواق کے صفحے اس طرح کھول کر رکھ دئے کہ عشق و محبت کے افسانے عظیم بن گئے اور انہوں نے مذاہب کے رموز وا کردئے۔ انہوں نے بہ بانگ دہل کہہ دیا کہ "خدا ہم در تلاش آدمے ہست" کی حقیقت مجازی دشواریوں سے ہی کسب کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ نظام شیخ اکبر کے لئے حسن و عشق الٰہی کا مجسمہ بن گئی اور روحانی تکمیل بھی (heavenly perfection) اگر چہ نظام انسان تھی اور وہ بھی نسائی روپ میں! یہ چند قصّے جن کا حوالہ یوسف زلیخا سے لیکر ترجمان الاشواق تک دیا گیا، مجاز و حقیقت اور عشق و محبت کا دلچسپ سفر ہے، مدعا یہ ہے کہ اس سفر کو طے کرنے کیلئے لوگوں کی مدد کی جائے اور وہ بھی پر کشش قصوں سے۔ ایسے قصے اور اور جگہوں پر مختلف زمانوں میں اور لوگوں نے بیان کئے ہیں اور عشق و محبت کے گل و گلزار اور بھی رنگین بنادئے ہیں۔ ان قصوں میں اشارے ہیں، کنایے ہیں، پردوں میں باتیں کی گئی ہیں مگر حسن و عشق کے خارزار میدان سر کئے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ قصے لکھے ہیں ان کو بھی ان مراحل سے گزرنا پڑا ہے جو دشوار گذار ہیں اور عشق کی عظمت کا بیان دیتے ہیں۔ مراحل طے کرتے کرتے انہیں اُسی بارگاہ کی غنائی رحمتوں کی آشنائی حاصل ہوئی ہے جو اب صاحب کی بارگاہ کہلاتی ہے اور جس کا فیضان

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ
سعدیؔ

ہم حاصل کررہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ عشق ایک آگ ہے جو ہر غلاظت کو جلا دیتی ہے، یعنی ماسوائے اللہ کو مگر جلاتے جلاتے عاشق کو بھی خاکستر کر کے چھوڑتی ہے۔ باقی جو ہے وہ ہے جوہرِ ناز جو گلوں کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ باقی جو ہے وہ ذوالجلال والاکرام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے صاحب بھی جمال اور جلال کے پیکر ہیں۔ شوق سے ان کو دیکھئے تو ذوق سے اُنہیں پرکھ لیجئے، وہ تو اپنا سب کچھ کھلم کھلا سب کے سامنے رکھے ہوئے ... کوئی پردہ نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر ہمیں دکھائی نہ دے، تو قصور ہمارا۔ اگر چمگادڑ دن دھاڑے دیکھ نہ ... ور اس کا نہ کہ والشّمس والضحیٰ کا!

بارگاہ جمال میں فن کی بڑی قدر ہے کیونکہ فن بے پناہ حسن و جمال کا خزانہ ہے اور خستہ دلوں کا نالہ و ... ایسی زباں میں جسے صرف فن کے ماہر اور عاشق سمجھ سکتے ہیں۔ یہ نالہ وفریاد نہ سماج سن سکتا ہے اور نہ وہ تہذیب وتمدن جو انسان کا خون چوستا ہے اور خون آشامی سے اپنے آپ کو رنگین بنادیتا ہے۔ دنیا میں بہت ... لوگوں نے تہذیب وتمدن کی آزار پہنچانے والی صورتوں کی نشاندہی کی ہے۔ کئی لوگوں نے مثلاً صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تاج محل میں بھی انسان کے خون کی بو آتی ہے، خاص کر ان لوگوں کے خون کی جن کے فنکارانہ ہاتھ تاج بنانے میں کام تو آئے مگر نام نکلا شاہ جہاں کا۔ فن کا یہ پہلو جو فن کار کو چوستا ہے ہم فی الحال ملتوی رکھتے ہیں۔ اتنا کافی ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں لوگوں نے جو فنّی کرتب دکھائے ان میں ایک طرف ان کے نالے تھے، ان کی بے بسی اور بے کسی تھی، دوسری طرف سماج اور تہذیب کے دباؤ جو اپنی رسموں اور روایات کی بقاء اور ان کے تحفظ کیلئے انسان کا خون حلال گردانتے ہیں۔ صاحب ایسے لوگوں کی دست گیری کرتے ہیں جو پوشیدہ جمال سے پردہ اٹھانے میں لگے رہتے ہیں اور ساتھ وہ دباؤ کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جمال ظہور گوارا نہیں کرتے۔ صاحب کی دستگیریٔ فن اسلئے بھی قابل ستائش کہ اس سے فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں اور جمال کی دنیا نکھر کے سامنے آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فن کاروں کے ہاتھ بھی مضبوط ہوتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ قوّت حاصل کرتے ہیں۔ ایسی قوّت کو عرفان کی زبان میں جبروت کہتے ہیں۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ فن صرف مسلمانوں کا خصوصی حق نہیں، ان کی خصوصی جائیداد نہیں۔ اگرچہ انہوں نے فن تعمیر، خطاطی، نقاشی، بافندگی، مصوری، سنگ تراشی اور موسیقی کے علاوہ دنیائے ادب میں خاصا نام پالیا ہے،

فتبارك الله
احسن الخالقين
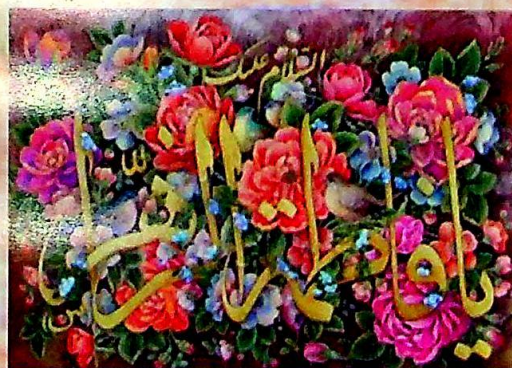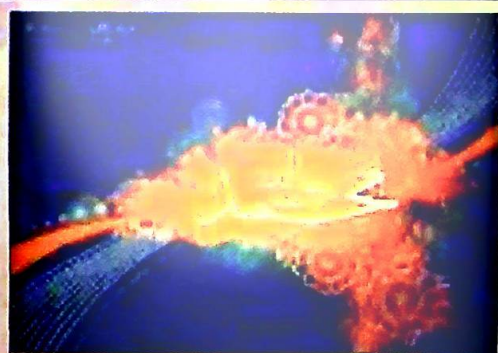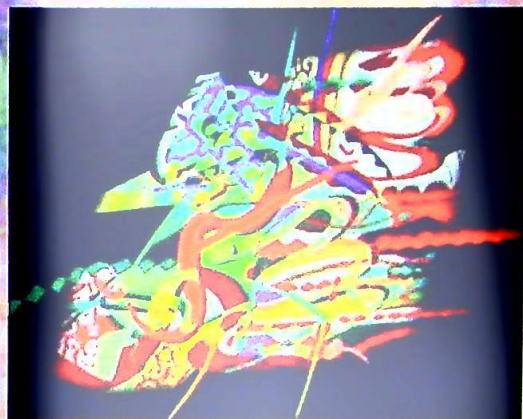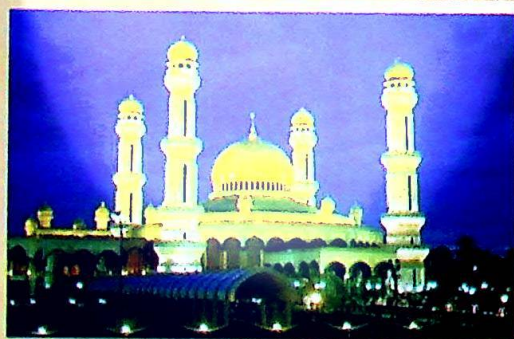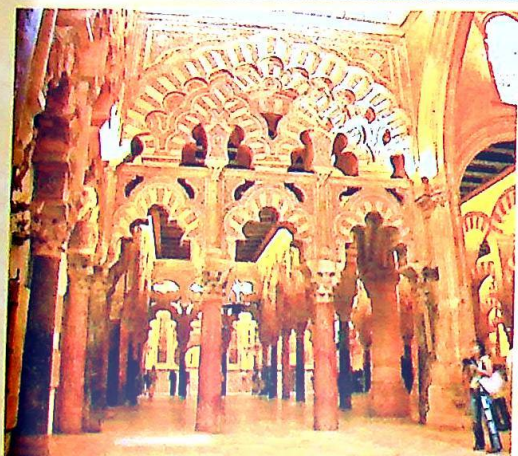
تاہم دیگر اقوام نے بھی مصوّری، موسیقی، سنگ تراشی، تعمیر، رقص اور ادب میں حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں۔ مسلمانوں کی مسجدیں، حمام، باغات، محلّات ابھی بھی تاریخ میں اپنا جھنڈا لہلہا رہے ہیں اور ان کی برتن سازی، برتنوں اور کپڑوں پر نقاشی، قالین بافی، پشمینہ سازی اور قلم کاری روح کی عجیب وغریب دنیا اور عالم آفاق کے حسن کی نقالی کا اتا پتا دیتی ہیں۔ حسن کا گہرا احساس، حسن کاری، تناسب، اعتدال، امتزاج، صفائی، نزاکت، تخیل وتصور اور ان سب جمالی خصوصیات کا زمان ومکان کی حدوں کے اندر اور باہر رنگا رنگ یا بوقلمون ملاپ روحانی کمالات کی ایک ایسی کتاب ہے، جسے صاحب بار بار پڑھتے ہیں، جانچتے ہیں اور مغرور لوگوں کی عقل وفہم کو تحیّر میں ڈالتے ہیں خصوصاً جب وہ فنکاری کے صحیح رخ متعین کرتے ہیں اور فنکارانہ صلاحیتوں کی نشوونما میں اور تیزی لاتے ہیں۔ دوسروں کے ساز اور سازوں کی آوازیں جب ان کے من [illegible] آوازوں کے ساتھ مل جاتی ہیں، جب ہر طرف حسن کے عالم ہائے رنگارنگ بولنے لگتے ہیں اور سارا گردوپیش ان کا مطیع ہوجاتا ہے، تب تاڑنے والوں اور مشاہدہ کرنے والوں کی زندگی میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہوں گے۔ جذبات، احساسات اور فن میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور جمالیات میں چار چاند لگانا اس مردِ قلندر کی ایسی کرامت ہے جسے وہ لمحات ضرور یاد کرتے ہیں جو انہوں نے راستوں پر گذارے یا بیٹھے بیٹھے ان جگہوں پہ جو موجود ہیں اور جو ان کی یادگار بن گئی ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

غالب

کشمیریوں نے روح کی عجیب وغریب دنیا میں گھسنے کیلئے فن سے اچھا خاصا کام لیا ہے۔ برتنوں، اخروٹ کی لکڑی، پشمینے کے شالوں پر انہوں نے جو نادر فن کاری دکھائی ہے اس میں ان کی روح کا عکس ملتا ہے، ان کے احساسات، جذبات، تخیلات ملتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کے رویّوں کی طرف کھڑکی کھلتی ہے، ان کے ذہن کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی داخلی موزونیت کا پتہ چلتا ہے۔ ٹھٹھیرا جب اپنی چھوٹی سے بسولی لیکر تانبے پر کندہ کاری شروع کرتا ہے تو اس کی توجہ، اس کے صبر، اس کے استقلال کا حال معلوم ہوتا ہے وہ نقش ونگار ہی نہیں بناتا بلکہ سمرقند کے کندہ کاروں کی طرح اپنے آپ کو بھی اپنے فن میں انڈیل دیتا ہے۔ اسی طرح قالین باف کا رنگین دھاگوں سے دھیرے دھیرے کھیلنا، پھر آہستہ آہستہ نفیس ونازک شکلیں یا مناظر یا الفاظ و آیات بُننا اس کی خلاقی (creativity) کی ایک پُراسرار دنیا ہے جو اپنے آپ کو قالین کے اندر بُننے کے مترادف ہے۔ پھر نرم ونازک پشمینے پر اپنی چھوٹی سی سوئی کمر دوگنی کرکے، آنکھیں جما کر، قدرت کے مناظر اور گلکاری کے نمونے ذہن میں رکھتے ہوئے گُل بوٹے بنانا اور اس کے ساتھ ساتھ رسول میر، محمود گامی یا احمد بٹواری کے عارفانہ اور عاشقانہ گیت گنگنانا عارفوں کیلئے بہترین ضیافتیں ہیں اور فنکار پشمینہ سازوں کے دلوں کی آوازیں ہیں۔ میں نے پشمینہ ساز اسلئے استعمال کیا کہ اس پر فنکاروں کے خون کی رنگین کہانیاں ہیں جو لیلےٰ مجنوں اور وامق عذرا کی کہانیوں سے کچھ کم نہیں اسلئے اصلی پشمینہ اُون سے نہیں، پشم سے نہیں، خونِ جگر سے بُنتا ہے۔ پھر کشمیر کے نجاروں کی بازی گری۔ نرم لکڑی پر مکانات تعمیر کرتے کرتے روحانی اسرار کا انکشاف کرتے ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں کے پنجرے بناتے ہیں گویا کہ شرمیلی حوریں چوری چوری ان کی آڑ میں جھانک کر اپنے لطیف جذبوں کی آبیاری کریں گی اور اپنی جنت سرسبز کرتی رہیں گی۔ کمروں میں طاقچے بناتے ہیں جو بقول مرزا غالب بھولی ہوئی رنگ رنگ بزم آرائیوں کی آرام گاہیں بن جاتی ہیں۔ محرابین بناتے ہیں جو قاب قوسین او ادنیٰ کی یاد تازہ کرتی ہیں اور عاشقوں کو معراج کے اسرار سر کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ چرخے بناتے ہیں اور چرخوں پر رنگ چڑھاتے ہیں تاکہ ہندوستان سے آئی ہوئی پدمنیاں احمد بٹواری اور رحیم صاحب سوپوری کی صوفیانہ شرابیں انڈیلے چرخوں کی موسیقیت سے اپنے گرم گرم دلوں کی آبادکاری کا کام کرتی ہیں۔ چرخوں پر بسولی سے نقش بناتے ہیں جن میں چرخہ کاتنے والیاں اپنے دل کے چھپے چھپائے نقش دھاگہ بناتے بناتے دیکھ لیتی ہیں۔ مگر

ایسے فنی کام صرف کشمیر میں نہیں ہوتے جہاں وسائل کی کمی سینکڑوں برسوں سے چلی آئی ہے اور خود غرض حکمرانوں کی بے اعتنائی اور زور زبردستی۔ فنکار دنیا میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، سمرقند، بخارا اور ایران میں بھی جو فنونِ لطیفہ کا گہوارہ ہیں اور جن کی مدح سرائی میں حافظ شیرازی جیسے غزل شاہ بھی رطب اللسان ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندی خال کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ بھی سنجیدہ عرفانی حقائق کے پیش نظر! سمرقند کی تعمیرات کے علاوہ وہاں کے برتن اور خاص کر ہاتھ سے بنائے ہوئے زیورات جن میں پتھر بھی استعمال ہوتے ہیں، عرفان کی دنیا میں قدر و قیمت سے دیکھے جاتے ہیں۔ عورتوں کا پتھروں کے زیور پہننا انسانی لہو کی داستان بھی ہے اور اسرارِ رحمانی کی گہرائیوں کا سامان بھی۔ فن تعمیر نے تو ہر جگہ ہر زمانے میں انسان کی روح کی معراج دیکھی۔ عیسائیوں، رومیوں، چینیوں اور مسلمانوں نے گنبد بنائے، وہ بھی طرح طرح کے اور رنگ رنگ کے [illegible] جس طرح آسمان میں اڑنا سیکھا، اس طرح نہیں جس طرح جانور اُڑتے ہیں خاص کر گدھ اور چیل بلکہ جس طرح عارف اور اولیاء، صوفی اور انبیاء اڑتے ہیں، اسرار الٰہی معلوم کرنے کیلئے اور انسانی زندگی کو کوزے میں [illegible] زاد کرنے کیلئے۔ مسجدوں کے گنبد تو سارے عالم ایران، ہندوستان، ترکی اور وسطِ ایشیا میں میناروں اور پتھروں کے ستونوں کے ساتھ ساتھ دھوم مچا رہے ہیں اور فکر و وجدان کی عظمت کا بول بالا کر رہے ہیں۔ مسجد اقصیٰ اور گنبدِ خضرا کے گنبد آسمانی رفعتوں کے شاہد ہیں اور اسرار و رموز حیات و کائنات کی موشگافی کر رہے ہیں، ایمان والوں کیلئے، شوق و ذوق کی نعمتوں سے سرفراز لوگوں کیلئے، دل والوں کیلئے، پیغمبروں کی پیغامات وحیات کو دل کے ساتھ لگانے والوں کیلئے، اسرارِ الٰہی کے نشے میں شرابور دوستاں خدا اور حق پرستوں کیلئے۔ ان گنبدوں میں پیغمبروں کی شان ہے اور ان کے انقلاب انگیز افکار۔ ان میں نجات کے راستے پوشیدہ ہیں اور حیات کی روز افزوں ترقی کے امکانات۔ یہ اللہ ھو کے ساتھ اللہ اللہ پکارتے ہیں اور اللہ اکبر۔ ان سے شہادتوں کی شعاعیں چھوٹتی ہیں جو کائنات کو روشن کرتی ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان کے فیضان سے منوّر ہیں۔ پھر یہ کہ پتھروں سے تراش تراش کر ستون بنانا، ان کے ذریعے نکتہ رس عارفوں کیلئے مساجد تعمیر کرانا اور پھر اسرار و رموز بیان کرنا انسانی عقل و فہم اور اس کے فکر و فن کا معجزہ ہے۔ اسی طرح سنگ مرمر کے جال بنانا یا چھوٹے چھوٹے شیشوں کی مدد سے محرابیں بنانا ان زاہدوں اور ملاؤں کی شکست ہے جو حرکی ذہن سے محروم ہیں اور خود ساختہ ریتوں اور رسموں سے انسانی روح کے پنپنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور اپنی اجارہ داریوں سے انسانی عظمت کا خون کرتے ہیں۔ مسجد جامی یا خصوصاً مسجد قرطبہ فن تعمیر کی معراج تو ہیں ہی مگر ان میں فنی نزاکتیں استعمال ہوئی ہیں، فکری اور تخلیقی جدّتیں کام میں لائی گئی ہیں، جن کی مدد سے فنی حسن و جمال کے ساتھ ساتھ

حسن دماغ کے نادر نمونے بھی سامنے آتے ہیں۔ ریاضی اور حکمت سے کام لیتے ہوئے وحدت فکر اور دینی تصورات کو مقرون صورت میں باریکیوں سے بھی سمجھایا گیا ہے اور تعمیری اجزاء سے بھی۔ اگر اس عہد کے تیل بیچنے والے مسلمان جو بے انتہا دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں فنّی نزاکتوں کو روح کے ساتھ منسلک کرنے کی تخلیقی کوششیں کرتے، ان مساجد پر تحقیق کراتے تو اسلام کا ایک تابناک اور درخشاں رُخ سامنے آتا اور غیر مسلم بھی اسلام کی طرف تخلیقی اور تعمیری اعتبار سے متوجہ ہوجاتے اور تجسّس اور حق پرستی کے کام میں معاون ثابت ہوتے۔ ساتھ ساتھ مسلمان بھی ذلّت اور تباہ کاریوں سے نجات حاصل کرتے اور ایک مثبت رول ادا کر کے نئی دنیا بنانے میں لگ جاتے جو شاید مسیح موعود کیلئے سازگار ماحول قائم کرپاتی۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی اقوام بالواسطہ طور پر بہت حد تک اسلامی شعور اور اسلامی حرکی تمدن سے استفادہ کرتے ہیں مگر روح کی گہرائیوں میں مادہ پرستی اور اقتدار کی ہوس کی وجہ سے ان کی دلچسپی بہت کم ہے۔ صاحب کا جمالی وجود حسین روح کی عمیق گہرائیاں ہیں، سب اقوام خاص کر مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیتا ہے تاکہ عرفان کے جام تیز تیز پئے جائیں اور آراستگی جہانِ ظاہر و باطن کی مساعی اور زیادہ حرکت میں آئیں!

ہم نے استنبول کی سلطان احمد مسجد کا جسے نیلی مسجد کہتے ہیں، پاکستان کی بادشاہی مسجد کا، پاکستان کے شاہ رخ العالم مقبرے کا، مالی کی مسجد کا، الاظہر مسجد کا، تاج محل کا، لال قلعہ کی موتی مسجد کا، جامع مسجد دہلی کا اور ایسی ہی بہت تعمیرات کا ذکر نہیں چھیڑا، نہ ہم ایران گئے خاص کر شیراز، اصفہان اور مشہد، جہاں کے ہاتھ تعمیرات میں اس طرح حسن پیدا کر گئے کہ ایران کی سرزمین آسمان کی بلندیوں کو چھوگئی۔ ہم چین، روس، وسط ایشیاء، یورپ اور جاپان بھی نہ گئے جہاں بھی انسانی روح کی عظمت کے شاندار شواہد ابھی بھی موجود ہیں۔ ہم نے ہندوستان کی سرزمین کی فنی نزاکتوں کی بھی نہ وضاحت کی نہ سراہنا اسلئے نہیں کہ ہمیں اس ملک کے تقدس کا احساس نہیں، اس کا احساس تو میر عرب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تھا اور گہرائی سے۔ ہم نے ان باتوں کی تفصیل اسلئے نہ دی کہ اس طرح طوالت میں پڑتے اور احد بب کو چھوڑ کر کہیں اور جاتے۔ مگر ہم ضرور ذکر کریں گے اس عظیم دولت کا جسے ادب کہتے ہیں یا لٹریچر مگر اس میں شعر و شاعری زیبائش اور گہرائی معنی کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ دنیا میں شکسپئر کے علاوہ اور بھی عظیم شاعر ہیں مثلاً دانتے، گوئٹے، چاسر، کالی داس، ٹیگور، امام بوسیری،

افطار بمی کرد برم پیرِ خرابات
گفتم کہ تُرا روزہ بہ برگ و ثمر افتاد
با بادہ وضو گیر کہ در مذہب رندان
در حضرتِ حق ایں عملت بار ور افتاد
آیت اللہ خمینی

ایک دن پیر مغان کو میں نے پلائی شراب
وقت تھا افطار کا اور میں نے کہا بے حجاب
کچھ سمجھتے ہو کہ پایا آج تو نے کیا ثواب
ہوگیا روزہ قبول اسرار سب ہیں بے نقاب
کر شرابوں سے وضو رندوں کا مذہب ہے یہی
حضرتِ حق اجر اچھا اس کا دیتے ہیں جناب
ترجمہ: حبیب

فردوسی، رومی، حافظ، عطار، نظامی، ثنائی، خیام، پشکن، غالب، اقبال۔ یہاں بھی ہم اختصار سے کام لیتے ہیں ورنہ آفاقی شعرا کی کمی نہیں اور یہ محققوں کا کام ہے کہ وہ ان کے حسن و جمال سے پردہ اٹھائیں۔ یہ کہنا البتہ ضروری ہے کہ وید بھی شاعروں نے لکھے اور اپنشد اور بھگوت گیتا بھی۔ مثنوی، حکایات شعر کو ارض وسما کے علاوہ تحت الثریٰ یعنی پاتال کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور اس طرح وحدت کا جھنڈا تخیل کے عالم میں گاڑ دیتے ہیں۔ ہم روحانی عالم کے شوقین شاعروں کے مرہون منت ہیں جنھوں نے آسمانی کتابوں کی وضاحت کی، اسرارِ رحمانی آسان بنائے اور انہیں واضح کرنے کی کوشش کی، عموماً اسی زبان میں جو زبان ان کے اپنے لوگ جانتے تھے۔ انہوں نے بھی تاہم اشاروں، کنایوں، استعاروں اور دیگر تصنّعاتِ زبان سے کام لیا ورنہ یوسف وزلیخا قرآنی اسرار کے ساتھ کہاں میل کھاتی اور وامق عذرا لیلیٰ مجنوں کے ساتھ کیسے۔ ہم یہ نہ بھولیں کہ کشمیر کے سارے صوفی شعراء بہت عظیم کام کر چکے ہیں اور ابھی بھی کر رہے ہیں کیونکہ ان کے کلام مخفی اسرار الٰہی کا حتی الامکان انکشاف کر رہے ہیں اور انسان کی روحانی ترقی میں معاون ثابت ہو رہے ہیں اسلئے بھی بارگاہ احدان کے کلام سے ہمیشہ گونجتی رہتی ہے اس طرح حسن معنی اور حسن بیان کے گل کھلاتی رہتی ہے۔ جو لوگ ان شاعروں کو مجنوں کہتے ہیں یا برا بھلا وہ حقیقت تلاشنے کے ذوق سے محروم ہیں اور انہیں من کی دنیا میں جانے کا شعور نہیں۔ پس شعر آئینۂ نورِ الٰہی ہے اور وسیلۂ اسرارِ الٰہی بھی، ساتھ ساتھ یہ ہمیں ان منازل تک پہنچنے کیلئے حرکت میں لاتا ہے، کیونکہ جوش پیدا کرتا ہے۔

جامی کی نعت، حافظ کی غزل، سعدی کی حکایت، غالب کا سحر انگیز عشقیہ وصوفیانہ کلام، اقبال کی جوشیلی نظم اور ہندی شعراء کے سُریلے گیت انسان کے دل وجگر میں تلاطم پیدا کرتے ہیں اور ایسی شرابِ معرفت پلاتے ہیں کہ پینے والا دعا کرتا ہے کہ ساقی سب کو پلائے اس طرح کہ کوئی انسان کسی بھی جگہ بن پئے نہ رہے اور ہم کو اس طرح پلادے کہ جام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرکت میں رہے اور تلچھٹ تک پلاتا رہے!

ایسی مسندوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور ان دونوں باغوں کے پھل قریب ہی ہونگے۔ (55-54)

ان میں جھکی نظروں والی ہوں گی، ان سے پہلے انہیں کسی انسان اور کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا (55-56)

سبز اور نہایت نفیس نادر قالینوں پر تکیے لگائے ہوں گے (55:76)

آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا نام بہت ہی برکت والا ہے (55:78)

باغات اور انگور ہیں۔ اور نوجوان ہم عمر عورتیں۔ اور چھلکتے ہوئے جام ہیں۔ (78:32-34)

فن کی اس اجمالی تفصیل سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ ایک ایک فن پارہ بارگاہ ہے جس میں صاحب قیام کر رہے ہیں اور روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، فن کاروں کے خونِ جگر کے گل وگلزار دیکھ رہے ہیں ان کی محنت شاقہ اور ریاض کی داد دے رہے ہیں، ان کے حسن کار ہاتھوں کا غیر معمولی کام دیکھ دیکھ کر انسانی عظمت کا مشاہدہ کر رہے ہیں، حسن کاری میں محو حسن کے شائقین کے جذب کی عبادت دیکھ رہے ہیں اور ہمہ وقت اللہ کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اشرف المخلوقات کا عروج ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ جنت میں جنتیوں کیلئے ریشمی بستر ہونگے، کمخواب جیسے پارچوں سے بنے ہوئے تکیے ہونگے، نظریں جھکی جھکائی دوشیزائیں ہونگی، انگور کے گچھے ہونگے، اچھلتے ہوئے چشمے ہونگے، سلسبیل ہوگی، زنجبیلی لذتیں ہونگی، باغ ہونگے اور سیاہ مائل سبز باغ، چھلکتے جام ہونگے اور ان ہی چیزوں کے بیچوں بیچ جنتی رہتے ہونگے۔ فن کاروں نے ایسی باتوں کے اصلی مطالب سمجھ لئے ہیں اور ایسی زبان میں جو فن کیلئے انہوں نے وضع کی ہے، ان مطالب کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ صاحب نے ان فن پاروں کو اپنی بارگاہ کیلئے چن لیا ہے اور اپنے گھر کے سندر شاہی دربار کو سجایا ہے تاکہ روحانیت کے اسرار و رموز واضح ہو جائیں ان لوگوں کیلئے جو آنکھوں اور کانوں

اور قلب کی حساس نُدرتوں اور قدرتوں سے تخلیقات الٰہی سے فیض حاصل کرتے ہیں اور کسب نور کرتے ہیں۔ صاحب ان سب چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں، ان کی سراہنا کرتے ہیں مگر ان سے ماورا بھی ہیں۔ سب سے مل کر سب سے الگ بھی ہیں۔ ساقی بھی ہیں، منزل شناس راہی بھی ہیں، حسن و جمال کی اور اور راہوں کو تلاشتے بھی ہیں کہ کل یوم ھوفی شان، ہر لحظہ ہر لمحہ نئی آن بان کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون، ہر حاصل کئے ہوئے جمیل عالم کو دوسروں کے مشاہدے اور ان کی لطف اندوزی کیلئے چھوڑتے ہیں۔ پلانے اور کھلانے والے اس ہر جائی کیلئے یہ کیا کم ہے کہ جس ویران جگہ کو دیکھتے ہیں اس میں گھر بساتے ہیں، آباد کرتے ہیں اور سُندر بنا دیتے ہیں۔ پھر آگے بڑھتے ہیں اور ویران جگہوں کو آباد کرنے کیلئے اور خوبصورتی سے نوازنے کیلئے۔ یہی ان کا وقار ہے اور طرۂ امتیاز ہے۔ یہی ہمارا وقار ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں!

دربارِ چانیوک چھم قسم
مس چھوس چیواں بس دمبدم
چانِس شرابس کیاہ چھو کم
زم زم وزان پھلو پھلو ارم
وِل وِل گلوبو نال دول
اَسمان رہہ کھو نار پھول

حبیب

جب کوئی مامہ پُش (غلام محمد پشو) دیوانہ وار جگر پاش نالہ وفریاد لیکے آتا ہے اور زور زور سے حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومی محبوبی رحمتہ اللہ علیہ کے مناقب پڑھ پڑھ کے ایک مردِ فقیر کی توجہ کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب کوئی ستم رسیدہ بے وفائی کا مارا گُلہ کرفی اپنے پیرومرشد کو رحیم صاحب سوپور کی زبانی اپنی جان کی سوغات پیش کرنے کا موقع پاتا ہے، جب کوئی ڈاکٹر ولی محمد محبوب نام پاکر اپنے موزون کیٔے ہوئے اشعار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ابھرنے لگتا ہے یہاں تک کہ انا الحق انا الحق بھی گنگنانے لگتا ہے، تب گاؤں کی ایک سیدھی سادھی عورت کی آہ وزاری بھی شعروں جیسی لوک زبان میں ڈھلنے لگتی ہے اور توجہ پاکر اس کا زنانہ قلب بھی بولنے لگتا ہے ''ماازپۓ سنائی وعطارؒ آمدیم''۔ اسی طرح جب کوئی نادار غریب عورت گاؤں سے دوڑتے دوڑتے آتی ہے، روپے دوروپے کے پکوڑے خرید کر پُڑیا میں بند کرکے لاتی ہے اور صاحب کے سامنے رکھ دیتی ہے اور صاحب خود اپنے ہاتھ سے یکا یک اٹھا اٹھا کے کھانے لگتے ہیں، اس طرح مزے سے کہ شادی بیاہ کے نازنخروں سے سجا ہوا اور واز وان کی خوشبوؤں سے بھرا ہوا ایک طشت دور اپنا سامنہ لیکر اپنا گریباں منہ میں ڈالتا ہے، تب سات سمندر پار آسٹریا دیس کی کوئی ماریا تیجا سوپور پہنچ کر صاحب کے بالکل نزدیک بیٹھتی اور اپنی روئیداد سناتی ہے، کشمیری زبان میں نہیں، اردو انگریزی میں نہیں بلکہ اپنی جرمن زبان میں اور صاحب پوری توجہ کے ساتھ اس سادہ لوح مجبور عورت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں

اوراس کے اندر زبردست خوداعتمادی پیدا کرتے ہیں، تب باہر سے گذرتا ہوا مجھ جیسا کوئی آوارہ مسافر بھی سمجھنے لگتا ہے کہ اندر کوئی مردِ کامل شہنشاہ زمانہ دربار جمائے، محفل سجائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ناسور زخموں پر مرہم پر مرہم لگاتے ہیں۔ یہ شہنشاہ کے خسرو یا قیصر نہیں، نہ دارا و سکندر ہیں، یہ تو دلوں پر حکمرانی کرنے والے شہنشاہ ہیں اور پیغمبروں اور ولیوں کے نقش قدم پر چلتے چلتے رات دن، صبح وشام، ہر موسم، ہر وقت اور ہر حال میں زندگی کی الجھی ہوئیں گتھیاں بھی سلجھاتے ہیں اور زندگی کرنے کے بہت اچھے آداب بھی سکھاتے ہیں۔ یہ وہ شہنشاہ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گلا گلا کر اپنا سب کچھ زندگانی کیلئے، انسانیت کیلئے، عرفان کیلئے اور ہاں عشق ومحبت کیلئے وقف کر دیا ہے۔ یہ وہ سلطانِ اعظم ہیں جو لیتے نہیں دیتے ہیں اور جو لوگ لینا نہیں چاہتے ان [illegible] یا ہوا لقمہ زور زور سے ڈالتے ہیں۔ ان کی طرف دیکھ کر دل خود ہی پگل جاتے ہیں بشرطیکہ قساو[illegible] سخت نہ بنایا ہو کہ پڑھ پڑھ کے اور بھی پتھر ہو جاتے ہیں اور رحمتِ الٰہی کو بھی ٹھکراتے ہیں۔ ہم [illegible] کے دربار کے باہر کھڑے ہیں اور سُن رہے ہیں ان کی صاف آواز "ایسا نہ ہو کہ یہ بھاگ جا[illegible] کا خیال رکھنا"!

آپ کے دربار میں لالہ، جمال، محی الدین، اکبر کاک، رحمان کاک، رحمان چھان، بوڈ[illegible] سندری، مالہ، شمیمہ، سیدہ، شریفہ، سعیدہ، گلہ گور، ریش مام، اسمال کاک اور لسہ کاک ہی نہیں آتے اور بھی بہت آتے ہیں، جج، وکیل، تحصیلدار، پولیس ڈی آئی جی، ملٹری آفیسر، سپاہی، کلرک، جنگلات کے ملازم اور خفیہ ملازم بھی۔ یہاں امیر، غریب، مالدار، نادار، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بے دین، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، چھوٹے بڑے، دیہاتی، شہری، ہندوستانی، غیر ملکی سب آتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، ٹیچر، سیاست کار، لیڈر، اخباری لوگ، ریڈیو وٹیلی ویژن پر کام کرنے والے لوگ بھی آتے ہیں۔ غلام رسول بھی آتا ہے اور غلام رسول بٹ بھی، مرحوم عبدالرشید بھی آتا ہے، اور عبدالرشید بڑیاری بھی جو قدم قدم پر سجدے کرتا ہے اور ایسے خواب دیکھتا ہے جن میں اسے بیٹا بھی ملتا ہے، بٹوہ بھی ملتا ہے، قرآن شریف پڑھنے کا شوق و ذوق بھی ملتا ہے اور صاحب کی گاڑی کے آگے آگے گاڑی، باڑی گاڑی، چلانے کا اشارہ بھی! یہاں ستار بھی آتا ہے اور ستار کی حلیمہ بھی، کیپٹن ستار بھی آتا ہے اور اس کا حبیب اس کی سادیہ بھی، مگر جب جب آتا ہے، چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابیں بھی لاتا ہے صاحب کے مریدوں میں بانٹنے کیلئے۔ یہاں غلام رسول بچہ بھی آتا ہے اور دور سے سلام کرنے کیلئے اور غلام رسول بچہ (مرحوم) کی بیٹیاں بھی آتی ہیں بہت خضوع خشوع کے ساتھ۔ ان کے زرگر صاحبان بھی آتے ہیں، ڈاکٹر یوسف، ڈاکٹر جیلانی، اور عطا محمد صاحب کی دوستی کے ساتھ بیٹھ کر دل ہی دل میں

چوری چوری صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہیں مگر آداب کے ساتھ آتے بھی ہیں اور جاتے بھی۔ یہاں رشتہ دار بھی آتے ہیں اور رشتہ دار نما مطلب کار بھی اور بیگانے بھی آتے ہیں صلۂ یگانگت پانے کیلئے! یہاں بڑی بڑی گاڑیوں میں بھی لوگ آتے ہیں، بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھنے والے، بڑے بڑے باغوں کے مالک، بڑے بڑے تاجر، مگر جب دربار کے اندر جاتے ہیں تو اپنی مونچھوں کو ذرا نیچا کر کے جاتے ہیں۔ یہاں گاؤں سے نادار اور غریب عورتیں بھی آتی ہیں چاول کلو دو کلو ہاتھ میں لئے، کبھی کبھی کشمیری مرغے دوسرے ہاتھ میں لئے کہ صاحب کھائیں مگر دربار کے اندر جا کر وہ مانگتی ہیں گائے کے دودھ بھرے تھن یا شادی بیاہ کیلئے روپے پیسے یا بیٹیوں کیلئے بر یا بیاہی بیٹیوں کیلئے فرزند نہ کہ دختر! آسودہ حال عورتیں بھی مانگتی ہیں مگر امتحان میں بیٹی بیٹے [illegible] نمبر، پڑھ لکھ کر اچھی نوکری، اچھا بر وغیرہ۔ بہت ساری عورتیں تو بس روتی ہیں اور روتے روتے کہتی

جام الفت کے پئیں گے ہم بھی آج
آج ہم بھی دیکھیں گے ہیروں کا تاج

پاس بیٹھیں گے کہیں گے دل کا حال
غور سے سن لیں گے میرے سب سوال

کوئی رکاوٹ نہیں پردہ نہیں
دل ملائیں دل سے ہم بیٹھیں یہیں

واہ واہ سنجیدگی واہ خوشدلی
دور ہوتی ہے یہاں سب بے کلی

بیٹھ گئے دل میں یہ عالی مقام
دستگیری سے ملا خاصا انعام

حبیب

ہیں ''ببا، خدا رسول اور آپ کے بغیر میرا اس دنیا میں کوئی نہیں، میں رات دن درد میں مبتلا رہتی ہوں، دوائی مہنگی ہے خرید نہیں سکتی، میں کیا کروں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو وہ کیا کرینگے۔ ان کا باپ روزمزدوری کرتا ہے بے چارا، تب بھی گذارا نہیں ہوتا۔ میں واری جاؤں، ببا''۔

صاحب کے دربار میں کچھ لوگ بس ایک آدھ دفعہ آگئے، بیٹھے اور چلے گئے۔ کچھ کہا، کچھ محسوس کیا، کچھ پایا، بس چپ چاپ دل میں ایسے نقش بنوا کر چلے گئے کہ کبھی نہیں مٹے۔ ایک دن میرے ساتھ بھی ایک خاتون آئی، کچھ وقت کیلئے صاحب کے پاس بیٹھی رہی، کچھ تصویریں اٹھائیں، گھونٹ دو گھونٹ چائے پی لی اور چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے گھر میں صاحب کی تصویریں اچھے خاصے چوکھٹوں میں [illegible] ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ صاحب جیسے برگذیدہ بزرگ کے پاس جانا سعادت ہے جو کبھی کبھار ہی حا[illegible] ہے۔ خوش قسمت خاتون ائرلینڈ کی رہنے والی ہے اور یہاں کشمیر میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کے دل [illegible] نے کچھ نقش ثبت کئے ہونگے۔ اسی طرح ۱۹۹۴ء میں میری ملاقات دربار میں ہی ایک شخص سے [illegible] کا نام برنڈ مارکوسکے تھا اور جو جرمنی کا رہنے والا تھا۔ تب سے آج تک سترہ سال گذر چکے ہیں مگر مجھے اچھی طرح [illegible] یاد ہے کہ وہ صاحب کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، قریباً آدھ گھنٹے کے بعد صاحب کی تصویر مجھے دکھائی [illegible] تصویر دیکھ کر مجھے اتنی مسرّت حاصل ہوئی کہ ابھی تک اس کا اثر موجود ہے۔ اس تصویر میں کتنی قطعیت تھی۔ وہ بس ایک مصوّر تھا۔ اور مصوّر ہونا بھی بڑی بات ہے مگر صاحب انسانِ کامل، بہت بڑے نقاش کہ ان کا نقش انسان کی ساری زندگی بدل سکتا ہے اور وہ بھی پائیدار اور گراں قدر حیات کیلئے۔ انہوں نے بھی مصوّر کے دل میں کوئی نقش بٹھایا ہوگا۔ اس کی نوعیت کیا ہوگی، ہم کیا جانیں۔ ایسے نقشوں کے بارے میں کیا کہیں۔ یہ تو وہ جانیں جو بناتے ہیں یا وہ جن کے دل میں بٹھائے جاتے ہیں مگر کچھ باتیں ایسی ہیں جن کی طرف دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ایسے نقش شاذ ہی بنتے ہیں اور خاص شخصیات ہی بناتے ہیں۔ ایسے نقش زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ کھلتے جاتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، ان کے کرشمے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو ایک باتیں کھل گئیں تو اٹھ بیٹھ ہی بدل گئی۔ جم جانے کے بعد محسوس ہوا کہ دو باتوں سے اور دو دو باتیں کھل گئیں۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ بہت ساری باتیں سامنے آگئیں اس طرح کہ رگ جان بن گئیں۔ ایسے نقش سوچ میں، سمجھ میں، جانچ پرکھ میں بدلاؤ لاتی ہیں اور انسان کا شعور ہی بدل ڈالتی ہیں۔ کتنے خوش بخت ہیں وہ لوگ جن کے شعور میں خاصا بدلاؤ، خاصا انقلاب آجاتا ہے اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے نقش صاحب کے پاس بس ایک بار دو بار بیٹھنے سے جم جائیں۔ ایسا کبھی کبھار یا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے
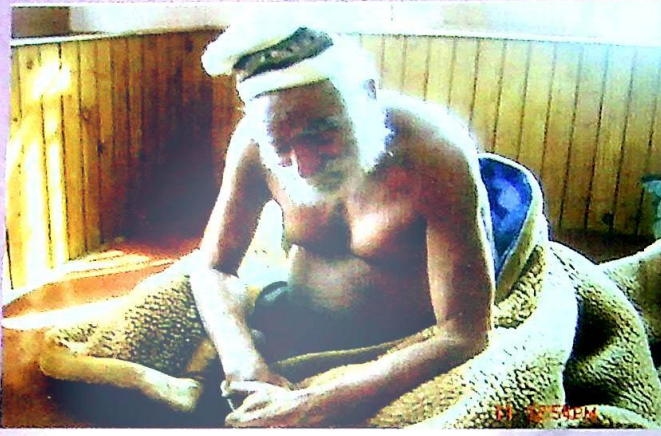
کیونکہ زندگی میں بدلاؤ اور اپنے اندر شعوری تبدیلی لانے کیلئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے، ریاضت کی، ایثار کی، توجہ کی اور یک سوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل لگانا پڑتا ہے، ہوشیاری، سمجھداری سے کام لینا پڑتا ہے،
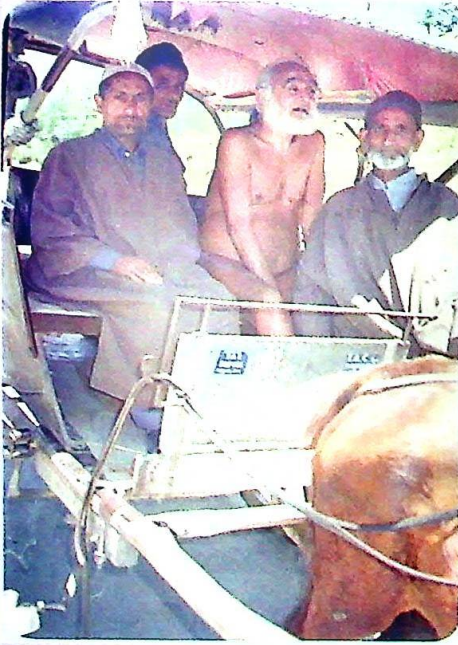
احتیاط سے اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے اور سماج میں لوگوں کے ساتھ برتاؤ کرنے پڑتے ہیں۔ خود اپنی سوچ کو ایک خاص ڈھنگ پر مرکوز کرنا پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ عشق و محبت کیلئے حسد، بغض، عداوت، انتقام جیسے خصائل کا گھلا گھونٹنا پڑتا ہے تاکہ فرد فرد کو محبت بھری نظروں سے دیکھا جائے اور وحدت ہی وحدت نظر آئے۔ مگر کبھی خوش بخت ہُما کسی زبردست طالع ور کے سر کے اوپر سے گذرتا ہے اور وہ یکایک حریم ذات میں پہنچ جاتا ہے کراماً کاتبین کی نظروں کو خیرہ کرتے ہوئے اور لی مع اللہ کی بلندیوں پر اڑتے ہوئے۔ یہ ازلی مقبول لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں، احد

ب جیسے! وہ بوڑھ چھان اور رحمان کاک کے ساتھ ٹانگے پر بیٹھیں یا غریب و نادار عورت کے پکوڑے کھائیں، پھر بھی وہ شہنشاہ ہوتے ہیں اور بڑے کامل برگزیدہ!
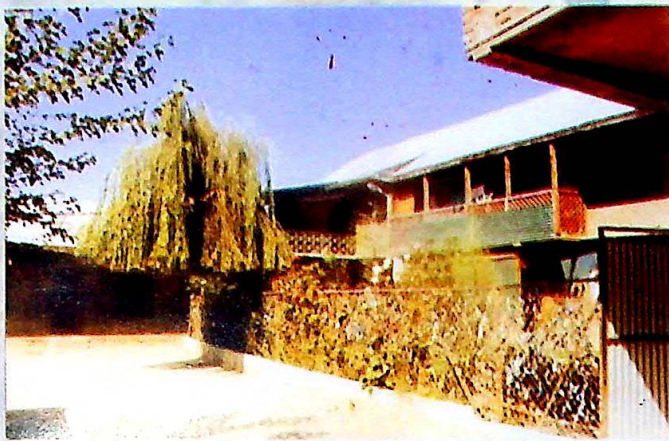
نقشوں کی بات ابھی جاری، یہ بھی کہیں کہ کبھی ختم نہ ہونے والی! صاحب خود نقاش۔ ان کے نمونے نایاب، سامان اچھنبے، مگر کمیاب! دھاگوں کو لیجئے چیتھڑوں کی بات کیجئے، ان رنگین وسیلوں سے لوگوں کے دلوں کو اپنے دل کے ساتھ باندھ لیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ لوگوں سے ہی یہ کام کرواتے ہیں۔ وہ سمجھتے بھی نہیں کر کیا رہے ہیں۔ وہ تو اپنے درماندہ کام حل کروانے کیلئے آئے ہیں۔ یہاں یہ عالم کہ شعوری طور پر، دُھلے منجھے ذہن سے، ان کے باندھے ہوئے دھاگوں سے ہی بندھن کا کام لیا جاتا ہے۔ سائلوں کو معلوم کہ انہوں نے دھاگے کیوں باندھے۔ یہاں یہ بھی معلوم مگر اصلاً وہ بھی معلوم جو سائلوں کو نہیں معلوم، وہ باتیں جو بہت ضروری ہیں اور جن کیلئے صاحب اپنا سارا وقت نہ سہی، اکثر وقت لگاتے ہیں۔ اپنے اوپر دورنگ کمبل اوڑھنے والے یہ صاحب تھکتے تھکتے بھی تھکتے نہیں اپنے سائلوں کیلئے۔ سائل اپنی حاجتیں روا کروانے کیلئے دربار میں چلے آئے۔ یہاں حاجتیں روا ہوگئیں یا خدانخواستہ نہ، ان کی اصلی حاجتوں کا پتہ چلا کہ جو انہیں عاقبت کے ساتھ، دائمی زندگی کے ساتھ، روحانیت کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں۔ مثلاً کوئی درماندہ مسافر آیا، دھاگہ باندھا، مگر باندھتے باندھتے اس عذاب سے رہا ہوگیا جس میں وہ مبتلا تھا۔ عجب یہ کہ جانتا بھی نہ تھا کہ وہ کسی عذاب میں مبتلا ہے۔ بہت سے عذاب ہمیں پیارے لگتے ہیں کیونکہ ان کی باہری صورت، عارضی صورت، ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ خوشنما ہوتے تو ہیں مگر ہوتے ہیں عذاب۔ مثلاً حرام کا پیسہ، یتیموں کا مال، کینہ، بغض، خواہ مخواہ دل آزاری۔ ان خوش نما عذابوں سے کون پردہ اٹھائے۔ صاحب نقاش تو ہیں مگر ستار بھی ہیں اور غفار بھی۔ وہ اگر ان عذابوں سے

پردہ نہ اٹھائیں ہم کیسے اٹھائیں گے۔ مسافر عذاب سے بری بھی ہوگیا اور شاید اس کے دل میں اس چیز کا مثبت نقش بھی بیٹھ گیا جسے وہ نامناسب سمجھتا تھا۔

اس دربار میں بہت سی ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کو ہم اچھا نہیں سمجھتے مگر ہوتی ہیں وہ اچھی چیزیں، اتنی اچھی کہ خیر دارین کا سبب بن جاتی ہیں۔ جب دھاگے باندھتے باندھتے سائلوں کو ایسی چیزوں کا پتہ چلتا ہے تو ان کی خوشیوں کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پھولے نہیں سماتے۔ پس دھاگے...... یا یوں کہیے کہ دھاگے...... وہ سامان یا ہتھیار ہیں جو صاحب لوگوں سے ہی استعمال کرواتے ہیں۔ ان سے خود بخود بھی ایسے نقش بنتے ہیں کہ اگر کوئی اجنبی ان کے ڈیزائن، ان کے پیکر دیکھے تو وہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوجائے۔ ان کے رنگ بہت نرالے ہیں اور ڈھنگ بھی۔ انہیں سمجھنا اکثر مشکل۔ تاہم تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ صناع تو صناع ہیں ہی، ایسے نقش بناتے ہیں کہ کبھی نہیں مٹتے، فنا ہوکر بھی نہیں!

ایک اور انوکھا گُر۔ کسی شوقین چاہنے والے نے صاحب کے صحن میں خود اپنے ہاتھوں سے لاجرس ٹرومیا پھولوں کا ایک درخت لگادیا۔ سال دو سال کے اندر یہ بڑا سا درخت کِھل گیا۔ مہینے دو مہینے تک اس کے اوپر ہزاروں پھول کھلتے رہتے ہیں۔ یہ کام درخت لگانے والے کا نہیں صاحب کا کام تھا۔ مرید نے زمین میں درخت لگایا، صاحب نے اس کے دل میں درخت بو دیا۔ پھولوں کا، ہمیشہ بہار پھولوں کا۔ دل کے درخت کو نہ سینچنے کی ضرورت، نہ گوڈائی کرنے کی ضرورت۔ یہ درخت بھی نہیں بلکہ صرف نقش ہیں جس سے پھول کھلتے ہی رہتے ہیں ان گنت اور بہاروں کا سماں باندھتے ہیں۔ یہ پھول گل بکاولی جیسے پھول ہیں یا گل صنوبر والی گل جیسے پھول جن سے کتنی کہانیاں مربوط ہیں۔ یہ پھول ارضی نہیں، سماوی بھی نہیں، عرفانی ہیں، روحانی ہیں اور ان کی خوشبوئیں نہ جانے کہاں کہاں پھیلتی ہیں اور کن کن حسینوں اور حسیناؤں کے کپڑوں میں عطر لگاتی ہیں۔ یہ پھول جمال وجلال کی دنیا ہیں جس میں کوّے اور گوریلے بھی خوبصورت یا جمیل، اور شیر جیسے دھاڑنے والے خون خوار وحشی بھی جلیل۔ یہاں سے ایک قدم اور بڑھائیں۔ مان لیجئے کہ کوئی دوسرے قسم کا شوقین، نعت کا، منقبت کا،

اورادِ فتحیہ کا، قصیدۂ غوثیہ کا ارمغان ساتھ لے آیا اور داؤدی لحن میں پڑھنے لگا۔ وہ جس اثر آفرینی، خضوع وخشوع اور ذوق وشوق سے پڑھے گا، اسی کے مطابق اپنے دل میں نقوش دستِ احد دیکھ پائے گا۔ اس کا دل معنی ہی معنی کھولنے لگے گا اور وہ پڑھتا رہیگا۔ ''جایہِ جائے چھورحمتک پأراوٗ۔ از مدینہ نسیم فرحت آوٗ۔ عالمس پھلی عنایتکی گلزار۔ از چھومعراجِ احمدِ مختار'' ۔ مگر ایک دفعہ آوٗ، ایک نقش لے کے جاوٗ۔ دودفعہ تین دفعہ آوٗ، دودو نقش تین تین نقش لیکے جاوٗ۔ جتنی بار آوٗ گے، اتنا ہی صلہ پاوٗ گے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کہیں زیادہ۔ ایک بار دیدو، دس بار لے لو اِس دنیا میں اور ہزار بار اُس دنیا میں۔ اس میں شک نہیں مگر ان لوگوں کیلئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

کئی لوگ بس رضائے الٰہی کیلئے پیسے خرچ کرتے ہیں اور انہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ ... نام کمانے کیلئے، دکھاوے کیلئے، لالچ کیلئے خرچ نہیں کرتے بس محبت کا تھوڑا سا نذرانہ ... کے دل پر ایسے ہی ضرب لگائے جاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کی راہ میں عاجزی سے اپنی پیاری ... ہیں انہیں اللہ کے چہرے کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ وہ خود بخود جان لیتے ہیں کہ دیدارِ الٰہی ... ہے۔

اور ہاں کچھ لوگ دربار میں میوے لاتے ہیں، سیب، کھجور، انار، انگور۔ ان کو بھی میوے کھلائے جاتے ... سیب، انار، کھجور، انگور۔ مگر یہ میوے دوسرے رنگ میں کھلائے جاتے ہیں اور انہیں معلوم ہو جا... میں۔ صاحب کے رنگ بڑے انوکھے ہیں، اور یہاں انسان کی ایک سانس بھی ضائع نہیں ہوتی۔ دربار میں ضیافتیں بھی لائی جاتی ہیں۔ کوئی شوق سے صاحب کیلئے کھانا لاتا ہے۔ کوئی سماوار میں چائے لاتا ہے اور روٹیاں، کوئی گرم گرم حلوہ لاتا ہے اور گرم گرم لواس۔ کوئی طشت میں وازہ وان لاتا ہے، سات سات ضیافتوں سے بھرا ہوا طشت۔ ان کے نذرانے طریقے ہیں جن سے صاحب کے نقش دل میں بیٹھتے ہیں۔ سات ضیافتیں صاحب کے دربار میں لائی گئیں اور سات شمعیں دل میں روشن نہ ہوگئیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس بڑے دربار میں لواس کا ایک ٹکڑا بھی ضائع نہیں ہوتا۔ ہوگا بھی کیسے؟ اس دربار کے مالک بڑے فیاض ہیں جو جھولی خوب خوب بھرنا جانتے ہیں اور یہ فیاض مالک بڑے غیور بھی ہیں۔ ان کے سامنے ایک دانہ رکھو، وہ کھلیانوں کے کھلیاں بھر دیں گے۔ شرط البتہ عشق اور حرارت عشق کے نت نئے انداز! ان کے لئے شوق سے ایک فرن بنا کے لاوٗ، وہ تمہارے صفات میں چار چاند لگائیں گے، تم کو اچھے اچھے کپڑے پہنائیں گے اور دنیائے جمال میں جانے کیلئے پاس (pass) بھی دینگے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تم نے فرن لایا اور انہوں نے قبول کیا۔ ان کی قبولیت ہی آپ کے دل پر سب سے خوبصورت نقش۔ شیرین کی شہرت ہی فرہاد کا انعام!

دربار احد سوپور، بانڈی پورہ اور بارہمولہ کے لوگوں کیلئے سالہا سال سے گرانقدر کام کرتا آیا ہے۔ اس

علاقے کے لوگ مقابلتاً آسودہ حال ہیں کیونکہ یہاں باغ لگائے گئے ہیں اور فروٹ انڈسٹری سخت مشکلات کے باجود لوگوں کی خوشحالی کا سبب ہے۔ تاہم گاؤں میں رہنے والے سب لوگوں کے پاس اتنی زمین نہیں کہ باغ لگائیں۔ اس کے علاوہ امیر لوگوں نے پہلے ہی خشک زمینیں خرید خرید کر رکھدی تھیں، ان میں باغ لگوائے تھے۔
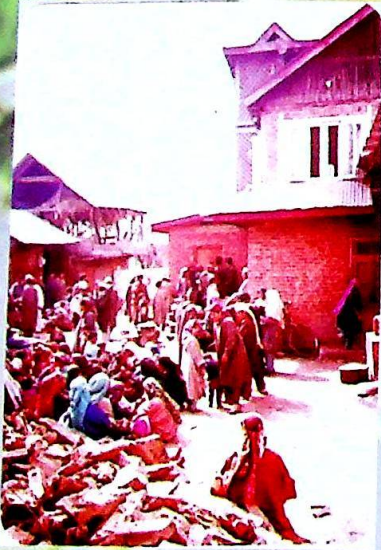
غریب لوگ بے چارے زمینیں بیچ بیچ کر مات کھا گئے تھے۔ اس لئے اب بھی کافی لوگ ہیں اور اس صرں احد صاحب کے کاندھوں پر کافی بوجھ ڈال چکے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ صاحب ان لوگوں کے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہو ہو کے صاحب کا دل درد سے بھر گیا ہے۔ چونکہ وہ بہت حساس ہیں اس لئے گاؤں کی عورتوں اور ان کے بچوں کی حالت زار دیکھ کر بہت دکھی ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی عورت بلا تکلف انہیں اپنا فریاد سناتی ہے اور کسی بھی عورت، مرد یا بچے کی بات صاحب کو ناگوار نہیں گذرتی۔ ایک گجرانی کی آہ و فریاد ابھی بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ وہ بار بار اپنا حال اونچی اونچی آواز میں سناتی تھی اور گھنٹوں۔ صاحب بڑے صبر مگر اپنائیت سے اس کی فریاد سنتے اور کبھی جواب میں ایک دو بول بھی بولتے۔ حالانکہ وہ شاذ ہی منہ کھولتے تھے۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر تہذیب وتمدن کا غازہ چڑھا نہیں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز بھونڈے لگتے ہیں اور ناشائستہ مگر کس کی جرأت کہ صاحب کے سامنے ان کی ناشائستگی پر یا ان کے شور وغل پر ناک بھوں چڑھائے۔ کبھی کسی نے ایسی حرکت کی تو اس نے خوب کھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ عورتیں انہیں تنگ کرتی تھیں اور ان کے جسم کو کھینچ کھینچ کر انہیں تکلیف پہنچاتی تھیں مگر صاحب چپ چاپ برداشت کرتے تھے اور شاذ ہی کسی کو ٹوکتے تھے۔ لوگوں کے اژدھام ضرور صاحب سے اپنی فریادوں کا جواب پا لیتے تھے۔ دکھائی دیتا ہے صاحب کا دل ان لوگوں کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا تھا اور وہ روحانی اعتبار سے کافی کچھ
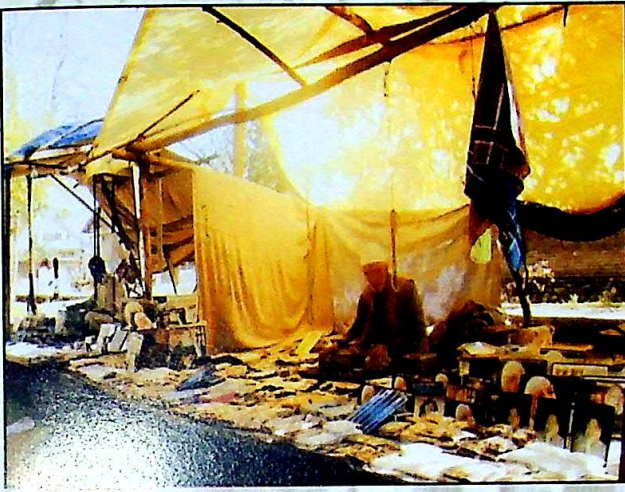
پالیتے تھے۔ رحمت کے دریا سے پی پی کر
یہ لوگ سیراب ہوتے تھے۔ ایسا لگتا ہے
کہ زینہ گیر، لولاب، بانڈی پور اور بارہمولہ
کے علاقے اور وہ لوگ جو دوسری جگہوں
سے آتے تھے، اپنی پسماندگی، بے کسی،
بے بسی اور غربت کے دل پگلانے والے
حال ان کو سناتے تھے۔ وہ اُن کے نقوش
سے بہت فیض پا چکے ہیں۔ ان کے نقش
ان مٹ ہیں۔ سالہا سال ان علاقوں اور
جگہوں کے مرد، عورتیں، بچے صاحب
کے ارد گرد جمع ہونے کے نقش اپنی
یاداشتوں اور تذکروں سے زندہ رکھیں
گے۔ صاحب بھی اپنی یاداشت سے ان
نقشوں کو سدا بہار بنا کے رکھیں گے۔
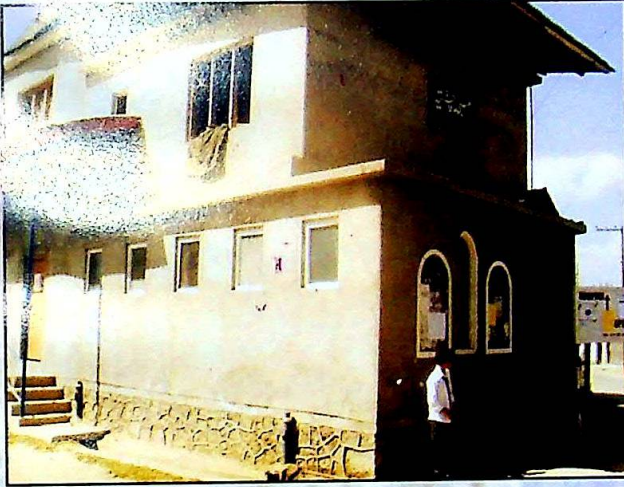
صاحب کی ناز پرورده
اور نازنین آنکھیں جیتے جاگتے میخانے
ہیں جن سے لاکھوں لوگ پی چکے ہیں،
جن کے نور سے لاکھوں گھر آباد ہوئے ہیں، جو ہزاروں مشکلوں کو آسان سہولتوں میں تبدیل کر چکی ہیں اور جو اب شش جہت میں خلق خدا کی روحانی بہبودی کے سامان مہیا کر رہی ہیں۔ کتنے لوگ کہہ چکے ہیں کہ ان آنکھوں کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھنا دل جگر کا کام ہے اور کتنے وہ ہیں جو ابد تک ان سے پیتے رہیں گے۔ یہ چشمان مبارک نرگس کی طرح آبدار ہیں مگر اس نرگس کی طرح جو ہزاروں سال رو رو کر ختائی خاندان میں دیدہ ور ہو کر صاحب کے اتھاہ سمندر دل کے ساتھ جڑ گئی ہیں اور اب اس کی کھڑکیوں کا کام کر بیٹھتی ہیں۔ ان کی وساطت سے عام لوگ دریائے معرفت کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں۔ لوگ آپ کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ان میخانوں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں مگر جن کے پاس تصویر کھینچنے کے وسیلے نہیں وہ بڑے دروازے کے

باہر اپنی من پسند تصویریں خریدتے ہیں۔ رسول میر کی طرح وہاں نہر کے کنارے ایک دو آدمیوں نے عشق کی دکانیں کھول دی ہیں۔ یہ تصویریں عاشقانِ احد کو ان کی آنکھوں کی یاد دلاتی ہیں اور ان کے دربار کی اور اسی طرح دیتی رہیں گی۔

کچھ قدم چل کر مسجد چشتیہ ہے جس میں آتے جاتے مریدانِ احد نماز پڑھتے ہیں اور درود۔ اس مسجد کی آوازیں دربار احد کے اندر بھی سنی جاتی ہیں۔ حضرت معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ صاحب کے دربار کا چند وجوہات کی بنا پر خاص تعلق ہے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندو پاک میں خواجہ اجمیر کو ہندالنبی کہتے ہیں۔

صاحب کے دربار کے اندر، بالکل اندر، ایک گوشہ ہے، گوشۂ عافیتِ عاقبت۔ خوش قسمت انسان وہاں گھس گیا، وہ اسرارِ پنہاں سے واقف ہو گیا۔ اس پر بہت ساری باتیں، بہت سارے حقائق کھل گئے۔ مثلاً اخلاق اور قانون کی ضرورت اور اہمیت، انبیاء و اولیاء علیہم السلام کے آپسی رشتے، تعلقات اور معاملات، دنیا و عقبیٰ کی زندگی کے اسرار، جن و ملائک کی پہچان اور حقیقتیں، حور و پری کے پیکر، جنت و دوزخ کے احوال، زمین و آسمان و تحت الثریٰ کی پہچان، اسرارِ معراج، سدرۃ المنتہیٰ کی حقیقت، سلطانی، زبان و مکان کی پابندیاں اور ان سے ممکنہ آزادی، حق الحق انوار اور الا اللہ کی بو جھل کیفیتیں۔ اس گوشے کے اندر کون بیٹھا ہوا ہے، اس کا اصلی مکان کہاں ہے، جہانِ رنگ و بو کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے، یہ مشکل سوالات حل نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کا حل نہ زبان کے پاس اور نہ قلم کے ہاتھ میں۔ اگر خریدار محبت کے دل میں شعلۂ عشق بھڑک رہا ہو، اگر وہ اس جذبے کی شدت سے جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہو تو وہ اس گوشے کی طرف پیش قدمی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور مشکل معاملات کے کشاد کی قابلیت۔ مگر جذبۂ عشق کسبی کم ہے عطائی زیادہ۔ اگر دربار میں صاحب کی ایک نظر عنایت نصیب ہوئی، تو آناً فاناً عشق کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قلندرانہ مزاج ملنگوں کا خاصا ہے، اس کے سامنے عنایت بھری نگاہیں نہ مشکل ہیں نہ شاذ۔ اس لئے اس دربار میں جانا بجائے خود ایک بہت ہی بڑی خوش بختی ہے۔

صاحب کے دربار کا ایک بہت بڑا جز ہے لنگر جو اسے اور بڑے درباروں کے ساتھ ملاتا ہے۔ آج کے درباروں کے ساتھ یا گذرے ہوئے زمانے کے۔ اولیاء اللہ کا طریقہ ہے دوسروں کو کھلانا پلانا،

رسول میر آسمان شہباز دوُرے
گُچھو تروومت عشقُک دُکان
وۆیِوہ ماشتو ژھیٖوہ ٹوٗرہ ٹوٗرے
یِم پِھو موُرے للہِ وُن نار
رسول میر

مسافروں کو، راہ گیروں کو، بے گھروں اور بے کسوں کو، یتیموں اور ناداروں کو۔ یہ
پیغمبروں کا خاصا بھی رہا ہے اور حاتم طائی جیسے مالداروں کا۔ اسلام کی تعلیمات جگہ
جگہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ قسمت کے ماروں غریبوں کا خیال رکھو اور انہیں
کھلاؤ پلاؤ۔ عذاب سے بچنے کا ایک اچھا طریقہ ہے کھلانا پلانا، حاجت نکالنا اور
غلامی سے آزاد کرنا۔ لنگر لگانے کا سب سے بڑا مقصد ہے انسان اور انسان کے
درمیاں کھڑے کیئے ہوئے نقلی دیوار گرانا، میل ملاپ اور محبت کے تعلقات قائم کرنا
اور وحدت انسانی کے مضبوط وسیلے قائم کرنا تا کہ انسان جھوٹی دولت
نسلی، سماجی، اقتصادی یا نام نہاد ثقافتی نخوت کے تباہ کن بت غارت
شاہد خدا کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ کر وحدت قائم کرے۔ الفت میں
میں نہیں، نہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی دیوار کھڑی ہے۔ یہاں تو ایک ہی صف
میں محمود غزنوی بھی کھڑا ہے اور اس کا غلام ایاز بھی۔ ابجد عشق میں تفریق اور نفاق
تلاش مت کرو۔ اس سے شخصیت کوڑھ میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ وحدت
اور اس کے بیچ کھڑے ہوجاؤ۔ یہ عبارت لنگر کے تختۂ جبیں پر لکھی ہوئی ہے۔
صاحب کے دربار میں رات دن، صبح وشام، ہر وقت اور ہر موسم میں لوگوں کا تانتا
بندھا رہتا ہے۔ یہ لوگ ہر جگہ سے آتے ہیں اور کسی بھی فرقے اور قوم کے ساتھ
تعلق رکھتے ہیں۔ ان کیلئے کھانے پینے کا باقاعدہ انتظام ہوتا ہے۔ یہاں جو آیا
بھوکا رہ نہی سکتا۔ رات گذارنے کیلئے اچھی سی جگہ کا انتظام بھی ہے۔ غسل خانے
بھی ہیں اور واش رومز بھی۔ بستر بھی مہیا ہیں، لوگ اکٹھے بیٹھتے ہیں، کھاتے پیتے
ہیں اور دکھ سکھ بانٹنے کیلئے باتیں بھی کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں، مرد،
عورتیں، بچے، بوڑھے، سب اکٹھے کھاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ باورچی کسی
ہدایت کے بغیر ہی پکاتا رہتا ہے۔ اس کا من ہی اس کو بتاتا ہے کہ کس وقت کتنا
پکائے۔ شاید ہی کوئی موقعہ ایسا آیا ہو جب سائل آئے اور کھانے پینے کی کمی رہی۔
ہامہ رے کی بخت تو تقریباً ہر وقت لنگر میں موجود رہتی ہے مگر اس کے علاوہ بہت
سارے مرد اور عورتیں کام کرتی ہیں۔ کام بہت تیزی اور سلیقے سے ہوتا ہے اور

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
غالبؔ

سخاوت مس عیب را کیمیا است
سخاوت همه درد هارا دواست
کریما سعدیؔ

کھانے پینے کے برتن صاف کئے جاتے ہیں جلدی جلدی۔ سبزیوں کا خاصا انتظام ہے۔ صاحب کے گھر کے پاس کنال آدھ کنال کا چھوٹا سا باغیچہ ہے جس میں سبزیاں اگائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی بازار سے بھی سبزیاں لائی جاتی ہیں اور روٹیاں۔ مگر کبھی لوگ بھی دال جیسی چیزیں اور روٹیاں خود بخود لاتے ہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے اور کافی۔ اس کے پالنے کا بھی خاص انتظام ہے۔ زمیندار عورتیں اپنے ساتھ دو دو تین تین کلو چاول لاتی ہیں اور کبھی کبھی مرغے بھی۔ مرغے خوب کٹتے ہیں۔ دربار میں تقریباً روز بھیڑ ذبح ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی مرضی سے ہی بھیڑ لاتے ہیں، کسی کا دباؤ نہیں ہوتا، کوئی مانگتا نہیں، کسی کی فرمائش نہیں ہوتی۔ کھانے والا بھی کوئی خاص شخص نہیں ہوتا۔ کوئی خاص گروپ نہیں ہوتا۔ جو آیا، جس نے کھانا چاہا کھایا۔ روز سو دو سو آدمی کھانا کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی لوگوں کا اژدھام ہوتا ہے، اس دن تو چار چار پانچ پانچ سو لوگ کھاتے ہیں۔ اتوار کے دن ایسے اژدھام نظر آتے ہیں۔ لنگر کے پاس پیٹی ہوتی ہے جس میں لوگ نقدی ڈالتے ہیں، دس روپے، بیس، پچاس، سو روپے، جس کی جو مرضی۔ پیٹی سے ہی لنگر کا خرچہ پورا ہوتا ہے۔ جتنی پیٹی اتنا خرچہ، جتنا خرچہ اتنی پیٹی۔ بھیڑ، مرغ، سبزیاں، دودھ، دال، انڈے اور ضرب ڈبل روپیہ، ان سب چیزوں کے مطالب اور وجوہات صاحب کو معلوم ہیں۔ جس طرح اور باتیں پردے میں، اسی طرح مرغا اور انڈا اور باقی چیزوں کے اصلی روپ بھی پردے میں۔ کیا نقاب اوڑھا ہے حقیقت نے۔ مجھ کو ہی پردہ بنا کر مجھ سے چھپ چھپ کے اپنا تعمیری اور تخلیقی کام کرتی رہتی ہے۔ واہ رے، خداوندا خدائی بھی کیا دردِ سر ہے!

سماوار اور اس کے ساتھ گُلہ گور جیسا مغ

بچہ! یہ سماوار صاحب کے لنگر کے ترانے ہیں، ترانۂ وحدت، ترانۂ محبت اور ترانۂ دستگیری۔ جناب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی وصال کے پیمانوں میں پلاتے تھے اور دریائے معرفت کے ساتھ جوڑتے تھے۔ صاحب کے سماواروں میں چھوٹے چھوٹے، کبھی کبھی بڑے بڑے، کوئلے ڈالے جاتے ہیں۔ ان کا سلگاؤ شروع ہوگیا تو ایک عجیب [illegible] کے پردوں کو چھیڑتا ہوا دل کے تہہ خانوں [illegible] ہوگیا۔ وہاں دل سے پرستانوں کے نغمے اچھلنے لگتے ہیں اور سننے والے معانی سمجھ سمجھ کر نہ جانے کہاں پہنچ [illegible] اور عبدالقادر گنگوہؒ کی طرح واپس نہیں آنا چاہتے۔ کچھ [illegible] کے نغمے گانے لگتے ہیں اور گُل گور کی طرح سماوار [illegible] طبلہ سمجھنے لگتے ہیں۔ طنبور و طبلہ کی آواز خوش آئندہ سہی مگر سماوار تو تانبے کی طرح انسان کو حرارت سے بھر دیتا ہے اور پانیوں میں ڈبو لیتا ہے۔

سماوار سے چائے بھی کیا چائے [illegible] شراب پلائی جاتی ہے جس کا رنگ کالے انگور کے خالص رس جیسا ہوتا ہے۔ کم کم نمک سے اس کا رنگ اور کھلتا ہے اور نشیلا بن جاتا ہے، دیکھنے میں بھی نشیلا اور پینے میں زیادہ نشیلا۔ جو بھی دربار میں قدم رکھتا ہے، اسے ضرور پلائی جاتی ہے یہ شرابِ طہور، گھونٹ دو گھونٹ ہی سہی۔ کوئی خست، کوئی بخل نہیں پلانے میں کیونکہ ایسا کرنا ساقیِ کوثر کے باب میں سوئے ظن ہے۔ کوئی کبھی کسی اچھے موسم میں اتنی پیتا ہے، اتنی پیتا ہے کہ اس کی جائے نماز ہی بھیگ جاتی ہے اور لوگ
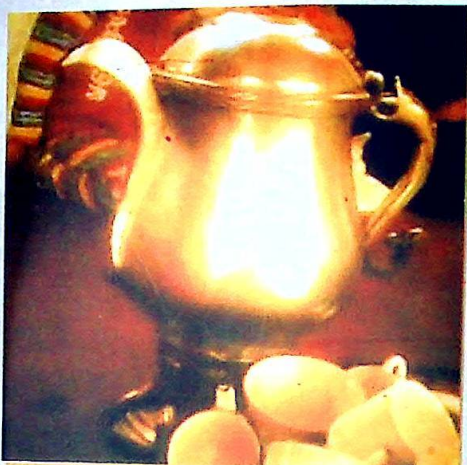
مائی ڈیر سماوار! مزاج شریف؟

تیری چائے جوشی اور چائے پسندی کا عاشق احد بب آف سوپور آج بھی تمہاری لذّتوں اور ثقافتی سرگرمیوں کی تحسین کر رہا ہے۔ تم نے خطہ بے نظیر کشمیر کے خالی معدوں کو گلے سے لگایا ہے۔ انہیں اس کا پورا پورا احساس ہے اور وہ آپ کو شاباش کہتے ہیں۔ تم نے کتنے رنگ بدلائے اور کن کن جامی سرمستیوں سے میرے نامدار ملنگ اور اس کے سائلوں کی خاطر تواضع کی۔ میرے ہاتھوں میں ہوتا تو کلچرل اکیڈمی کا خصوصی ایوارڈ تمہیں دلاتا۔ مگر ایک آوارہ، بے ہوش و حواس، صاحب کے قدموں میں گرا ہوا انسان آپ کی خاطر مدارات کیسے کر سکتا ہے۔ آپ کے ملنگ کی یاد آ رہی ہے اس وقت بھی۔ چاہتا ہوں کہ روتے روتے اپنا بوجھ ہلکا کروں۔ مجھے اپنی کرم فرمائیوں میں بھول نہ جانا میرے دوست۔

مسافر حبیب

اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اسے طعنے بھی دیتے ہیں مگر انہیں کیا معلوم کہ اسنے خود نہیں پی لی بلکہ اسے پلائی گئی اور پلائے بھی گئی فرطِ محبت سے۔ اب بتایئے کہ یوسفؑ کی طرح اس کی قمیض پیچھے سے پھاڑ دی جائے اور ہنسا بھی جائے اوپر! یہ کیسی بے انصافی ہے۔ محبت کی رسمیں بارہا ایسی ٹیڑھی ترچھی ہوتی ہیں کہ انسان کو شش و پنج میں ڈال دیتی ہیں۔ چہ رسوانہیں کرتیں اسے!

ہمیں رسوائیوں سے کیا گلہ کیوں خوف ہو طاری
اگر مجنون نہ ہو گائل تو سنگ و خشت بے کاری

پلاؤ آج تلچھٹ بھی کہ کل تک کون جیتا ہے
گداکر تیرے کوچے سے نہ نکلے آج تک خالی

لگی ہے چوٹ کچھ ایسی بہت رنجیدہ خاطر ہوں
مجھے سیّال آگوں سے محبت ہے میرے ساقی

گل و مُل کے وہی شیدا کہ جن کا نام ہے بلبل
دکھائی کس نے اُن کو مدھ بھرے رنگوں کی گل کاری

میرا مٹنا نہیں آسان کہ مجھ کو تھام لیتی ہے
چھلکتے جام کی رقّاص آتش باز شہنائی

وہیں آنکھیں وہی خوں خوار نظریں اور وہی قربت
پلاتی ہے مجھے ہونٹوں سے چھو چھو اصل انگوری

حبیب
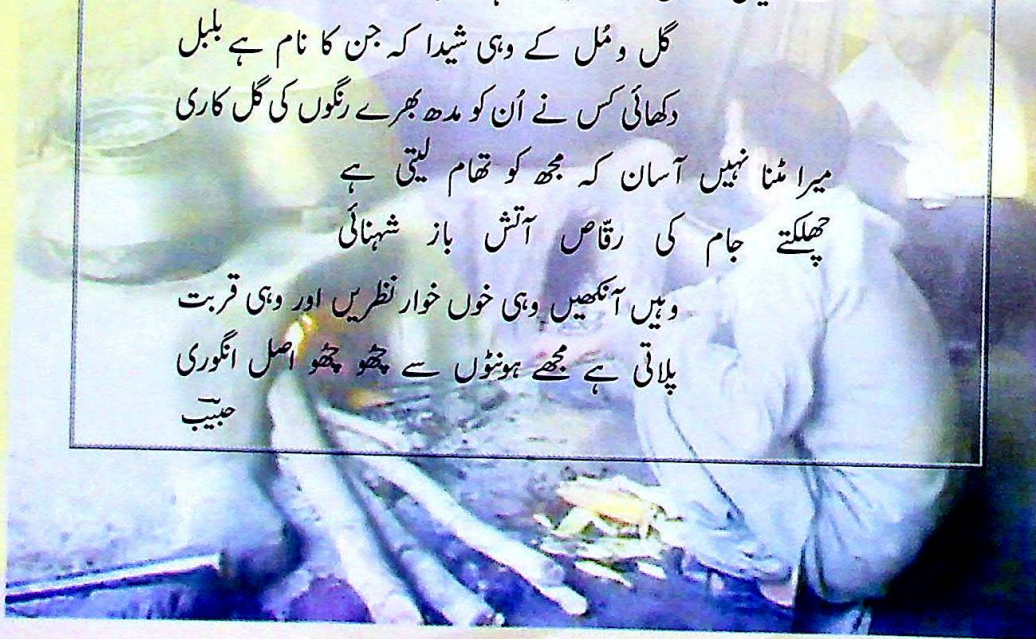
صاحب اپنے سائلوں، مریدوں یا چاہنے والوں سے عام طور پر گھر پر ہی ملتے ہیں مگر کبھی کبھی وہ گھر سے باہر بھی جاتے ہیں۔ ان کا گھر پر رہنا یا گھر سے باہر جانا بھی اضافی (relative) ہے کیونکہ ان کا گھر کہیں نہیں اور اندر باہر جگہ جگہ ان کا گھر، کل بھی تھا، آج بھی ہے اور کل بھی ہوگا اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں لوگ انکے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اگر یہ کہیں جن و ملائکہ بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور یقیناً پیچھے پیچھے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ کیوں چلتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو سڑکوں، بازاروں یا کہیں بھی صاحب کا دربار لگتا ہے۔ چند ایک جگہوں کا ذکر کر جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں صاحب ایسی جگہوں پر بہت کم عرصے کیلئے ٹھہرتے ہیں کبھی دس پندرہ منٹ، کبھی بیس تیس منٹ اور واپس۔ ان جگہوں پر وہ کن امور میں مصروف رہتے ہیں، اس بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہم نے سنا ہے، اور کہنے والے غلام نبی بلاّ جیسے لوگ ہیں کہ ان کے سڑک پر نکلنے سے ٹریفک میں خلل پڑتا تھا اور پھر پولیس آتی تھی، صاحب سے منت سماجت کر کے صاحب سرکتے تھے اور ٹریفک شروع ہو جاتی تھی۔ تاہم میں نے ان کے ساتھ ستائیس سال گزارے، کبھی ایسا واقع نہ آیا۔ البتہ ایک دن صاحب بار ہمولہ کے قریب فوجی افسروں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ 88-1987ء کا زمانہ تھا۔ صاحب کسی وقت کسی انسان پر ٹوٹ پڑتے ہیں، چاہے وہ پولیس افسر ہو، ملٹری افسر ہو، کوئی جسٹس لکرو صاحب ہو یا بندۂ ناچیز ان کی خاک چاٹنے والا۔

ان کے چاہنے والے کبھی منت سماجت کر کے انہیں دعوت پر اپنے گھر لے جاتے ہیں اور صاحب ان کے گھر میں ٹھہر جاتے ہیں۔ خالق صاحب کے گھر میں ایک خاص کمرے میں بیٹھتے تھے۔ میں نے بھی اس کمرے میں ان کے ساتھ کئی دن گذارے ہیں۔ ایک رات میں اکیلا صاحب کے کمرے میں سویا ہوا تھا، رات کے وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا ہوں کہ صاحب میرے سرہانے پر کھڑے ہیں۔ میں

گھبرا کر بیٹھنے لگا مگر صاحب سرک گئے اور اپنے بسترے میں سو گئے۔ نثار ککرو صاحب بھی انہیں گھر لے جاتے اور کبھی کبھی ان کے شوق میں محفل موسیقی بھی سجاتے۔ وہ اور ان کی گھر والی صاحب کو شوق سے کھلاتے پلاتے۔ نثار صاحب کے بچے بھی صاحب کے پاس بیٹھنے کی سعادت حاصل کرتے۔ خاص کر طارق ککرو۔ وہ تو صاحب کے ساتھ بے تکلف بات کرتے تھے شاید اسلئے بھی کہ اس کا جنم ہوا تھا صاحب کی دعا سے۔ ایک دن جب بارہمولہ میں صاحب سڑک پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے، ککرو صاحب کی بڑی صاحب زادی کا ایکسی ڈنٹ ہوا اور فوت ہوگئی۔ وہ بیرون ریاست تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ککرو صاحب کو اس بارے میں اشارہ بھی ملا تھا۔ صاحب سرینگر بھی جاتے تھے، حبیب اللہ ڈار کے گھر، ستار صاحب اور حلیمہ کے گھر، غلام رسول بٹ کے گھر، عبدالرشید بڈیاری کے گھر۔ ایک دفعہ میں بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا کہ وہ بولوارڈ گگری بل میں کسی خضر محمد اور شاہینہ کے گھر سے بھی گذر گئے۔ غلام رسول کے گھر وہ صحن میں بیٹھتے اور مزے سے چائے پیتے۔ وہاں عبدالرشید مرحوم اور محمد صدیق جیسے چاہنے والے مرید ان کی طرف شوق سے دیکھتے رہتے۔ ایک دن اسی گھر میں میں نے ایک رات گذاری۔ محفل موسیقی میں ساز و آواز سے سماں بندھ گیا تھا اور میں صاحب کے
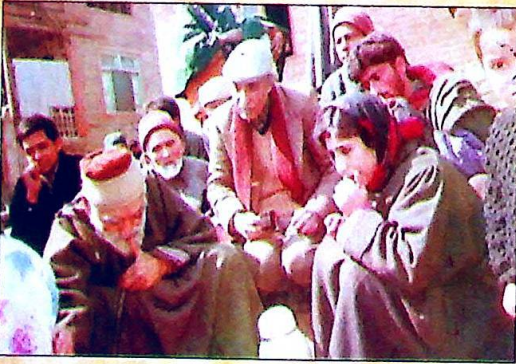
سامنے بیٹھا ہوا رات بھر غزلیں لکھ رہا تھا۔ غلام رسول صاحب چائے کے فنجاں میرے ہاتھ میں دے رہے تھے اور غزلیں نوکِ قلم پر بلا کسی کسب کے چڑھ رہی تھیں۔ واہ رے صاحب اور اُن کا دربار، پائندہ و درخشندہ!

ایک دن اسی طرح رشید بڈیاری کے گھر پر صاحب تشریف فرما تھے اور ہم ذوق وشوق سے عرفانی سمندر کے موجوں کو دیکھ رہے تھے یعنی صوفیانہ اشعار مغنّیوں کے حلق سے سُن رہے تھے۔ رشید پروانے کی طرح صاحب کا طواف کر رہا تھا اور اس کے گھر والے بھی۔ وہ موسیقاروں کی بھی خوب خاطر کر رہے تھے۔ اُسی شب صاحب کے بچے بھی بڈیاری کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہیں بھی بڈیاری نے مدعو کیا تھا۔ عطا محمد صاحب بڈیاری پر بہت مہربان ہیں۔

صاحب کا دربار کبھی کبھی صحت افزا مقامات کو بھی زینت بخشتا تھا۔ گلمرگ، پہلگام، ڈکسم وغیرہ۔ عشق کبھی کوہ ودمن کی تنہائیاں ڈھونڈتا ہے اور وہاں من کا پنچھی نہ جانے کن کن بلندیوں پر اُڑنے لگتا ہے!

یہ اُچھلن ترے سینے کی محبت ساز افسانہ
جنونِ عشق و مستی کا سجا دیرینہ میخانہ
پلائے الفتوں کی راگنی رنگین جاموں میں
کوئی گاتا ہے میٹھے گیت تنہائی میں دیوانہ
چلو بے باکیوں سے رشتہ جوڑیں جام پی پی کے
میرا چالاک سیّاں خود بھرے ہیں دیکھو پیمانہ
نہ کر اپنی نگاہوں سے خود اپنی خانہ ویرانی
جواں سالی کا تجھ کو غم نہیں [illegible]
مچلنا یوں تڑپنا پیچ کھا کھا [illegible]
خود اپنے نار میں جلنا مثال [illegible]
تمہاری آرزوئیں پوجتی ہیں آگ [illegible]
بہاریں خود سجانا اے مرے فرزند فرزانہ
شفائی محفلوں میں تجھ کو ڈھونڈے ہے [illegible]
دل مضطر تیری بنسی بجائے نَے پیچانہ
(اقتباس حبیب، جولائی 1996ء، عیدگاہ سرینگر)

نغمہ ونے

صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ کمرہ کچھا کچھ بھرا ہوا ہے، ہر قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، مرد، عورتیں، بچے، بڑھے سازندے یا موسیقار بیچ میں دائرہ لگائے بیٹھے ہیں۔ کوئی رباب بجا رہا ہے کوئی سارنگا، سنطور، کوئی بینجو بجا رہا ہے اور کوئی ہارمونیم، کسی کے پاس مٹی کا گھڑا ہے میں کشمیری پانی رکھتے ہیں، وہی بجا رہا ہے ہاتھ سے۔ زیادہ نئے سامان نہیں مثلاً پیانو یا باجا یا طبلہ۔ ہم آہنگ آوازیں نکل رہی ہیں اور عالم غنا برجستہ ہے۔ شوق و ذوق بھی کارفرما ہے، کم یا زیادہ۔ سازینے میں کشمیری حق پرستوں، صوفیوں کے نغمات اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں جس طرح خون کے اندر ساری ترکیبات جن سے انسان کی حیات جلوہ افروز ہے عالم رنگ و بو میں یا کون و مکان میں۔ عمہ صوفی ہو یا شاخساز، غلام نبی بلبل ہو یا گلزار، کوئی دُھلا منجھا فنکار ہو یا گاؤں کا کوئی آوازوں کے ساتھ کھیلنے والا اناڑی، احمد بٹواری صاحب کا کلام ہو یا رسول میر صاحب کا، نعمہ صاحب کا کلام سازوں پر چڑھتا ہو یا شمس فقیر صاحب کا، سب سن رہے ہیں، وہ بھی جن کی کھڑکیاں بند ہیں اور وہ بھی جن کے دل کے کواڑ کھول دئے گئے ہیں۔ صاحب سن رہے ہیں

پوشہٕ لنجن پٹھ گیوان بلبل تہٕ کستورؠ شوقہٕ سان
شور ووتھمت عالمس عشقس تہٕ حُسنس مان مان
ساز و سنطور کُس چھُ وایان ناگہٕ رادن منز کولن
مشک سونتک منز گُلالن باشہٕ کرؠ کرؠ زَن اَسان
تاپھ سوت سوت مس چھُ گومت تِل گوگل پوشن اَندر
وِگنہ وَن وُن بوزؠ بوزؠ پوٚنپرؠ تہ بنبر منڈٕ چھان
شامہ سوندر دوہی دوہس زُلفن ملان عطرِ گلاب
تارکن ہند ساز وایان راتی راتس آسمان
سوز و سازس موت گومت جانانہٕ پران پانہٕ واز
حرفہٕ حرفے معنہِ ژاران میون ذُو بوزان قرآن
زہر بورنم ناگہٕ بلہ کی کالہٕ سرفن ٹوپھ دِژم
نالؠ ترأوتھ مار کلمار بین وایان لسہٕ خان
آسمان پھوٹ تراس گو روئے زمینس شور ووتھ
لامکانس پٹھ شفا آسؠ بأتنی میانین سنان
حبیب

یاسنا رہے ہیں، یہ بات غور کرنے کے لائق ہے۔ اگر سمجھ میں آگئی تو معاملہ صاف ہو گیا، نا تو گانا سنو اور چلے جاؤ! تاہم چلے جانا بھی فضول نہیں۔ اذان سننا بھی بڑی بات ہے مگر ''میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے بغیر کچھ نہیں'' جاننا تو بات ہی کچھ اور ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں something is better than nothing جو ملے سو واہ واہ! لہٰذا اذان سننا بھی اپنی جگہ پہ ٹھیک۔ اسی طرح خوش آئندہ آواز دوست اگر کانوں کو چھو لے، وہ بھی واہ واہ!

نار عشقنی یارِ زولتھس راوہ روتھم آدنو

مرتبا دیوتنے ژے زاتن ہر طرف چھے ملونو

ٹھیک ہے کہ عشق کی آگ کے معانی سمجھنا اور اس آگ سے زندگی پانا اُن لوگوں کیلئے مشکل [illegible] فاروق رینزو صاحب گناہ کے سیاہ سمندر میں غوطہ لگایا ہو، ٹھیک [illegible] خدا کی آواز سننا حضرت موسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دل گردہ ہے، [illegible] جو موسیٰؑ کا دم بھرتے ہیں مگر عراق میں دس لاکھ عورتوں کو بیواؤں کی [illegible] نے پر مجبور کرتے ہیں، ٹھیک ہے انسان کی اصلی زندگی کا راز سمجھنا ہر ایک انسان کے بس کی بات نہیں، مگر مالک دو جہاں کی طاقت اور اس کے بے پایاں رحم کے سامنے یہ ناممکن نہیں کہ شمس صاحب کا یہ شعر سنتے سنتے گنہگار انسان بھی آن کی آن میں عارف اور خدا دوست بن جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گنگناتے گنگناتے سینے میں عشق کا شعلہ بھڑک اٹھے اور منصوبہ الٰہی جس کی ابتدا ازل سے ہوئی تھی یا کشمیری زبان میں آدن سے، دفعتاً سمجھ میں آئے تاکہ مرتبۂ انسان آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جائے، ظہور الٰہی شش جہت میں نظر آئے اور ساز بجنے لگیں جنہیں سازندے عارفوں کی زبان میں شش کل کہتے ہیں۔ ان سازوں کے ساتھ وہی آواز شامل ہوتی ہے جو مولانا جلال الدین رومیؒ کو بھی سنائی دی تھی اور جس سے انہوں نے مشہور و معروف ضخیم کتاب مثنوی شروع کی تھی۔ یہی آواز کشمیر کے مشہور عارف احمد صاحب بٹواری کو بھی سنائی دیتی تھی اور اس کو نچواتی تھی، رومی کی طرح نہیں، اپنے انداز میں البتہ۔ اندر سبھا یا اندر راجا کا دربار جمتا تھا، پریاں ناچنے گانے لگتی تھیں، مستیوں کا عالم چھا جاتا تھا جو منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کی کیفیات پیدا کر دیتا تھا۔ ایسی کیفیات اُس وقت بھی جنوں پیدا کر دیتی تھیں اور اِس وقت

عمرِ ہزار سالہ گر بوئی او شمیرے
در نیم ساعتش او مرد کار بودے
شاہ ہمدانؒ

بشنو از نے چون حکایت میکند
وز جدائی ہا شکایت میکند
رومیؒ

بھی ان لوگوں میں جنہیں لوگ اپنی دیوانگی کا شکار بناتے ہیں اور ان پر طنز اور نفرت کے کلمات پھینک دیتے ہیں۔ یہ سنگ باری ایسے زخم پیدا کرتی ہے جو کبھی بھرتے نہیں۔ ایسے ہی زخم صاحب کے نازنین پیروں پر لگے تھے جو آخری دم تک بھر نہ سکے۔ اندر کے زخم دیکھے کس نے، کوئی دیکھتا تو اُن پر اپنی جان فدا کرتا!

صاحب غنائی محفلوں کا انتظام کراتے تھے تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مقاصد حاصل کئے جائیں، خاص کر ان لوگوں کیلئے جنہیں غربت، مفلسی، جہالت، رذالت اور نفرت سخت بنا دیتی ہے، جن کے احساسات اور جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، جن کی توجہ عموماً روٹی کپڑا اور مکان کے مشکل مسئلوں میں جذب ہوتی رہتی ہے، اسلئے جن کا شوق و ذوق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ساز جب بجتے ہیں تو ہم آہنگ آوازیں انسان کا دھیان یکا یک اپنی طرف کر دیتی ہیں۔ انسان کا خون گرم ہونے لگتا ہے اور انسان کی نسیں آرام کرنے لگتی ہیں کیونکہ ان کا کھچاؤ قدرتی طور پر کم ہو جاتا ہے۔ ذہن موزونیت سے کام کرنے لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پانی کی دھاریں بہتی ہیں اور خیالات کی آبشاریں گرنے لگتی ہیں۔ یہ خاصا انسانوں کا ہی نہیں۔ کسے معلوم نہیں کہ گرم علاقوں میں سانپ زیادہ زہریلے ہوتے ہیں مگر آواز خوش خاص کر بانسری یا بین سے بے حس ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ڈنک مارنا بھول تو جاتے ہی ہیں مگر بے خودی کے عالم میں سپیروں کے پٹارے میں بند ہو جاتے ہیں جو سپیرے بانسری یا بین بجانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ہاتھی، بھینس، گائیں اور اور جانور آواز خوش، موسیقی اور رنگ پسند کرتے ہیں۔ گائیں تو موسیقی سن کر دودھ کی دھاریں جسم سے خارج کرتی ہیں، ارادوں سے نہیں کیونکہ ان کے ارادوں پر آوازوں کا جادو پھینک دیا گیا ہوتا ہے اور وہ نشوں کے عالم میں نہ جانے کہاں کہاں کھوئی کھوئی ہوتی ہیں۔ اُڑنے والے پنچھیوں کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ تو ڈالی ڈالی گھڑی گھڑی اپنے سازینوں اور غنائیوں میں مست ہوتے ہیں۔ حسن کے شیدائی یہ دو دو پنکھ والے پکھیرو جب گاتے ہیں تو نہ جانے ان کے گیتوں میں رس کے ساتھ ساتھ کس کیسے بھرا ہوتا ہے۔ رس اور کس یونہی پیدا کیسے ہوگا۔ اس میں کسی غیبی طاقت کی کارفرمائی ضرور ہوگی۔ اس طاقت نے بہت سارے پنچھیوں کے گلے پروئے ہوتے ہیں اس کاری گری سے کہ انسان کا دماغ بھی چکرانے لگتا ہے۔ پپیہو کی مثال لیجئے یا ہُد ہُد کی۔ ہم تو بس رک جاتے ہیں، دم بخود ہو جاتے ہیں ان کی بین سن کر، اُن کی سرگمی آواز سن کر ان کی آوازوں کے مؤثر محسوس کر کے اور ان کی محویت دیکھ کر۔ کون ظالم ایسا ہوگا جو ان کا گلا بند کرے یا انہیں پنجروں میں اس طرح بند کرے کہ وہ گا نہ سکیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ	وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی	اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

آتی نہیں صدائیں اس کی میرے قفس میں
ہوتی میری رہائی اے کاش میرے بس میں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہوگیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اقبال

میرا بس چلتا تو ایک ایک پرندے، ایک ایک خوش گلو پنچھی یا خوش رنگ پکھیرو کے گلے میں رنگ برنگے پھولوں کے ہار ڈالتا، انہیں وہ سب کچھ کھلاتا جو وہ پسند کرتے! خاص خاص موقعوں پر یہ پنچھی صاحب زادے اپنی مدھر، موزون اور سریلی تانوں سے سحر پھینکتے ہیں، ادھر اُدھر اور ہر طرف، اپنے ہم جنسوں پر ہی نہیں، ہم انسانوں پر بھی جو دل ہی دل میں سلیمان علیہ السّلام کی بھی داد دیتے ہیں جو پنچھیوں کے بھی پیامبر تھے اور داؤد علیہ السلام کی بھی جن کی آواز کی مدھرتا لوہے کو بھی موم بنا دیتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ہُد ہُد کی آواز نر مادہ دعوتوں کو بھی قبول کر لیتی ہے اور ککو کی آوازوں میں اس لحاظ سے اور بھی زیادہ جان ہوتی ہے۔ قمری و بلبل، ہزار و درّاج و سار تو ایرانی ادب کا سرمایہ لازوال ہے جو ہندوپاک کے سینے میں گھس کر خوب کرتب دکھا چکا ہے بلکہ دکھا بھی رہا ہے۔ اسی طرح ورڈس ورتھ، کیٹس اور شیلے جیسے انگریزی شاعر بھی اپنے گیتوں میں اپنے بھی سُر لا چکے ہیں اور آزاد پرندوں کے بھی۔ شیلے نے تو سکے لارک میں خوب خوب روحانی اڑانیں کی ہیں۔ ٹھیک ہے کہ مغرب کے گھر گھر میں باخ، موزارٹ اور بی ٹوون جیسے سروں کے ساتھ کھیلنے والے مشاق نہیں اور نہ کسی جگہ ہوتے ہیں مگر جس طرح مغرب میں سروں اور آوازوں پر سر دُھننے والے بلکہ جاں دینے والے موجود ہیں اسی طرح مشرق میں بھی آوازوں اور سروں کے متوالے موجود ہیں اور وہ بھی بہ کثرت۔ یہاں کشمیر میں اُس وقت بھی راستوں راستوں پر موسیقی اور گلوکاروں کے کیسٹ بکتے تھے جس وقت بندوقوں کی گھن گرج زمین کو بھی ہلاتی تھی اور خوف و دہشت کا بازار بھی بہت گرم کرتی تھی۔ ہمیں قدرت کی صنّاعیوں اور مہربانیوں کا پورا پورا اور خوب خوب احساس ہونا چاہیے جیسے ہمارے صاحب کو بہترین اور اعلیٰ پایہ سطح پر تھا۔ اس لئے وہ کشمیری موسیقاروں اور صوفیانہ موسیقی کے

خوبصورت پھول مالا میں پہن کے آئی ہوں پریتما دیکھو رنگ کیسے تیرے لیے لائی ہوں
پیتی رہتی ہوں تیری الفت میں میں جام فنا تیرے سایوں میں سندرتا کی چتا میں پائی ہوں

— حبیب

استادوں کو تھپکی بھی دیتے تھے، تحسینی کلمات سے بھی کسی نہ کسی طریقے سے اپنے خاص انداز میں نوازتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ شامل کر کے اولی الامر منکم میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ اپنے سائلوں، مریدوں، طلب گاروں اور عاشقوں کی پرورش کرتے تھے یعنی اُن کے ذوق و شوق کی آبیاری کرتے تھے، ان کے تن بدن میں عرفانی آگ سُلگاتے تھے تاکہ حقیقت انہیں چاروں اور ہی نہیں بلکہ گرداگرد گھیر لے۔ سازندے سازوں میں صوفیانہ کلام کی مدد سے عشق کی حرارت بھر دیتے تھے۔ غفار کانہامی جیسے سیدھے سادھے گویے اپنے حلقی کرتبوں سے "سوندر مال گجسے چانیے مایہ، لگیوژھا یہ ہامدنو" "لالہ رولیس پیالہ کمر بریے لو، کالہ مویس شانہ کمر کریے لو" یا "صبح شامس لگی دامس کم کم

محل کی رانی دوشیزہ ہو بڑی عالی نسب
یوں بلند مینار میں الفت چھپانا کیا غضب
عشق کی شاداب مستی یوں چھلکتے جھومنا
سوز و ساز چاہ سے دل توڑنا من موہنا
رس بھری تنہائیاں ڈھونڈیں تسلی جس طرح
مدھ بھری تیری جوانی من کو ڈولے اس طرح
ہے ازل پرواز تیرا شمۂ رب جلیل

شیلے ترجمہ: حبیب

My heart aches, and a drowsy numbness pains
My sense, as though of hamlock I had drunk
Or emptied some dull opiate to the drains
One minute past, and Lethe-wards had sunk;
'Tis not through envy of thy happy lot,
But being too happy in thine happiness,-
That thou, light-winged Drayad of the trees,
In some melodious plot
Of beechen green, and shadows numberless,
Singest of summer in full-throated ease.

Keats

بے حسی چھائی ہے مجھ پر درد سے ہے دل بھرا
زہرِ قاتل کھایا ہے کچھ ایسا ہی ہے ماجرا
یا ابھی نالی میں افیون پھینک کر آیا ہوں میں
خود فراموشی کے دریا میں گرا جاتا ہوں میں
تیری خوشیوں پر مجھے کیوں حسد ہو کیوں رشک ہو
دل میرا لبریز ہے فرطِ محبت سے سنو
گاتے ہو پیڑوں پہ خوش خوش اے غنا کے دیوتا
پنکھ تیرے ہلکے ہلکے تیری اُڑان کی ادا
سبز میدانوں میں تیرے گیت مدھرتا کا رس
بے عدد سایوں کے بیچوں بیچ ترنم کا گس
دل تیرا آباد ہے گاتے ہو بن کے خوش گلو
بن کی دیوی گرم فضاؤں کی تم ہو آبرو

ماخوذ از ترانہ بلبل، کیٹس: ترجمہ حبیب

گیلی آنکھوں نے کھِلایا تیرا چہرہ لالہ زار
میری کنگھیوں نے سنوارے بال تیرے سیاہ مار

ترجمہ: حبیب

O blithe newcomer! I have heard,
I hear thee and rejoice:
O cuckoo! shall I call thee Bird,
Or but a wandering Voice?

Thrice welcome, darling of the Spring!
Even yet thou art to me
No bird, but an invisible thing,
A voice, a mystery.

Wordsworth

سرانداز، گومنصور منہٕ سرٕہ پوراز دل سرافراز'' گا گا کر سماں میں آگ لگا دیتے تھے تو صاحب اپنا جال بچھا دیتے تھے اور معنیوں کے آبشار سلسبیلوں کے رنگ میں دلوں اور دماغوں پر گرا دیتے تھے۔ جب مرحوم غلام احمد صوفی ... عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی، کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی'' کے ساتھ وازہ محمود کے جگر پاش ... ساز و سرود میون بوز، گنگہٕ گرٕ ھتھی سودرِہ دی زیم تار میے۔ تنگل ہیو ... میے ننگل جل، جنگل میہٕ زۄل کرایے دِل تلتھ آس'' کے ساتھ ملا دیتے تھے، تب گاؤں کے اناڑی تک صاحب کی نشیلی آنکھوں کے ساتھ آنکھیں اس طرح چار کر دیتے تھے کہ گویا دل سے دل مل گئے ہوں اور حوروں کی زبانی ''دِلس تہٕ دلس میوٗل چھو

چنگ داوٗد ساز و سرود سن میرا
ماورا گنگ و سمندر سے بڑا
آگ لگی جنگل جنگل دل جلا
عشق کی آتش سے آخر گُل کھلا

ترجمہ: حبیب

گومت ساتی اذ کارس'' فضاؤں میں گونج رہا ہو۔ اچانک سازندے رُک جاتے کہ وقفہ ہو اور کوئی دیوانہ لحن داوٗدی میں فلک پاش صدائے درد بلند کرتے کرتے خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رُلاتا: ''گل روی، سنبل موے، عنبر بوی نرگس چشم، تتھ

گل روی، سنبل موی، عنبر بوی نرگس چشم
فردوس جیسے باغ مدینے کا جاہ و حشم

ترجمہ: حبیب

تاج سر پر رکھ دیا منصور کو
دل بڑا چالاک نکلا کام میں
پھنس گئے سجاد کتنے دام میں
کھوگئیں صبحیں بہتیری شام میں

ترجمہ: حبیب

حایہ پھولمتی جنتکی گلزار مدینس"۔ "سینۂ یو دو ے چھوی سپنمت دأ دلد۔ ووتھ سپن اِستادہ شمعکی پأٹھی ود، نبض نابینا حکیمس زانہہ مہ ہاوٗ، شاہِ جیلانس پننی احوال باوٗ"۔ "چھم عشقۂ نارٕ ن کرمتی جگرس کباب اَے نازنین، چھم مے تمنا کیاہ سناوو چھہت بہٕ خواب اے نازنین"۔ وقفہ ختم ہو جاتا تو سازندے پھر شروع کرتے، پہلے آہستہ آہستہ پھر

سینہ تیرا درد سے گر بھر گیا قم باذنی شمع ساں آنسو بہا

حالِ دل کیا جانے نابینا حکیم حال سارا پیرِ پیراں کو سنا

ترجمہ: حبیب

یکا یک تیز تیز پھر نہ پوچھئے کیا ہو جاتا۔ سازندوں اور گویوں کا دائرہ بڑھ جاتا اور ساری کائنات نغمات میں لپٹ جاتی۔ غیبی گلستانوں سے بقول شاہ ہمدان رضی اللہ عنہ بلبلوں کی خوش آئندہ آوازیں سنائی دیتیں، ان آوازوں کی نوعیت نغمات اور تسبیح میں بدل جاتی اور سننے والا بے ہوش وحواس وحدتِ حیات وعرفان و حقیقت سنتے سنتے مدہوش ہو جاتا، جسم وجان، دل ودماغ اور دنیا وآخرت ایک ہی دائرے میں رقص کرتے اور کوئی دیوانہ ہاتفی کی طرح اڑنے لگتا اور صدائے عشق بلند کرتا۔

ہوگیا میرا جگر بھن بھن کے آتش سے کباب

خواب میں آئیں گے مولا عشق کے عالی جناب

ترجمہ: حبیب

بلند اقبال صاحب قاتلانہ

پلانا جام پہ جام عاشقانہ

ملانا دل سے دل یوں مشفقانہ

خریدارِ محبت والہانہ

تبسم پاش بازار محبت

سنانِ کن فکان رازِ حقیقت

حبیب

دائرہ بڑھنے سے دائرے بنتے، گول گول دائرے...... گویوں کے دائرے، موسیقاروں کے دائرے، فن کاروں کے دائرے، رقّاصوں کے دائرے، غیبی مخلوقات کے دائرے، جنوں کے پریوں کے دائرے، شاعروں، مفکروں اور نقاشوں کے دائرے۔ ستارے بھی دائرے بناتے اور سیارے بھی، کھنڈر بھی بناتے اور پھولوں کے تختے بھی۔ پانیوں کا شوق بھی اُچھلتا اور روانیوں کا ذوق بھی پھسلتا۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر پتّھر پہاڑ بنتے اور اونچی اونچی گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتے کہ ساری فضاؤں میں دائرے بنتے ہیں اور بن بن کے مٹتے ہیں پھر بننے کیلیۓ۔ سب دائرے رقاص ہیں اور سب رقاص غنائیت سے بے قرار اور سیمابی۔ یہی سیمابیت زندگانی کی دلیل ہے۔ یہی ہمارے صاحب کا نغمہ ونے!

یہ کائنات کتنی خوش آئندہ، کتنی خوبصورت ہے اور اس کا نظام کتنا دلچسپ اور کتنا حیر[illegible] ہے۔ اس کے اندر کوئی بھی شے دائروں کے بغیر کام نہیں کر سکتی، کم از کم بارآور کام نہیں۔ دائرے اور اشیاء لازم و ملزوم ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور یہ عالم اشیاء کو معانی عطا کرتے ہیں۔ ور[illegible] بے جوڑ ہے، منتشر ہے، بکھرا بکھرا ہے اور الگ تھلگ۔ کون معقول آدمی ہے جس نے ان پر زور نہیں دیا ہے۔ کون عقل مند شخص ہے جسے ان کی افادیت اور موسیقیت کا احساس نہیں۔ یہاں پڑھنے لکھنے کی پابندیاں [illegible] اور نہ تہذیب وتمدن کی، خاص کر اس تہذیب کی جو نقلی ہے اصلی نہیں، جس کے گھاؤ دور سے دکھائی دیتے ہیں، خاص کر مردانِ حُر کو یعنی اعتبار والے آزاد منش مردوں کو، عورتوں کو۔ اس احساس میں دولت وثروت اور دولت کے نشے شامل نہیں اور نہ حائل اور نہ یہ اونچ نیچ کے فرق کے تابع ہے۔ عالم، فاضل، مردانِ درویش، خدا پرست، خود زاہد و عابد بھی اس احساس کا فیضان حاصل کرتے ہیں۔ فلسفوں اور مذہبوں نے بھی حلقوں اور دائروں پر زور دیا ہے اور ان سے پیدا احساسِ وحدت پر۔ انسانیت کو اُن کے اوپر فخر ہے۔ مذہب اسلام کا نہایت فخر اور اعتبار کے ساتھ نام لیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ تو وحدت ہی وحدت کے نغمات سے بھرا ہوا ہے۔ حقیقت دائروں پر زور دے گی ضرور اور اس دائرے پر بھی جو خاص دائرہ ہے اور سارے دائروں کو ملاتا ہے۔ ہندو شاید اس دائرے کو شنیہ کہتے ہیں، شاید شمس صاحب فقیر رحمتہ اللہ جیسے عارف اسے شنیاہ کہتے ہیں۔ شاید زیرو (zero) بھی اسی تصور سے پیدا ہوا تھا اور شاید نہیں یقیناً یہ دل کا ترجمان ہے یا representative۔
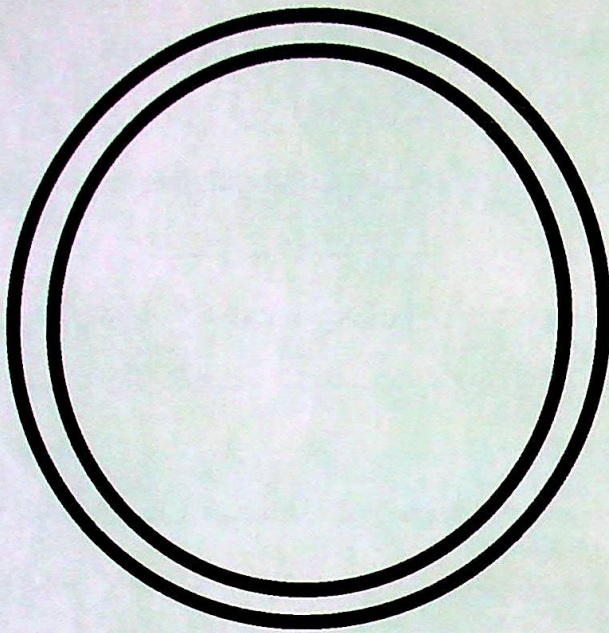
یہ ترجمان دائرہ دوسرے دائروں کو اپنے ساتھ اس طرح نہیں ملاتا کہ ان کی اکائیاں قائم نہ رکھے۔ یہ دائرہ چھوٹے بڑے، ملنے والے دائروں کا تھوڑا ہی کوئی دشمن ہے کہ انہیں مٹادے یا برباد کرے یا اس طرح کھائے جس طرح کوئی بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی ہے۔ یہ تو ان کا دوست دائرہ ہے، ایسا دوست کہ دنیا میں ایسا کوئی دوست نہیں۔ وہ دوسرے دائروں کی اکائیاں قائم رکھتا ہے مگر انہیں اپنے ساتھ اسلئے ملاتا ہے کہ ان کا دائرہ عمل یا ان کی سطح یا ان کے امکانات زیادہ ہو جائیں، بڑھ جائیں، وغیرہ وغیرہ! ہر ایک انفرادی دائرہ بجائے خود ایک کائنات ہے، ایک نغماتی کائنات اور اپنے اندر زبردست طاقت رکھتا ہے۔ ورنہ اس کی اپنی خصوصیات کے مطابق اس کا وجود، اس کا پھلنا پھولنا اور اس کی بقا ممکن نہیں۔ نغمہ ونے کا مطلب ہرگز ٹین بجانا نہیں اور وہ بھی بے مقصد بلکہ موزونیت، اعتدال، وزن، آہنگ، اشاریت، پیکریت، تخیّلات، زبان کی قطعیت و حقیقت، معنویت، ترسیل و تنزیل ہے۔ یہ سب چیزیں اکٹھے اور متوازن طریقے سے کام کریں تو دائرہ بن جاتا ہے اور اس میں حرکت کے علاوہ گھماو پیدا ہوتا ہے۔ آج کل سائنس اور ٹکنالوجی نے بہت ترقی کی ہے۔ چکر (wheel) کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چکر کے بغیر کوئی مشین نہیں۔ اگر انسان کی روح کو انسان کی زندگی سے خارج نہ کیا جائے......اور اسے تو قطعاً خارج نہیں کیا جاسکتا...... تو پھر انسان بھی مشین ہے، سچ تو یہ ہے کہ مشین بھی روح کے بغیر ہو نہیں سکتی کیونکہ کوئی بھی شے حقیقت سے خارج قرار دی نہیں جاسکتی۔ ایسا کرنا روح اسلام کے خلاف ہے، وحدانیت کے خلاف ہے اور روحانیت کی کسی بھی تعریف کے

ساتھ میل نہیں کھا سکتا۔ بس نغمات ساری کائنات میں جاری وساری ہیں اور ترسیل وتنزیل وتفہیم اس کے جزو ہیں۔ کائنات کا نظام کسی انسان یا فرشتہ یا جن یا کسی اور مخلوق کے ہاتھ کی پیداوار نہیں۔ اسے تو creative intelligence یا creativity imaginative نے بنایا ہے اور ان دونوں انگریزی اصطلاحات سے بہتر یا آسان نام خالق یا مالک دو جہاں ہے جسے آپ خدا کہئے، اللہ کہے، آپ کی مرضی! کوئی بھی منطقی خشک مغز، یا فلسفی یا سائنس دان یا اور کوئی نام نہاد مفکر کائنات پر اپنے ذہن یا اپنی آوارہ ذہنیت کی کمند پھینک نہیں سکتا۔ یہ کہتے ہوئے یا سمجھتے ہوئے کہ اس میں نقص ہے۔ ''اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔۔۔'' (3-191)

سوچ کا ایک اور قدم آگے بڑھایئے۔ دائرے یا نغماتی چکر صرف مادی چیزوں کے ساتھ منسلک نہیں، صرف ان کے ہی لئے ضروری نہیں۔ غیر مادی چیزوں کیلئے بھی حلقے یا دائرے یا چکّر ضروری ہیں۔ پس مرئی اور غیر مرئی، مقروں اور مجرد چیزیں یا صفات الٰہی چکروں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پتھر بھی ہیں اور مٹی کے ذرّے بھی، کھلے میدان بھی اور تنگ وتاریک جگہیں بھی، شجر بھی، ثمر بھی، پھول بھی، پھل بھی، اناج اور سبزیاں بھی، بیج اور ان کے اشکال بھی، حیوان، جن اور انسان بھی۔ اسی طرح خواب بھی، خیال بھی، صبر و شکر بھی، صفائی بھی، نزاکت، نفاست، لیاقت، اطاعت اور عبادت بھی۔ مسکانیں اور انگڑائیاں بھی۔ حرکت بھی نغمہ ہے اور حرکتوں کے ساتھ وابستہ چیزیں بھی نغمے۔ نشوں میں بھی سرود ہے اور سرود وسرور میں بھی نشور ہے یعنی قیامت برپا کرنے کی طاقت، کھڑا ہونے کی استعداد اور کھڑا ہو کر چلنے پھرنے اور کام کرنے کی وسعت وطاقت۔

ایک اور قیامت! دائرے کبھی ساکن نہیں ہوتے کیونکہ ٹھہراؤ موت کا دوسرا نام ہے۔ ان میں غضب کی حرکت ہوتی ہے۔ دائروں کے محیط پھیلتے بھی ہیں اور سکڑتے بھی۔ پھیلاؤ اور سکڑاؤ کا دارومدار دائروں پر بھی اور دائروں سے باہر دنیا پر بھی۔ سب سے بڑی بات کہ دائرے کا مرکز ہی دراصل سب کچھ ہے۔ سمجھ لیجئے کہ حرکتِ قلب! دائرہ جب دوسرے دائروں کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو wheels within wheels بن جاتے ہیں۔ یہ دائرے یا دائرے کے اندر ہوتے ہیں یا دائرے سے باہر دائرے کے ساتھ جڑے ہوئے یا دائروں کے ساتھ جڑے ہوئے یا اسی طرح اور کسی طریقے سے۔ یہ باتیں اس لحاظ سے قطعی نہیں کہ ہم انہیں ریاضی داں کی حیثیت سے اور نہ طبیعیات کے ماہروں کی حیثیت سے لکھ رہے ہیں۔ تاہم ریاضیات یا طبیعیات سے دائروں کے بارے میں یا ان سے متعلق حقائق کے بارے میں کافی اطلاعات فراہم ہو سکتی ہیں جن سے عقل و
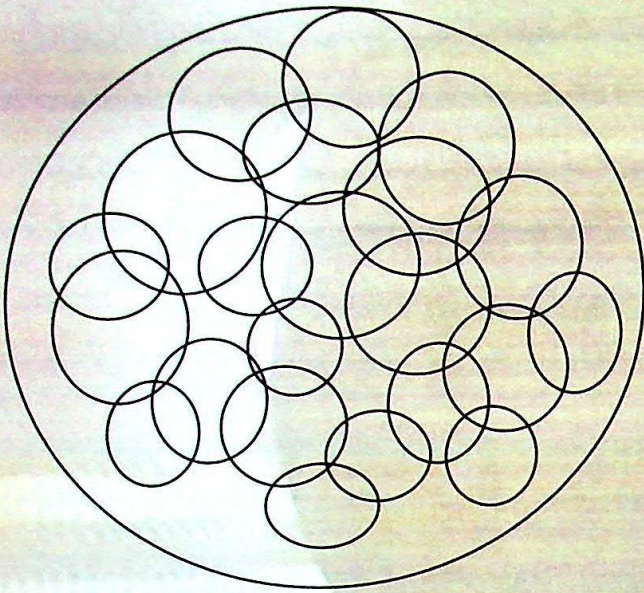
کو بھی مدد مل سکتی ہے اور عرفانِ الٰہی بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر جو صاحب کے ساتھ جڑ گیا، اسے ان چیزوں کے ساتھ کیا کام۔ صاحبانِ عرفان حق کے پاس کیا کچھ نہیں ہوتا۔

رومیؒ نے کہا تھا:

صد کتاب و صد ورق در نار کن روئے خود را جانبِ دلدار کن

آگ میں ڈالو کتابیں ان کے ورق بھی جلاؤ دیکھ دیکھ مالک کو اس کے ساتھ ہی دل کو ملاؤ

ترجمہ: حبیب

جدید طبیعیات تو لہروں (waves) پر بہت زور دیتا ہے اور لہروں نے تو ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کی حیرت انگیز دنیا پیدا کی ہے مگر ہمارے صاحب کی لہروں کا اندازہ کس کو ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ! چائے، کافی، رس، روغن، ذائقے بخش سکتے ہیں، ذائقے بڑھا سکتے ہیں، کوئی حیرت انگیز کام نہیں کر سکتے۔ اسی طرح علوم وفنون سے نشے پیدا ہو سکتے ہیں، شوق سامانیاں بڑھ سکتی ہیں مگر: وِنہ یے سرگژھ برہم چانہ سیرُک چھم قسم!

اب کچھ مثالوں سے کام لیں گے اور حتی الامکان اور حتی الوسع یہ جاننے کی کوشش کرینگے کہ حلقے یا دائرے کس طرح کا کام کرتے ہیں اور قیامت برپا کرتے ہیں، زندگی میں سوز وساز بھرتے ہیں اور اسے محض کھانے پینے سے، اٹھنے بیٹھنے سے، سونے جاگنے سے، جینے مرنے سے، فتنہ فساد پیدا کرنے سے اور فتنہ وفساد سے عیش وعشرت کا بازار گرم کرنے سے، عیش وعشرت سے جسمانی ونفسیاتی آسودگی تلاش کرنے سے آزاد

کرتے ہیں۔ یہ بھی ہماری کوشش ہے کہ ہم دیکھیں کہ صاحب کا تعلق نغمات کے ساتھ اسلئے بھی تھا کہ وہ روحانی لطافتوں کیلئے اوران کی گہرائیوں میں سائلوں اور جانثاروں کو بقدر جُسّہ بھیجنے کیلئے ان (نغمات) سے کام لیتے تھے۔ خود مجھے ابتدائی ایام میں کہلوایا کہ سازندوں اور گویوں کا انتظام کرو، محفل کریں گے، میں محتسبوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، خودتو سازوں اور آوازوں کے ساتھ بچپن کے ایام سے ہی دلچسپی رکھتا تھا اور سعدیؔ وعطارؔ و رومیؔ واقبالؔ وغالبؔ کے ہاتھوں چائے روٹی کھاتا تھا مگر یہ نہ سمجھتا تھا کہ صاحب کی مجلس میں چھم چھم اور جھنن جھنن کا انتظام کرنا یا کرانا ضروری ہے۔ ہاں میں نے عمہ صوفی مرحوم کی زبانی احمد صاحب کا نہامی کی درگاہ پر شش رنگ سنا تھا

تارکن ژھانجوم منز مارکن تے
سونۂ آسم شانکن
شامن تۂ صبجن مہ چھِ دُشمن تے
کتھۂ کرہ ہم کامن
پامن لاجنس رَٹس دامن تے
گیولنم کلِ عالمن

رحمان ڈار

ڈھونڈتا تھا مجلس انجم میں [illegible] بار
کتنے رقیبوں کی آنکھوں میں [illegible] خار
پہرہ داروں دشمنوں سے چھپ [illegible] سکتا اگر
بات نا کرنے سے کٹتا ہار [illegible]
طعنے کھا کر بھی پکڑنے جاؤں [illegible] یار
بدکلام بدنامیوں کے گھاؤ کھاؤں گا ہزار

ترجمہ: حبیب

مگر صاحب کا جلال دیکھ کر میں ذرا پاؤں پیچھے ہی رکھتا تھا۔ حکم ملا تو اسی صوفی کو پھٹا پھٹ ٹک کیا حالانکہ میری زندگی میں اور بھی بہت سے دکھ تھے محبت کے سوا خاص کر جب کہ میں اوپری آمدنی سے بہت نفرت کرتا تھا۔ اسلئے بھی شاید میرے دکھ بڑھ گئے تھے۔ صوفی آتو گیا، مگر اسی دن میرا رسم بسمل بھی ہوا اور میری شادی بھی روح کے ساتھ کہیئے، ارواح کے ساتھ کہیے یا کائنات کے ساتھ!

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم
پری پیکر نگارے سر و قدے لالہ رخسارے
سراسر آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

رقیباں گوش بر آواز او در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

امیر خسروؒ

کہاں میں تھا کہاں منزل وہ کیسی رات تھی یارب
بہر سو رقصِ بسمل تھا وہ کیسی رات تھی یارب
پری تھی خوبصورت سروسی مجبوبہ لالہ رُخ
میرے دل کیلئے آفت وہ کیسی رات تھی یارب
وہ مستِ ناز بیٹھی تھی رقیب میرے غِنا سنتے
میں سہما بے زباں بالکل وہ کیسی رات تھی یارب
خدا تھا میرِ محفل لامکاں میں تھا مگر خسرو
محمدؐ تھا خود ہی روشن وہ کیسی رات تھی یارب

ترجمہ: حبیبؔ

میں اس رات اتنا رویا اتنا رویا کہ صاحب نے بھی مجلس سماع کے بعد سب کھڑکیاں خود ہی کھٹا کھٹ کھول دیں الف سے ے تک سب چیزیں اٹھا اٹھا کر سارے کمرے کی صفائی بھی کرائی گئی۔ محفل جمنے سے پہلے صاحب نے شام ہوتے ہوئے فرمایا تھا ''سینما''۔ میں گھبرایا تھا، سمجھا تھا کہ شاید میری سینما بینی پر ناراض ہیں مگر معلوم نہیں تھا کہ اب فلمیں خوب دیکھنی ہیں اور وہ بھی پُر اسرار۔ اس کے کچھ دیر بعد جب لیٹے ہوئے تھے،

بیٹھ گئے تھے اور فرمایا تھا ''مہرینی چھا'' (دلہن ہے؟) صوفی نے شروع کیا تھا سعدیؔ اور شمس فقیرؔ کے کلام سے:

گلے خوشبوی درحمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بگفتم من کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویزِ تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے باگُل نشستم
جمالِ ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم
سعدیؔ

گیلی مٹی میرے ایک محبوب نے دیدی مجھے
بیٹھا تھا حمام میں خوشبو بہت آئی مجھے
میں نے کہا دل لبھاتی ہو مشک ہو یا عبیر
ایسی خوشبو سے ہوا کیوں دل میرا اتنا اسیر
اس نے کہا گیلی مٹی تھی بہت [illegible]
قسمت اچھی تھی رفاقت مل گی [illegible]
بوئے خوش سارا کرشمہ ہم نشیں کے [illegible] کا
ورنہ میں مٹی وہی ہوں ہر [illegible] ہے جانتا
ترجمہ: حبیبؔ

شمس صاحب کا جو گانا اس کے بعد گایا گیا تھا، اس کا پہلا ٹکڑا مع ترجمے کے:

ینہ لوگتھس عشقنہِ زالو
تنہٕ چھس یو دِوان نالو
وُنیوم پانس سینوم ہنہٕ ہنہٕ
تنہٕ چھس یو دِوان نالو
دٕژم دوستی پننٕ دوستن
چھے دوستی دوستہٕ حوالو
یہ دوستی دوستہٕ کرزنہ ژھنہ
تنہ چھس یو دِوان نالو

دامِ الفت میں پھنسا ہوں ہائے ہائے
بہہ رہے ہیں تب سے آنسوں ہائے ہائے
آ بنی ہے جان پر اب کیا کروں
درد گہرا کیسے سہوں ہائے ہائے
حمد بے حد یار کی یاری ملی
جان سے پیاری ہے ایسی دوستی
ہو نہیں سکتا کہ چھوڑوں دستِ یار
بے وفائی؟ زہر کھاؤں؟ ہائے ہائے
ترجمہ: حبیبؔ

مطرب رباب پر زخمہ مار رہا تھا، سارنگی سارنگوں پر کش مار رہے تھے، ڈم ڈم ڈم گھڑے بج رہے تھے، ہارمونیم سارے ساز، سارے سُر ہم آہنگ کر رہا تھا اور صاحب اپنے نشتروں، غمزوں اور دشنہ وناز سے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ میں زار زار رو رہا تھا، سچ مانو سسکیاں لے رہا تھا اور ہچکیاں۔ ایسے حال مجھ پر چھا جاتے تھے کہ میں بے حال ہو جاتا تھا اور ضبطِ فغان نہ کر سکتا تھا۔ دس بجے صبح تک محفل ہوتی رہی مگر اس کے باوجود کہ محفل ختم ہوئی، ہچکیاں بندھی رہیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اٹھوں کیسے اور گھر کیسے چلا جاؤں۔ نہ گھر کی فکر تھی، نہ جان کی فکر، نہ عاقبت کا خیال اور نہ دنیا کا احساس۔ نظروں کو بچاتا تھا مگر دل مانتا نہ تھا۔ جونہی صاحب کی طرف دیکھتا، گولی کی طرح فغانِ بُکا سینے سے نکل جاتی اور پھر زار زار روتا۔ خدا خدا کر کے ایک بجے کے قریب طوفان تھمنے لگا۔ میں نے کھانا کھایا صاحب کے کمرے میں ہی اور دھیرے دھیرے اٹھ کر، اجازت دل ہی دل میں مانگ کر گھر لوٹا۔ لوٹا کیا کہ سب کچھ لُٹا کر واپس آیا۔ گھر پہنچا مگر سارنگی اور رباب پیچھا کر رہے تھے۔ نغمہ ونے کا جہانِ اضطراب بدستور دل و دماغ پر چھایا ہوا!

جھَن جھَنن جھَن آج بھی جھنکاریاں
چھم چھما چھم کیسی طرح داریاں
دشتِ جنوں روک لو گر ہو سکے
دم دما دم واہ واہ گل باریاں
یار چھک یارانہ چھک دلدار چھک
چھوکھ لگیم بلہ نم نہ زانہہ یم کاریاں

حبیبؔ

ہم تو مثالوں کی بات کر رہے تھے! ایک مثال بارش کی لے لیں، جب بارشیں برستی ہیں تو گاتی ہیں، ملہار ہی نہیں، برساتی نغمے بھی، برساتوں میں ہی نہیں، خزانوں میں بھی، چنار کی آگوں کے بیچوں بیچ یہاں کاشمیر میں ہی نہیں، درختوں کے پتوں کی مختلف ساختوں کے بیچوں بیچ ہر جگہ، انگلستان میں بھی جہاں شیلےؔ نے قصیدہ بادِ غرب لکھا تھا، اس کے کچھ شعر:

یا بنا بادل کا ٹکڑا برگِ خستہ یا لہر
بادِ خزاں مجھ کو اپنے ساتھ لے چل چارہ گر

زندگی کے خوار زاروں پر گرا خونِ جگر
تیز رَو، خود دار، خود سر، تری طرح جی رہا
سختیٔ ایّام نے باندھا کچھ ایسا جھک گیا
جنگلوں کی طرح مجھ کو اپنا سارنگا بنا
گو مسلسل جھڑتے ہیں پتّے میرے تو کیا ہوا
ترے شیرین نغموں کا ہنگامہ کھُل کے آئیگا
بن سے مجھ سے چھینے گا سوزِ خزاں کا دادرا
وحشت انگیز روح! تیرا درد لذّت سے بھرا
تند رُو جوشیلے جانم میری روح میں اُتر آ
کون و مکاں میں خشک پتّوں کی طرح جابجا
جلد جلد کردیں حیاتِ نو کا بندوبست کھڑا
گرم شرر بار جادو پھونک دے نغمہ نیا
اے ہوا اُٹھ پھونک دے خود صورِ پیغامِ اُمید
شدّتِ سرما مسلّم موسم گُل کی نوید

جب بارشیں بہت ٹھٹھر جاتی ہیں تو نغمہ ہائے برف گاتی ہیں، پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر بھی واہ واہ، ہمالیہ کے طول وعرض میں بھی، جس طرح کشمیر میں اسی طرح ہماچل پردیش میں بھی، جس طرح جرمنی میں اسی طرح سوئزرلینڈ میں بھی جہاں کے لوگ سنا ہے کہ نرم دل ہوتے ہیں مگر گرم گرم کمروں میں اسے گرم رکھنا بھی جانتے ہیں۔ بارشوں کے ٹھٹھرے ہوئے گیت چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے آرکسٹرا کا بھی انتظام کرتے ہیں تا کہ فطرت یا قدرت کا ماحول رحمان کے ہاتھوں سے موزون بھی رہے اور مسنون بھی، میزان بھی نہ کھوئے اور نہ ایمان۔ ان طرب ناک چڑیوں کا نام کشمیریوں نے اپنی موزون فکر اور فی البدیہہ شاعرانہ مزاج سے قطعیت سے رکھا ''شنہ پپنی'' (shenh pipin) یا (whistling wintry sparrow)۔ یہ اس لئے کہ کشمیری صفیری نزاکت (whistling delicacy) کے مشتاق ہیں اور سیٹیوں کے تیروں کو بہت پسند کرتے ہیں اسلئے پریاں بھی انہیں پسند ہیں کیونکہ پریوں کی صفیری چبھن انسان کی جان لیتی ہے بشرطیکہ وہ آزمودہ کار انسان ہو۔ بارش، برف چڑیوں کے غنایئے، صفیری، نزاکتیں، نزاکتوں کی شدتیں، سیٹیوں کی کسک۔۔۔ یہ سب گیت گاتی ہیں اور

ان کے ساتھ اور بھی بہت سے کارکنان فطرت غنا۔۔۔ برف کے گالے، سفید سفید، اجلے اجلے، درختوں کے بھوت جو سرمائی دھندلکوں میں ٹھیک سے نظر نہیں آتے اسلیئے بھوت ٹھہرے ورنہ وہ تو ہیں کارپردازانِ نو بہار جو نو بہاروں کے اہتمام میں مصروف ہیں اور چوری چوری لوگوں سے دور، نظروں سے اوجھل، کام میں محو، کام جو صبح وشام گا تا رہتا ہے خدایا تیرا حمد وثنا، کیسا جہانِ کیف وسرور بنایا ہے آپ نے، ایک ایک چیز جڑی ہوئی ہے نغمہ و نے کے ساتھ زندگی کی غنائیت میں رنگ ونور بھرنے کیلیئے! بارش کے ساتھ زمین بھی گیت گاتی ہے اور سبزۂ نورستہ بھی جو جگہ جگہ سر اٹھا اٹھا کے اچھے سروں میں اچھے گیت گا تا ہے۔" دل تنبہِ لاوان جلوہِ ہاوان آکھ بہارو، مشراوہِ مژہ کتھ یاد پاوان آکھ بہارو"۔ پانیوں کے ساز بھی اپنے تار کھینچتے ہیں اور جھرنوں ندیوں کا سرود بھی ستاروں کے ٹم ٹم کی طرح اِدھر اُدھر اُدھر اِدھر چھم چھم اچھلنے لگتا ہے۔ دھوپ، سہاونی دھوپ، چھپی کیوں

> دل بھی اُچھلا بار بار آگئی ہے نو بہار
> بھولی یادوں پر سوار آئی بہار رنگ بار
>
> ترجمہ: حبیب

ہے۔ وہ بھی علی الصباح پہلے طباشیری مُسکان پھینکتی ہے۔ پھر ہنسنے لگتی ہے خوب خوب کہ کلیاں بھی چٹک چٹک ساز بجانے لگتی ہیں اور تتلیوں کے ناچ ان کی چٹک چٹک پر اپنے گلوکار کرتب دکھاتے ہیں۔ ہر طرف نغمے، ہر طرف سرود، ہر طرف غنا، ہر طرف نشہ ہی نشہ مگر

چوں بر تو خدائے آفریں گفت
جامی چہ سزائے آفرینت

> آفریں کہہ دے خدا خود آفریں کھول دوں منہ مجھ کو ٹوکیں نازنین!
>
> ترجمہ: حبیب

عارفاں سرّ خطاب از کہ و صحرا شنوند
رمزِ پُر شور و شتاب از کفِ دریا شنوند
میر سید علی ہمدانیؒ

تری آواز کا سحری ترنم
کلام اللہ اولی الامر منکم
فواروں آبشاروں کا تبسم
دھڑکتے دل کا بھولا بھالا ڈُم ڈُم

تکلّم کی بہاریں رنگ سامان
حقیقت کی اذانیں پیچ پیچان

زبان پھلواریوں کی گل فشانی
ورق گرداں گلابوں کی کہانی
شگفتہ تیس پاروں کی زبانی
جلالِ یار کی آتش بیانی

غنائی نو بہاروں کی وضاحت
شہد سامان ولایت جشنِ راحت

روانی پانیوں کی جستہ جستہ
چٹک ناسفتہ غنچوں کی نہفتہ
مہکتے پھول رنگ رنگ تختہ تختہ
پتنگوں کی نزاکت دست بستہ

سرورِ معرفت آرام آرام
شفا نغمات کا گلفام انعام

حبیبؔ

کوہ و صحرا ہوں کہ دریا کرتے ہیں اُن سے کلام
[illegible] حق اشاروں میں مدام
حبیبؔ

صاحب بیٹھے ہیں کمرے میں سائلوں، مریدوں اور جانثاروں کے ساتھ، گلوکار گل، رحیم وسلطان ساز بجاتے ہیں اور نغموں پہ نغمے گاتے ہیں، صاحب کا سمعی احساس اتنا تیز کہ کوئی سُر، کوئی تال، کوئی سرگم، کوئی نغمہ اس احساس کو چھوئے بنا فضا میں خوشبوؤں کی طرح کافور نہیں ہوتا۔ ہو بھی کیسے؟ ساری کائنات نغمات سے بھری ہے، نغمات بھی کیا کہ سب ان ہی کی کارفرمائیاں ہیں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کو بھی یہ نغمات چھیڑتے

تھے اور وہ نغمہ زن ہو جاتے ہیں۔

دیدم نگارِ خود را مے گشت گرد خانہ
برداشتہ ربابے می زد یکی ترانہ
باز خمہٗ چو آتش می زد ترانۂ خوش
مست و خراب و دلکش از بادۂ مغانہ
در پردۂ عراقی می زد بنامِ ساقی
مقصود بادہ بودش ساقی بُدش بہانہ
ساقی ماہ رویی در دست او سبویی
از گوشۂ در آمد بنہاد درمیانہ
پر کردہ جامِ اول زاں بادۂ مشعّل
در آب ہیچ دیدی کہ آتش زند زنانہ
بر کف نہادہ آں را از بہر دلستان را
آنگہ بکرد سجدہ بوسید آستانہ
بستد نگار از وے اندر کشید آں مے
شد شعلۂ ز آں مے بر روئ او دوانہ
می دید حُسن خود را می گفت چشم بدرا
نی بود و نی بیاید چوں من دریں زمانہ
رومی

گھوم گھوم گاتا تھا گھر کے گرد گرد میرا نگار
بجتا تھا رباب ہاتھوں سے اچھلتا تار تار
پیتے پیتے حلق سے سرگم صداؤں کا خروج
زخمہ ور کی آتشیں کرتب مدھرتا کا عروج
نام ساقی کا لبوں پر بجتا تھا لیکن عراق
چاہ شرابوں کی لیکن نغمہ مگر چاق چاق
ماہ رو ساقی صراحی میں بھرے خاصی شراب
بیچ میں رکھی صراحی نکلا خلوت سے جناب
جام پہلا بھردیا اُچھلا مگر پانی سے نار
آگ کچھ ایسی لگادی رہ گیا تنہا نگار
جام ہتھیلی پر دلبر کیلئے یوں چل دیا
سجدہ کیا آستانہ بوسہ گاہ بھی بن گیا
جام اس سے لے لیا بادہ پیاسب یار نے
سارا چہرہ بھردیا شعلوں سے ایسے نار نے
نظرِ بد دور حسن اپنا دیکھتا تھا بار بار
کس نے دیکھا کون دیکھے ایسا جمالی نکھار
ترجمہ: حبیب

صاحب خود نگار، خوب رو کہیئے، لالہ رُخ کہیئے، زیبا نگار کہیئے یا ”ہر موکھ دیدار“۔ جہاں جاتے ہیں انہیں ہر طرف نغمے ہی نغمے گھیرتے ہیں، لولاب میں زینہ گیر میں، پانیوں میں بیٹھ کر، کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر

چلتے چلتے، کانس پور بار ہمولہ کی پہاڑی کے اوپر چودھویں کے چاند میں، سیاروں اور ستاروں کے جشن میں، اہرہ بل کے آبشاروں کے اوپر نیچے اور درمیاں۔ ککرناگ اور ویری ناگ کے رواں آبوں میں اور ان کی کارپردازی میں، چشمہ شاہی کے زمزموں میں، زبرون پہاڑوں کی خاموشیوں کے بیچوں بیچ؛ جھیل ڈل گنگہ بل، تارسر، مارسر کی جھیلوں کی گہری گہری خموشیوں میں۔ ہمالیہ کی گودیاں بھی ان کے گرد گرد گاتی ہیں ایک رباب ایک سارنگ لئے نہیں، ہزاروں ستار، ہزاروں گیٹار، ہزاروں بین باجے لئے ہوئے۔ پربتوں کے شاموں کے بسیرے بھی ساز بجاتے ہیں ان کیلئے اور سربلند دیودار کے سرسبز خوبصورت پتے بھی سرسراتے [illegible] گاتے ہیں ان کی خاطر۔ دریاؤں اور ندیوں کی بل کھاتی ہوئی، ساز بجاتی ہوئی جوانیاں بھی انہیں [illegible] میں پیغام حق سناتی ہیں اور ان کے ساحلوں پر لاکھوں قسم کے پیڑ پودے بھی کہ جن پر رنگارنگ [illegible] ہیں طاہرانِ خوش لحن کے۔ محنت کش کھیت بھی لہلہاتے ہوئے گرم گرم ہواؤں کے جھونکوں [illegible] غنا میں حصہ لیتے ہیں اور سرگرم دنیائے رزق کے بہار و خزاں بھی غنائی حمد و ثنا کا شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ معصوم شیر خوار بچوں کا ماؤں کی گودیوں میں بیٹھ کر غوں غاں بھی ان کے حضور میں ثنائے ذاتِ حق کرتا رہتا ہے اور [illegible] بھی بچوں کو پال پال کر بوس و کنار سے گذرتی ہوئی گنگناتی رہتی ہیں مگر ان کی غنا میں دیا [illegible] ہے دل سوختہ تمناؤں کو لئے اور اجڑی بہاروں کا ماتم کئے۔ ان کے نغموں کی پیکری نزاکت بھی ثنائے حق اور ان کے تصورات میں بھی جلوۂ الٰہی کے پرتو۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہو تو زمین سوئے۔ چھوٹے چھوٹے رینگنے والے جھینگر بھی اپنے صاحب کو اپنے مست کر دینے والے غنایئے سناتے رہتے ہیں اور شاموں کو ساتھ لئے ہوئے راتوں کی عشرت کا سامانِ نغمہ فراہم کرتے ہیں۔ دوسری طرف جگنوؤں کے انبوہ اپنی چھوٹی چھوٹی بتیاں روشن کرتے ہیں اور ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے انہیں دعوت دیتے ہیں کہ آؤ زمین پر اترو، ہم تم مل جل کے گائیں اور کائنات کو اپنے اپنے نغموں سے بھر دیں کہ صاحب دیکھ رہے ہیں اور خدائی بارگاہوں کا تماشہ کر رہے ہیں۔ صاحب بھی کیا کہ طور پر جاتے ہیں کلام خدا سننے کیلئے اور نور دیکھنے کیلئے کہ دلوں کو پیغام الٰہی سے منور کریں اور روشنیوں کی مدد سے تاریکیوں کا خاتمہ کر دیں۔ اس دوران وہ کبھی کٹتے جگر کی آواز سنتے ہیں اس پر مرہم لگانے کیلئے، کبھی خود جگر کاٹتے ہیں خون کے پھواروں سے گلستانِ دل آباد کرنے کیلئے۔ یہ باتیں معمولی باتیں نہیں، انہیں سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جو لوگ یہ باتیں سنتے ہیں اس قسم کی باتیں سن سن کر معانی سمجھتے ہیں، وہی عارف کہلاتے ہیں، وہی اُس دنیا سے، اس دنیا کی زندگی سے صحیح صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے آخرت کی کھیتی سمجھ کر خوب محنت کر کے اپنا رزق پیدا کرتے ہیں۔ آخرت کا رزق! مگر گیت صرف جگر ہی نہیں کاٹتے اور

بھی بہت اچھے کام، عجیب وغریب کام کرتے ہیں۔ سمندروں کے گیت ملاحوں کا کام آسان بناتے ہیں، انسانوں اور انسانوں کو ملاتے ہیں، سمندروں کی گہرائیوں سے ملاتے ہیں، سمندروں کی کائنات اپنی رونق سے بھر دیتے ہیں، ہواؤں میں رنگ بھرتے ہیں اور جہانِ معرفت کے دل داروں کی دُنیا آباد کرتے ہیں۔ اسی طرح سلطنتوں کے گیت وضاحت کرتے ہیں کہ خالق دو جہاں تاریخ میں گھس کر انسانی زندگی کو اپنی رحمتوں سے کس طرح بھر دیتا ہے۔ تاج محل کیسے بنتے ہیں اور کیوں، ارم کے باغ کیسے کھڑے ہوتے ہیں اور کس کی صناعی کی ثنا میں۔ رومی سلطنت آسماں پر کیسے چڑھتی ہے اور قرطبہ کی مسجد آیات الٰہی کی کیسے ترجمانی کرتی ہے۔ مگر سلطنتوں کے گیت یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ قوموں کا زوال کیسے آتا ہے اور وہ زمین کے اندر کیسے دب جاتی ہیں۔ سلطنتوں کے گیت علم وادب کے بھی گیت ہیں اور تہذیب وتمدن کے بھی، بلندیوں پر بھی لے جاتے ہیں اور پستیوں کے راز بھی کھولتے ہیں، تعمیر وترقی کے جھروکے بھی کھولتے ہیں اور فن اور فنِ لطیفہ کے حسن و جمال کا بھی مشاہدہ کراتے ہیں۔ ان گیتوں کو سننے کیلئے، بلکہ سارے گیتوں کی تفہیم وتحسین کیلئے، کانوں کی ضرورت ہے۔ جس کے کان بند ہوئے قہر الٰہی سے وہ اندھا بسنت بہار کیا جانے۔ ہمارے صاحب یہ گیت سنتے بھی ہیں اور سناتے بھی ہیں تاکہ ایمان والے جلالی وجمالی دربار الٰہی کا مشاہدہ کریں، روح کو آسائش جمال سے گرم اور روشن رکھیں مگر وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ جو لوگ نغمات کی برکات سے محروم ہوں، ان کے کان کھولیں اور ان میں ذوق سماع پیدا کریں کلام الٰہی سننے کیلئے۔ قرآن پاک میں ذکر ہے اور جگہ جگہ پر کہ الٰہی آیات زمین وآسمان میں بھری پڑی ہیں۔ ایمان والوں پر لازمی ہے کہ وہ ان کا مشاہدہ کریں اور ان سے معرفت الٰہی حاصل کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کر پائیں وہی حیوان کی زندگی گذاریں بلکہ ان سے بھی بدتر زندگی! خدا رحم کرے! کائنات میں بھرے نغمات بھی آیات الٰہی ہیں! انہیں سن کر، ان کے مطالب سمجھ کر ہی آسمانوں کی بلندیاں سر کی جاسکتی ہیں، زینہ زینہ ہی سہی!

صاحب کی زبان یا ان کی نغماتی زبان کیا تھی؟ ایسے سوال سادہ لوح لوگ ہی پوچھتے ہیں۔ دنیا کی کون سی شے ہے جس کی زبان نہیں۔ صبح وشام کی زبان ہے، رات دن کی زبان ہے، بہار، خزاں، گرمیاں، سردیاں بولتی ہیں اور باغ، باغیچے، کلیاں، شبنم بھنورے، پتنگے، پھول، پتے، کیاریاں، چمن، گل گلستان سب باتیں کرتے ہیں، بولتے ہیں، اپنی اپنی زبان۔ اگر یہ سچ ہے تو صاحب کیوں نہ بولتے ہیں ان کے اشارے بولتے، ان کے کنایے بولتے اور ان کے دشنہ، غمزہ، حرکات، سکنات، قہقہے، غصّے، تیور اور اطوار بولتے۔ ان کی مسکراہٹیں، ان کی شکنیں، ان کی رفتار اور ان کے انداز اس طرح بولتے کہ سمجھنے والوں کے دل میں شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی۔ جب غذا کھاتے تب بولتے، جب چائے پیتے، حلوہ کھاتے، پکوڑے کھاتے تب بھی۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا،

جا گنا گفتار اور ان کا ہنسانا اور رُلانا بھی گفتار۔ مگر وہ لفظوں اور فقروں سے بھی خوب خوب کام لیتے تھے۔ بقول ان کے فرزندان کے بول کبھی ہنساتے، کبھی رلاتے مگر جب ان کے منہ سے نکلتے تو پھول کھلاتے بے شک۔ کچھ مثالیں ان لفظوں، ناموں یا فقروں کی جوان کی زبان پر چڑھتے۔ جبّار۔ حنیف، احسن صاب (صاحب)، آسہ پیر (احسن پیر)، خالہ صاب (خالق صاحب)، لسہ آرم (رسول سبزی اُگانے والا)، عزیز ڈوم (گنائی)، ہدہ پیر، (ہدایت اللہ پیر)، علی پیر، محی دین (محی الدین)، غیاث دین، دستگیر، پرتھوی ناتھ، گوپی ناتھ، پریم ناتھ، حاجہ آپہ (حاجرہ آپا)، ساجہ آپہ (ساجدہ)، سارآپہ، سیدہ آپہ۔ خدجہ آپہ (خدیجہ)، عاشہ آپہ (عائشہ)، خورشہ (خورشیدہ)، جانہ، زینہ (زینب)، فاطہ (فاطمہ)، زیبہ (زیبا)، سوندر (سندری)، موختہ (موتی)، زردہ امہ (احمد)، موبہ محبوبہ، (محبوب)، مہدہ (محی الدین)، رحمانہ، سلطانہ، ممہ (محمد)، خالہ (خالق، خالد)، اوحد (احد)، یا حی، یا قیوم لا الہ الا اللہ یا صرف الا اللہ، وارہ وارہ (آہستہ آہستہ)، ووتھ تھود (کھڑے ہو جاؤ)، نیر نبر (باہر نکلو)، بہہ پتھر (نیچے بیٹھ جاؤ)، کڈیونو یہ (اس کونکال دو)، یہ چھوشونگتھ (یہ سویا ہوا ہے)، امس چھ نیندر پیمژ (یہ سو گیا ہے)، یہ چھوسبحان صاب (یہ سبحان صاحب ہے)، امس بنہ نہ قرآن نیون (اس سے قرآن چھین نہیں لیا جاسکتا)۔ امس چھ یمس ساتی دل لگی (اسے اس کے ساتھ محبت ہے)، یمن چھ پانہ وانی کتھ (انہیں آپس میں راز بانٹنے کے تعلقات ہیں)، یہا چھوی قرآن شریف (یہ قرآن شریف ہے)، یہ چھواسان (یہ ہنستا ہے)، امس دیومہ گول (اسے دودھ پلاؤ)، امس چھو یہ مول (یہ اس کا باپ ہے)، یہ منگان تریش (یہ پانی مانگتا ہے)، یہ ونان باتھ (یہ گانا گاتا ہے)۔ یہ ونان آزاد کشمیر (یہ آزاد کشمیر کہتا ہے)، یمس کرہ بوگنہ (اس کے میں ٹکڑے ٹکڑے کروں گا)، یمس کمیو لوی (اس کو کس نے مارا)، بوچھسن یہ ماران پتہ چھسن زندہ کران میں پہلے اس کو مارتا ہوں پھر زندہ کرتا ہوں)، یہ چھو میہ نیچو (یہ میرا بیٹا ہے)، یہ اژہ اندر (یہ اندر جائیگا)، نیر میانہ وارہ منز (چل میرے سبزیوں کے باغ میں)، یہ چھوامہ صوفی (یہ احمد صوفی ہے)، یہ چھو درویش (یہ درویش ہے)، گوڈہ گو میرن نشہ پتہ گوموگرین ہوند (پہلے میروں کے گھر گیا پھر ماگریوں کے گھر)، یہا گومت بوڈ (یہ بڑا ہو گیا ہے)، ژہ کیاہ لوکٹ چھو کھہ (تم کیا چھوٹے ہو)۔ یہ وہ الفاظ، وہ فقرے ہیں جو میں نے ان سے خود سنے ہیں اور ابھی یاد ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسے ہی لفظ بھول گیا ہوں گا۔ ان الفاظ کے مطالب سمجھنے مشکل نہیں مگر اصلی معانی ان لوگوں کی سمجھ میں آتے تھے جن کے بارے میں یا جنہیں مخاطب کر کے بولے جاتے تھے۔ ان الفاظ یا فقروں سے صاحب بڑے بڑے کام لیتے تھے۔ سائلوں اور مریدوں کے دلوں میں یقین پیدا کیا جاتا کہ وہ ان کے دل کی زبان سنتے ہیں یا ان کے خیالوں کی دنیا سے گذر رہے ہیں۔ ان کے دل میں اطمینان پیدا کیا جاتا کہ وہ ان

کے ساتھ مربوط ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ان سے اشاروں کا کام لیا جاتا تاکہ سننے والے بڑی اہم باتیں سمجھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے بول بڑے بسیط اور گہرے ہوا کرتے تھے، خاص کر معانی کے لحاظ سے۔ کبھی محض ایک لفظ سن کر دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ کبھی ایک لفظ دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر معانی کے دفتر کھول دیتا تھا۔ جس طرح چشموں سے پانی اگلتا رہتا ہے اسی طرح۔ جتنا ان کے بولوں کے بارے میں سوچو اتنا ہی وہ کھلتے رہیں گے۔ دھیرے دھیرے اور اور معانی کھل جاتے تھے اور حیرانیوں کا عالم بڑھ جاتا تھا۔ ان کے بول تاریخ یا مذہبی کتابوں کے ساتھ بھی جڑ جاتے تھے، اس طرح شک دور ہو جاتے تھے یا غلطیاں درست ہو جاتی تھیں یا بظاہر صحیح اور سچی باتیں حرف غلط ثابت ہوتی تھیں۔ کبھی انسان پر نشے چھا جاتے ان کا کلام سن کر اور کبھی آنسوؤں کی دھاریں بہتی تھیں، ان کی بصیرت اور داخلی نظر دیکھ کر۔

صاحب بظاہر سخت الفاظ استعمال کرتے اور کبھی گالیاں دیتے مگر پہلے پہلے مجھے بہت بُرا لگتا کہ وہ نامناسب الفاظ استعمال کریں۔ ایک دن جرأت کر کے میں نے انہیں کہا کہ وہ گالیاں کیوں دیتے ہیں مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ایک دو تیز گالیاں کھول دیں۔ اس دن سے میں اچھی طرح جان گیا کہ وہ کبھی ناشائستہ زبان استعمال نہیں کرتے بلکہ راز کی بہت گہری باتیں جلالی رنگ میں گالیوں سے سمجھاتے ہیں، اسلئے بھی کہ انسان میں جبروت پیدا ہو جائے راز برداشت کرنے کی اور عام لوگ سمجھ نہ پائیں کہ گالیوں سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ گالی نکالنے کا مطلب ہے گالی کے اندرونی راز باہر نکالنا اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ زہر اگرچہ بہت کڑوا ہوتا ہے مگر اس میں بڑا میٹھا میوہ چھپا ہوتا ہے۔ ہندو لوگ شنکر کو نیل کنٹھ کہتے ہیں، اس کا گلا نیلا ہو گیا ہے زہر کھانے سے ہی، وہ زہر جو کسی دیوتا نے نہیں کھایا۔ کروڑوں لوگ ہیں آج بھی دنیا میں جنہیں عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم سمجھ میں نہیں آتا۔ کوئی کیا کرے! یقیناً وہ عیسیٰ ابن مریم ہیں، علیہ الصلوٰۃ والسلام! ان کو پھانسی بھی نہ دی گئی حالانکہ ان کے بہت سارے ماننے والے ٹائی بھی پہنتے ہیں اسلئے کہ ٹائی کراس کی نشانی ہے۔ گنگا الٹی بہتی ہے!

وہ مارتے تھے مگر جسے مار پڑی ہو، اسے معلوم ہوا ہو کہ ان کی مار کتنی پُراسرار اور میٹھی ہوتی تھی۔ ایک دن تین تھپڑ مارے مجھ کو۔ ایسا لگا کہ سوت کے گالے چھو رہے ہیں میرے چہرے کو۔ ابھی تھپڑ مشکل سے ہی رسید کیے ہوئے تھے کہ میری زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا، خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے تین واقعات جو سورہ کہف میں بیان ہوئے ہیں مجھ پر کھل گئے، خضر کبھی سمجھا نہ تھا۔ ایک دن ان کے کمرے میں شام کے وقت بیٹھا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں نعت پڑھ رہا تھا۔ وہ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ جونہی میں نے پڑھا

''اندریں آب خضر لولوے لالا داری''، تو انہوں نے مذاقاً مسکرایا اور کہا ''یہاو نان خضر'' (یہ خضر کہتا ہے)۔ سبحان اللہ، یکا یک بجلی کی طرح میرے دل میں خیال آیا کہ دراصل خضر کا مطلب۔۔۔۔ ہے۔ نہ انہوں نے کچھ کہا اس کے بعد نہ میں نے کوئی سوال کیا اس بارے میں۔ تب سے آج تک خضر سے یہی سمجھتا آیا ہوں جو انہوں نے فرمایا۔

مگر داستانِ حسن و عشق اتنی ہی مختصر نہیں اور نہ صاحب کی زبان کی کوئی حد! وہاں آلو، مٹر، ساگ، مولیاں، شلغم، بینگن، ندرو، ٹماٹر، پھول گوبھی، بند گوبھی، پالک، پیاز، لہسن، چائے، ستو (خاص کر مکا کا)، وازہ وان کا ایک ایک دور، مکھن، گھی، دودھ، دہی، پنیر، سب کتابیں ہیں، کھلتی ہیں تو معانی کے باب [illegible]۔ اسی طرح گنتی ۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔۔۔ معنی سے بھرے ہوئے نشان ہیں اور گنتیوں کے کھیل بھی۔ [illegible] کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں مگر صاحب ریاضیات سے خوب کام لیتے ہیں۔ یہ بھی بانسریاں ہیں (ریاضی شکلیں خاص کر) جو بجتی رہتی ہیں اور وحدتِ ربّانی کی وضاحت کرتی ہیں۔ اسی طرح مقامات کے [illegible] علاوہ مول (بارہمولہ)، سوپر (سوپور)، ڈنگی وڑھ (ڈنگی وچھ)، پٹن، ناربل، مارسر، تارسر، کونگہ بل، بیرو، کلکتہ، دہلی، بمبئی، ناگ پور وغیرہ۔ پھر سوموار۔۔۔۔۔ ایت وار ہفتے کے نام وغیرہ۔ یہ دنیا حیرت خانہ ہے۔ جب پردہ کھل جاتا ہے تو سب کچھ سامنے آتا ہے۔ اسی لئے صاحب کپڑوں کے بغیر رہتے تھے۔ ہمیں اگر گوئٹے کی طرح مہارت ہوتی تو ہم رنگوں کے بارے میں بھی صاحب کے نغمہ و نے کے حوالے سے بات کرتے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ سبز رنگ اور سفید رنگ مسلمانوں اور اللہ والوں کو زیادہ پسند کیوں۔ مگر لوگ ہرے کرشنا ہرے رام پڑھتے ہیں اور صاحب جانتے ہیں کہ کیوں اور سری مہاراج کی تو بہت پوجا ہوتی ہے دنیا میں اور ہو بھی رہی ہے۔ سری مہاراج جو گرمی، توانائی اور نور کا ہم زمین پر رہنے والوں کیلئے سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

صاحب بار بار قرآن پاک پڑھتے تھے، پڑھتے کیا تھے کہ اس کی تلاوت کرتے تھے۔ عطا محمد صاحب نے سچ کہا ہے کہ ان کی تلاوت بے ہوش کرتی تھی۔ میں ان کی تلاوت سے بے ہوش تو نہیں ہو جاتا تھا مگر میرا جگر لگتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جاتا تھا، صرف اسلئے نہیں کہ اذا ذلت الارض ...... اثقالھا اور والتین والزیتون ...... الخ جیسی آیتیں سمجھ میں آتی تھیں بلکہ اسلئے بھی کہ کتنے بدقسمت اور بدبخت ہیں وہ لوگ جو کلامِ الٰہی نہ پڑھیں، نہ سنیں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ یہ فقیر شہنشاہ ہیں مگر لوگوں کی نظروں سے چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں، لوگ ان پر حرف بھی کستے ہیں مگر وہ رحمتوں کے بغیر کسی چیز سے واسطہ نہیں رکھتے۔ میں اکثر پڑھتا تھا لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل ۔۔(حشر) اور وننزل من

القرآن ماھو شفاء ۔۔۔(بنی اسرائیل)!کبھی کبھی میں روتا بھی تھا، عمداً نہیں، قصداً بھی نہیں، بس آنسو خود بخود پھوٹتے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ بے چارے کی کوئی ایسی مشکل ہوگی کہ اس طرح آنسو بہاتا ہے۔ میں بس ان کی طرف ایک نگاہ ڈالتا اور صاحب کے ساتھ پھر جڑ جاتا۔ وہ گاتے بھی تھے اور بہت ہی پُر زور پُر اثر آواز میں مگر ضروری نہیں کہ ان کی آواز کوئی سنتا۔ یہ نغمے، یہ آوازیں تحت الثریٰ یا پاتال کی آوازیں ہیں، جن و پری ان سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں، کون جانے کہ میں بھی جن تو نہیں!

صاحب کے نغمے، صاحب کی نے اور صاحب کی زبان بہت لمبی کہانی ہے۔ یہ کہانی ہزاروں سال سے سنتے آئے اور سنتے آئیں گے۔ اس کے ساتھ بہت خوشیاں، بہت غم، بہت بہاریں، بہت تباہیاں وابستہ ہیں۔ اس سے پھولوں کے باغ، تختوں کے تختے کھلے ہیں اور کھلتے رہیں گے۔ مگر اس کے ساتھ کانٹوں کے ویرانے بھی وابستہ ہیں، ایسے ہی ویرانے جن پر سے کبھی کبھی ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چلے ہیں۔ کربلا بھی کانٹوں کا ایک ویرانہ ہے جس پر چل چل کر پیغمبروں کی اولاد زخم کھا چکی اور شہادت پا گئی۔ کتنے کربلا ابھی بھی پرانی کہانیاں دہرا رہے ہیں۔ نے و نغمہ و زبانِ الٰہی کی کہانی نے دفتروں کے دفتر پیدا کئے ہیں جن میں پیغمبروں، اولیاء اور صوفیوں کی حیات جھلکتی نظر آتی ہے اور ان کے شاندار روحانی اور عرفانی تجربے بھی۔ کوئی بھی پیغمبر صدائے الٰہی کے بغیر پیغمبر نہیں بنا اور کوئی بھی ولی خدائے تعالیٰ کے ساتھ نہ جڑ کر ولایت کے منصب پر بیٹھ نہ سکا۔ شہادت چاہیے تو عطارؒ کا الٰہی نامہ پڑھیے۔ اس کی معروف کتاب منطق الطیر کھولئے، رومیؒ کی بہت ہی سریلی کتاب دیوانِ شمس تبریز پڑھئے یا ورد المریدین شیخ حمزہ مخدومی و محبوبی جسے خاکیؒ نے لکھا ہے، ہم نے دفتروں کی مثالیں دی ہیں۔ یہاں بھی اور جگہ جگہ۔ معرفتِ الٰہی کے شائقین خود بھی ایسے دفاتر تلاش کریں جن سے ان کی روحانی پیاس بجھ سکے۔ خدا ہم سب کو اپنے قرب سے مستفید ہونے کی سعادت بخشے، آمین!

Agha Ashraf Ali,
Sofia Nishan, Rajbagh, Srinagar

The only magic that moves me to the very ground of my being is the magic of the human person. During the last nearly ninety years I can say I may have been so moved by hardly a few, certainly not more than three. When my Prophet, peace be on him and his progeny, said "if you have seen me you have seen God", so I can vouchsafe I was in the absolute presence of the great saint who I fancy had a glimpse of the godhead. Ushered into the presence of the saint who was the glory of Sopore I found him stark naked but illuminated by the divine consciousness. He possessed nothing yet his magic fed all and sundry. Most people who visited him asked for that divine gift which would give them peace of mind and gladden their soul. Such was this magic that neith r man nor woman was ever conscious of his being naked. I fancy it was so because God had clothed him in His radiant transcendence. Finally I was conscious in his presence of what a great mystic saint has said, "God is a moment of my life."

آغا اشرف علی ریاست جموں وکشمیر کے ممتاز ترین دانشور ہیں، وسیع القلب ہیں اور آزاد منش۔ اپنے ایک دوست چیف انجینئر شوکت حکیم صاحب کے ہمراہ ایک دن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گلریز مشتاق نے ان کی خوش آمدید کی۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے کیلئے ٹھہرے ہونگے۔ ان کی اس مختصر سی تحریر سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کتنا گہرا ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے۔ وہ صاحب کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو جلدی جلدی اپنے تیز رفتار جملوں میں سمیٹ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے مدت سے صاحب کو دیکھا ہے اور بار بار۔

مجھے جب کبھی آغا صاحب سے ملنے کا موقعہ ملتا ہے، وہ احد بب کا نام کچھ اس طرح لیتے ہیں کہ اُن کا دل اُن کی زبان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس تحریر میں آغا صاحب نے سوپور کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی بات دل کو چھو جاتی ہے۔ احد بب اس خطۂ کشمیر کے جلال و جمال تھے۔ اگر گریس (grace) کا مطلب یہی ہے تو اس کا اعتراف کون نہیں کرسکتا۔ گو کہ صرف سوپور ہی صاحب کے جاہ وجلال کا مستحق نہیں مگر سوپور کے ساتھ ان کا پہلا تعلق ہے، اسلئے پہلا حقِ تحسین سوپور ہی سمیٹ لیتا ہے۔ یقیناً احد بب کا ایک ایک قدم سوپور کو جلال و جمال سے بھر دیتا ہے، قدم جن کے نقوش سوپور کی زمین پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ اس جمال کا زوال نہیں، یہ جمال سوپور کو لاحد کائنات کے ساتھ ملاتا ہے اور ارضِ سوپور کو الوہیت کے ساتھ۔ اشرف صاحب کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ہم سوپور کے لوگوں کو، بچوں اور عورتوں سمیت، مبارکباد دیتے ہیں [illegible] احد بب کے عشق و محبت میں غرق کرے اور اس کی ساری شگفتگیاں دکھائے!

تحریر میں صاحب کی فقیری کا ذکر ہے مگر فقیر اور گداگر میں فرق کرنا ضروری ہے۔ گداگر بے سروسامان لاچار و مجبور ہوتا ہے۔ فقیر کی فقیری اختیاری ہوتی ہے۔ وہ مال و دولت اور اسباب کی پروا نہیں کرتا اسلئے کہ وہ بے نیاز ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صاحب بے نیاز ہیں۔ انہیں روپیہ پیسہ، دنیاوی دولت چھو نہیں سکتے مگر وہ بہت غنی ہیں اور ساری کائنات کے مالک۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کا دل ہر دو جہاں سے بے نیاز۔ بقول آغا صاحب اس بے نیازی کی وجہ سے عوام وخواص پر ان کا سحر چھایا ہوا ہے۔ آغا صاحب خود اعتراف کرتے ہیں کہ بے نیازی ہی اس سحر کا سبب نہیں۔ صاحب کا شعور لامتناہی ہے، کُلّی ہے اور روحانی۔ کُلّی شعور کا دوسرا نام خدا ہے۔ ایک اور سبب بھی ہے، جس کی وجہ سے ہر ایک ملاقاتی، مرید ہو کہ نہ ہو، سحر محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے جلوہ الٰہی دیکھا ہے۔ جو کچھ نمک کی کان میں چلا جاتا ہے نمک ہی ہو جاتا ہے۔ اسلئے احد بب بھی جلوؤں کی بارگاہ بن گئے ہیں۔ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کا حوالہ دیکر آغا صاحب گواہی پیش کرتے ہیں کہ جو شخص بارگاہ الٰہی کو دیکھے، وہ خدا کو دیکھے۔ بارگاہ میں جسمِ پاکِ احد بھی شامل ہے۔ اب سب سے بڑا سوال جو کچھ نا سمجھ لوگوں کو پراگندہ کرتا ہے، ان کی عریانی ہے۔ اشرف صاحب کا خیال کہ احد بب انوار الٰہی میں لپٹے ہوئے ہیں اسلئے وہ بشریت کے حدود سے باہر تھے، صحیح ہے۔ لوگوں کی نظریں ان کے تابدار وجود کو دیکھتی رہتی ہیں، اسلئے ان کی توجہ ہی بشریت کی طرف نہیں ہوتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ اشرف صاحب نے بھی ان کے انوار کا قلبی آنکھ سے مشاہدہ کیا ورنہ ان کے قلم پر ''انوار میں لپٹا ہوا'' بیان کیسے چڑھتا۔ سب سے اہم بات جو اشرف صاحب نے کہی ہے وہ یہ کہ کسی بڑے خدا رسیدہ بزرگ کی طرح اشرف صاحب بھی اپنے دل

میں ایک زبردست حال محسوس کرتے ہیں جس سے ان کے دل کی دھڑکن ہی بدل جاتی ہے۔ وہ خدا کو اسی حال میں، اسی حرکت قلب میں دیکھتے ہیں۔ جس نے خدا کو ایک بار دیکھا، اس کا بیڑا پار ہوگیا۔ حضرت موسیٰ کی طرح جس نے خدا کو طور پر آگ کی صورت میں دیکھا۔ وہ بھی تو اس کی حیات کا ایک پل تھا۔ اشرف صاحب کو بالکل اسی طرح دلی سکون حاصل ہوا ہوگا جس طرح عام لوگوں کو حاصل ہوتا ہے دربار احد میں حاضری سے!

مسٹر فاروق احمد ریز وشاہ، اِش برسری نگر

چہرے پہ روحانی چمک، آنکھوں میں سمندروں سی گہرائی، اُنکا پورا وجود ایک عجیب سی تمکنت لئے تھا۔ انہوں نے میرے داہنے ہاتھ کو پورے گیارہ منٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ ان لمحوں کی وجدانی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جب میں ۱۶رجون کو سوپور جاکر احد بب سے ملاقی ہوا۔ اُنہوں (نے) سرمئی رنگ کا اونی پھرن اپنے ناشپاتی جیسے ٹخنوں تک پہنا تھا۔ وہ ایک قد آور جسم کے مالک تھے۔ چوڑے شانے، مضبوط بازو اور نرم ہاتھ، وہ اپنے چہرے پہ ابدی سکون لئے بیٹھے تھے۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس عظیم روحانی شخصیت سے یہ میری آخری ملاقات ہوگی، جو نہ صرف ہماری عظیم تہذیب کے تمثیل تھے بلکہ جنہوں نے ایک زندہ روحانی پیشوا کے طور پر خود کو منوایا تھا۔ وہ تہذیب جو ہزاروں برس کی مستند تاریخی وروحانی تاریخ پہ مشتمل ہے۔

امسال سوپور جاتے ہوئے وہاں عام لوگوں سے انکے مسائل پر تبادلہ خیال کرنا بے شک ایک عبادت سے کم نہیں۔ مگر اس روز اس عظیم روحانی شخصیت سے ملاقات کیلئے میرے (میری) روح کی تڑپ دیدنی تھی۔

سینکڑوں لوگوں کے ساتھ پُر رونق بازاروں اور گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے ہم بالاخر اس عظیم شخصیت کی رہائش گاہ تک آ پہنچے۔ میں (نے) دیکھا کہ لوگوں کا اژدہام احد بب کے دروازے پہ ان کی ایک جھلک کیلئے بے قرار تھا۔ احد بب سے ملنے کی تڑپ پر قابو پانا کافی مشکل تھا۔ میں ان کے عقیدت مندوں کی بھیڑ میں شاید آخری آدمی تھا، جو ان کے دومنزلہ خلوت کدے کے اندر و باہران سے ایک ہلکی سی ملاقات کے منتظر تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ مجھے خلوت کدے کے اندر سے چند ہی لمحوں کے انتظار کے بعد بلاوا آیا۔ اُن ہزاروں لوگوں سے پہلے جو رات کے آخری پہر سے قطار بنائے اُن سے ملنے کے منتظر تھے۔ مقامی لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ احد بب عام طور پر صاحب اقتدار لوگوں سے ملنے سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ احد بب نے کئی با اختیار و نامور شخصیات کو اپنے

خلوت کدے سے بھگا دیا تھا اور ان پر اپنے دروازے بند کئے تھے۔ ان سے میری ملاقات کے بعد یہ بات صحیح ثابت ہوئی کیونکہ کئی معروف شخصیات نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر 'بب' ملاقات پہ آمادہ (نہ) ہوئے۔ اس طرح احد بب سے میری آخری ملاقات میری ذاتی زندگی کیلئے ایک تاریخی لمحہ ثابت ہوئی۔ مجھے اب بھی وہ لمحے یاد ہیں جب میں اپنی بشری کمزوریوں سے آگاہ اور کوتاہیوں سے واقف، اپنے بے قابو دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتا، اندیشیوں (اندیشوں) میں مبتلا کہ وہ ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر مجھے میری کوتاہ قامتی کا احساس دلایں گے، انکے دربار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مگر احد بب کی زود بین و بصیرت افسر روز (افروز) آنکھیں میرے اعمال سے واقف تھیں۔ میں نے ابھی تک [illegible] اعمال کا احتساب نہیں کیا تھا۔ اپنے گناہوں کے سیاہ سمندر کی گہرائی کو نہیں ناپا تھا، کہ میں نے [illegible] توڑے، کتنوں کو رُلایا، کتنی بار اذان کو نظر انداز کر کے دنیاوی معاملات میں اُلجھا رہا۔ کتنی مرتبہ اولیا کرام کی زیارت گاہوں سے گذرا اور وہاں حاضری نہ دی۔ کیسے لوگوں کو بے زبان جانور سمجھ کر ان سے [illegible] سلوک روا رکھا۔ میں وسوسوں میں گھِرا، دل میں دھتکارے جانے کا خوف لئے ان کے خلوت کدے کے در پر پہنچا۔

آہ! یہ تو اور ہی دنیا تھی، نور کی دُنیا۔ ایسا لگا جیسے خاموش احد بب نے میرے اندر کے خوف اور تفکر کو پڑھ لیا ہو اور میرے وسوسوں کو دور کرتے ہوئے میرے ساتھ شفقت برتی۔ مجھے اپنے نزدیک بٹھا کر اشاروں کی زبان میں کئی پیغام دئے جو میرے لئے روز روشن کی طرح واضح تھے۔ جس کی تفسیر میرے تصور سے بھی پرے تھی۔ مجھ تک ان گیارہ منٹوں میں جو پیغام پہنچے ان کی تفسیر کیلئے کم از کم گیارہ ہزار دن یا دو لاکھ چوسٹھ ہزار گھنٹے درکار ہیں۔ کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کا اشارہ، چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے راز، ادھ کھلی آنکھوں کی حرکات، اور ایسے کئی پیغام جس کی تفسیر ایک پاکیزہ روح ہی پیش کر سکتی ہے۔ وہ سب لوگ جو احد بب کی ملاقات سے مشرف ہوئے اور ان کے شفقت آمیز اشارات سے نوازے گئے، ان کے پیغامات کی تفسیر پیش کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جب احد بب نے میرے داہنے ہاتھ کو گیارہ منٹوں تک اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے رکھا، انکی نرم ہڈیوں اور مضبوط نسوں کی قوت نے مجھے اُس لمحہ یہ سوچنے پہ مجبور کیا کہ دنیا کی ساری طاقت مجھے (مجھ) میں منتقل ہوگئی ہے۔ میری نس نس میں جیسے بجلی بھر گئی۔ ان کا ایک عقیدتمند ان کی گداز ٹانگیں دبا رہا تھا اور اسکی آنکھوں سے ٹپک رہے آنسو کے قطرے احد بب کی ٹانگوں کی پیلی جلد میں جیسے غائب ہو رہے تھے۔ آج جب احد بب نہیں ہیں، کون لاکھوں لوگوں کے بہتے اشکوں میں چھپے پیغام کو پڑھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر معروف احمد شاہ

بانڈی پورہ، حال گاندربل

میرک شاہ صاحب کے بعد جن بزرگوں نے بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل کی اور رُوحانیت کی نمائندہ علامتیں تصور کی جانے لگیں، ان میں احد بب کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مجھے روحانی شخصیات سے ملاقات کی زبردست خواہش ابتداء سے ہی تھی اور لوگوں سے پوچھتے پوچھتے احد صاحب کے دربار میں پہنچ گیا۔ میرا وہاں آنا جانا کبھی نہ رکا۔ بعد میں جب بھی میں سوپور جاتا، احد صاحب کے دربار میں حاضری کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اگرچہ میرا گھر سوپور سے کسی قدر دور تھا لیکن جب احد صاحب کی ملاقات کیلئے جاتا تھا، لفٹ ملنے کی فکر کبھی لاحق نہیں ہوتی کیونکہ ان کی برکت سے دیر یا سویر اس کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

اپنے صاحب کی تلاش مجھے احد صاحب کے پاس لائی اور پھر انہوں نے خواب میں آکر میری رہنمائی کی اور مجھے اللہ نے اپنے صاحب سے ملوایا۔ اس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تلاشِ مرشد میں احد صاحب کی معاونت نصیب ہوئی۔

جب کسی مسئلے کو میں اپنے وسائل (resources) استعمال کر کے حل نہیں کر پاتا تھا تو احد صاحب کی طرف رجوع کر کے کوئی نہ کوئی راہ نکل آجاتی تھی۔ احد صاحب میرے ہی نہیں، ہزاروں لوگوں کے روحانی سہارا تھے۔ لوگ مرتے ہیں اور جنتے ہیں اور دنیا کا کاروبار شاید ہی وفات ہوتا ہے۔ چین کے Laughing saint (ہنستے ہوئے مردانِ خدا) کی طرح کسی کی وفات مجھے شاید ہی کبھی جھنجھوڑتی تھی لیکن دو بزرگوں کے انتقال کی خبر سن کر مجھے زلزلۂ قیامت کی یاد آگئی اور ان میں سے ایک احد صاحب تھے۔

میرے نزدیک احد صاحب کسی شخص کی اپنی روحانی اوقات معلوم کرنے کیلئے ایک witness test (یا تیسری آنکھ) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر آپ ہوشمند ہیں اور آپ کی چھٹی حس کام کر رہی ہے تو آپ سے کمال ہوشمندی کی باتیں کرینگے۔ ورنہ آپ اسے بے خبر مجذوب گردانتے۔ احد صاحب زبردست لیکن حکیمانہ چالیں چلتے تھے۔ یہ وہی جانتے جو آپ کی اداؤں پر قربان ہوئے اور جنہیں انہوں نے نگاہ ناز سے نوازا۔

میں نے لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ انہیں معاذ اللہ lock up (قید) میں رکھا جائے۔ آفتاب کو تھوکنے والے یا چمگادڑ کی طرح اندھیروں میں بھٹکے ہوئے نابینا قابل رحم ہیں۔

صاحب کی سلطانی کا اندازہ انہیں کو ہوتا ہے جنہوں نے خود راہ سلوک کی کئی منازل طے کی ہوں۔

کتنی ہی حکایتیں یا واقعات ہیں جو گھر گھر میں سنی جاسکتی ہیں جن کے مرکزی کردار احد صاحب ہیں۔ احد صاحب نے کشمیر کی روحانی space(سما) میں ایک permanent (مستقل) جگہ حاصل کرلی ہے۔ لاکھوں عقیدت مندوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور جوان کے بہت قریب رہے ہیں ان کیلئے ہر آن وہ available(موجود) ہیں۔ مستقبل کی کشمیر کی ثقافتی یا روحانی تاریخ احد صاحب کو صرفِ نظر نہیں کرسکتی ہے۔ میری گھر والی ایک دفعہ شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھی کہ یکا یک ایک متو نمودار ہوا اور اس نے کہا مجھے احد صاحب نے بھیجا ہے آپ کی تسلی [illegible] ایک بڑی باطنی سلطنت کے روح رواں احد صاحب تھے اس لئے ان کی کوٹھری عاشقوں کا مرجع [illegible] احد صاحب کے صاحب کرامت بزرگ ہونے میں ان ہی لوگوں کو شک ہے جو کرامتوں کے [illegible] نہ ہوں۔ شاید ہی کوئی بڑی محفل میں نے اب تک دیکھی ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی چشم دید گواہ [illegible] کرامتوں کا۔

ایک دفعہ وہ ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہیں جبراً لایا گیا تھا۔ ایک بستر مرگ پر بیٹھے مریض کی شفایابی کیلئے۔ لیکن انہوں نے مریض کی طرف توجہ کم کی اور ہمسایہ مکان کے اندر چلے گئے۔ تارے والوں نے اسی وقت ان کی اس ادا کو سمجھ لیا اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ایسے سینکڑوں واقعات راقم الحروف نے سنے ہیں یا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھے بھی ہیں۔ احد صاحب ایک phenomena (عجیب وغریب مظہر) تھے۔ ایسے لوگ کم ہی زمین پر چلتے ہیں۔

مادام زاہدہ

بابا پورہ، حبہ کدل، سرینگر

کشمیر خطہِ بے نظیر صدیوں سے روحانی شخصیتوں کی وجہ سے مشہور ہے یہاں کچھ تو باہر سے چل کر آئے اور کچھ علم و ہنر پر مشتمل کاروان لیکر یہاں آئے، کچھ علم و فضل لیکر آئے جن کی یہاں خوب پذیرائی ہوئی۔ یہاں ہر دور میں بزرگان دین پیدا ہوئے اور لوگوں کی خدمت میں لگ گئے۔ یہاں جگہ جگہ صوفیوں اور اولیاء کرام کی زیارتیں بھی ہیں جہاں لوگ روحانی سکون حاصل کرتے ہیں اور روحانیت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کبھی ان پر وقت کے حکمرانوں نے زیادتی کی اور کبھی نام نہاد ملاؤں نے۔ غرض کشمیر ہر لحاظ سے "پیرواَر" ہے۔

بیسویں صدی میں یہاں بہت سارے بزرگان دین پیدا ہوئے اور لوگوں کو اپنی عنایت سے فیضیاب کیا، ان میں کچھ بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ سنہ صاحب، لسہ صاحب، احد صاحب بہت ہی مشہور بزرگ گزرے۔ لسہ صاحب اور سنہ صاحب کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر احد صاحب سوپور کا دیدار ضرور کیا۔

احد صاحب ایک پروقار اور قدآور شخصیت کا نام ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ مجھے ان کا دیدار کرنے کا موقع ملا۔ ایک دن میں نے ارادہ کرلیا کہ میں ان سے ملوں۔ صبح صبح سرینگر سے نکلی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سوپور پہنچ گئی۔ ان کے گاؤں پہنچ کر ان کے گھر کے آنگن میں لوگوں کا جم غفیر دیکھا۔ چاروں طرف بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد، کوئی کھڑا کوئی بیٹھا، ان کے دیدار کیلئے بے تاب، سب بے چین۔ احد صاحب اپنے کمرے میں کمبل تان کر لیٹے تھے اور باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ دو گھنٹے تین گھنٹے، پھر چار گھنٹے ہوئے مگر وہ بہت مست قلندر سب سے بے نیاز سوئے رہے۔ چونکہ سرینگر سوپور سے دور ہے اسلئے میں واپس بے مراد، دل میں بوجھ لئے سرینگر کی طرف روانہ ہوگئی۔ دل چاہتا تھا کہ شام تک ان کا انتظار کروں مگر سردیوں کی آمد تھی اور دن چھوٹے تھے۔ بحالت مجبوری واپس آنا پڑا۔

وقت گزرتا گیا۔ اچانک ایک دن میرے شوہر نے مجھ سے کہا کہ احد صاحب کے پاس جانا چاہوگی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں نے حامی بھرلی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے سوچا شاید میری قسمت میں اب ان کا دیدار کرنا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے ساتھ ان کے دوست پروفیسر حبیب صاحب بھی جائیں گے۔ اس طرح میری مراد بھر آئی اور اس مردِ پیر کامل کے دربار کی طرف ہم روانہ ہوئے۔

بادشاہ و سلطان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جو رعایا کو زخم دیتے ہیں اور دوسرے جوان زخموں کا رفو کرتے ہیں۔ ایک وہ سلطان جو اپنے جاہ و حشمت فوجیوں کے رعب سے حکومت کرتا ہے دوسرا وہ جو اپنی عظمت، روحانیت، خدمتِ خلق اور خدا کے بندوں سے محبت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ وہاں دبدبہ و رعب سے کام نہیں چلتا۔ وہ حلیمی، رحم دلی، اپنی سادگی سے حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ وہ مردِ آہن اور مردِ خدا ہوتے ہیں جن کی قسمت میں دو جہان کی حکمرانی لکھی ہوتی ہے۔ یہ سلطان وقت و آخرت ہوتے ہیں۔

میں نے سنا تھا کہ احد صاحب ننگا گھومتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے ہیں۔ میں راستے بھر خدا سے التجا کرتی رہی کہ میرے معبود آج وہ ننگا نہ ہو اور گالیاں نہ دے۔ میری دعا اللہ کے دربار میں قبول ہوئی۔ پورے راستے میں پروفیسر حبیب صاحب جو کہ احد صاحب کے دوست بھی ہیں، ان کی کرامات کا ذکر کرتے رہے اور اس طرح ہمارا راستہ طے ہوا۔ حبیب صاحب کی وجہ سے ہمارا راستہ کسی نے بھی نہیں روکا اور ہم سیدھے ان کے کمرے میں گئے جہاں وہ مرشد کامل براجمان تھے۔ جب ہم نے اندر قدم رکھا تو انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ وہ نظر تھی کہ بجلی کوندی جو سیدھی دماغ سے ہوتی ہوئی دل میں پیوست ہوئی۔ وہ نظر جو اندر کا اندھیرا پل بھر میں اجالے میں تبدیل کرتی ہے۔ وہ نظر جو شاہوں کو فقیروں کو بادشاہ میں تبدیل کرتی ہے، وہ نظر جو مٹی کو سونے میں تبدیل کرتی ہے۔ علامہ اقبال کا شعر میرے ذہن میں گونجا ؎

اے نگہ تیری میرے دل کی کشاد
کھول مجھ پر نکتہ حکمِ جہاد

سر آدم سے مجھے آگاہ کر
خاک کے ذرے کو مہرو ماہ کر

احد صاحب کی شخصیت الفاظ کے دائرے سے باہر ہے۔ مگر مجھ جیسے انسان صرف اوپر اوپر سے بول سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت پُر وقار، آنکھیں دہکتے شعلے جو انسان کو پل بھر میں جلا کر راکھ کر دیں۔ ان کا چہرہ کنول کے پھول کی طرح کھلا۔ سادھا بھولا بھالا چہرہ انسان کے ہر سوال کا جوابِ نقش۔ بقول علامہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خیر جب ہم ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آئی اور گئی۔ جیسے چاند بدلی میں چھپ گیا، جیسے ویرانے میں بہار آئی۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا، بیٹھنے کیلئے کہا۔ اور

وہ میری طرف چپ چاپ دیکھ رہے تھے، مگر مجھے لگا کہ سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی نگاہیں دل میں پیوست ہوگئیں اور انہوں نے سوال کرنے شروع کئے اور میں اندر سے ہی جواب دیتی رہی۔ اس طرح یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہا اور اس کے بعد ان کی نگاہ کرم سے دل اور روح دونوں روشن ہوئے۔ اور میں بھی ان خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں شامل ہوگئی جنہوں نے اُن سے بات کی۔ علامہ کا یہ شعر بالکل صحیح ثابت ہوا۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ان سے ملاقات میری زندگی کا حاصل ثابت ہوئی اور میں خوشی خوشی گھر واپس آ گئی۔"

صاحب کے ساتھ ایک دفعہ ملاقات اور ایک ہی ملاقات میں بہت ساری عنایات بٹورنا خوش بختی ہے۔ ان عنایات کا اگر اعادہ کریں تو اچھا ہوگا: سوپور کا جم غفیر، صاحب کا کمبل تان کر لیٹ جانا، سردیاں اور دن چھوٹے، ان کے کمرے میں سیدھے چلے جانا، چاندکی سی ان کی ہلکی مسکراہٹ، ان کی آنکھوں کی جاذبیت، نگاہِ کرم، بجلی جیسی نگاہ کا دل میں پیوست ہو جانا، اندھیرا اجالے میں تبدیل ہو جانا، کنول کی طرح ان کا چہرہ کھلنا، تقدیر بدل جانا، ان کی ملاقات زندگی کا حاصل ہونا – یہ اعمال نامہ مادام زاہدہ ہے جو ان کے دست راست میں جانِ جاناں احد بب سوپور نے رکھ دیا۔ اس سے بڑی نیک بختی کیا ہے۔

طے شود جادۂ صد سالہ بہ نگاہے گاہے

ایسا ہی ایک فرمان شوکت صاحب کے نام بھی نکلا ہے اور میں اس سے بھی آشنا ہوں!

رازہے رازہے رازِ درونِ کائنات!

ڈاکٹر شاہدہ فاضلی

I feel really happy and privileged to write about a great soul with whom I was fortunately associated for quite some time. Ahad Sahab of Sopore (fondly called Bub by everyone because he was a father figure) was a noble human being.I need not write much about the personality as that must be already written in the book in detail. I will write about my personal experience with him. I used to get solace on reaching Sopore and just sitting in front of him. His presence was such that he had a majestic aura. It was not possible to look into his eyes directly. Whenever I would feel low or had some problem, I would rush to Sopore. One did not have to talk to him and tell one's problem. It was just within our hearts, without voicing anything one would communicate. So there were no inhibitions. I would pour out my heart there and the response was evident. Although he would never preach or talk to us directly but since the day I started going to him, I changed as a person slowly and steadily for good. MAY GOD REST HIS SOUL IN PEACE.I WILL ALWAYS MISS HIM!

ڈاکٹر شاہدہ فاضلی کو بھی صاحب کے ساتھ بیٹھنے کی خصوصی رعایت کا احساس ہے جس سے بھی ان کے دل کو آسائش ملتی ہے۔ انہیں صاحب کی آبدار آنکھوں کی تابداری گہرائی سے محسوس ہو چکی ہے اور وہ ان کے نورانی وجود کا ادراک حاصل کر چکی ہے۔ یہ میرے خیال میں ان کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔ حسنِ یوسفؑ نے آج تک کتنے دلوں کو منوّر کیا اور وہ خود بھی محسوس کر رہی ہے کہ ان کے اپنے وجود میں دھیرے دھیرے خاصی تبدیلی آئی ہے۔ ایک اور اہم بات ہے بے زبانی کے باوجود باتیں کرنا، بے تکلفی محسوس کرنا اور ان کے پاس بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالنا۔ صاحب ایسے فیّاض ہیں کہ جب دینے پر آتے ہیں تو دریا کی طرح سینہ کھولتے ہیں۔ نورانی وجود کی یادوں میں کھوئے کھوئے رہنا اور فرقت کا درد محسوس کرنا بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔

ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

Mrs Maria Hearty
Zabarwan, Nishat

"We are People who need to love, because
Love is the soul's life,
Love is simply creation's greatest joy."
Hafiz

I was introduced to Ahad Sahib by my dear friend Habib.

On arrival at Ahad Sahib's compound I was filled with anticipation, I had heard so much about this great man. Thousands of people had already gathered to see, touch or merely be near to the great saint. I was humbled by their devotion...

I do not claim to understand, perhaps I am reluctant to understand as to do so is to give up everything that is comfortable, safe and simple in our lives. To behold one who has given up everything and devoted himself totally to God's will is to be filled with wonder and joy.

I was brought by a sense of curiosity but left with a sense of peace and an understanding that there will be many aspects of Ahad Sahib's love, too profound, too invisible for me to ever grasp. His whole being is devoted to service of others and he lives on, even in death. That power remains for it is life force, a spiritual essence, it has no end.

Thank you Habib for introducing me to Ahad Sahib! Your gift may be the most enduring gift I will ever receive.

مادام ماریا ہارٹی آئرش کشمیر خاتون تجسس کی بناء پر صاحب کی ملاقات کیلیئے سوپور چلی گئی۔ اس نے صاحب کی عظمت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ سوپور پہنچتے ہی اس نے صاحب کے دربار میں ہزاروں لوگ دیکھے جو صاحب کے جسد پاک کو چھونے کیلیئے، انہیں دیکھنے کیلیئے یا کم سے کم ان کے نزدیک جانے کیلیئے جمع ہوئے تھے۔ ان کے جوش محبت، ان کی جانثاری دیکھنے کے بعد ماریا کو محسوس ہوا کہ صاحب کا عرفان کوئی آسان کام نہیں۔ عیش و آرام ترک کرنا، آسان گذر بسر چھوڑ دینا اور جوکھم مول لینا سہل نہیں اسلیئے عرفان بھی آسان نہیں کیونکہ عرفان کیلیئے ان چیزوں کی قربانی ضروری ہے۔ وہ صاحب کو دیکھ کر مسرت سے لبریز ہوئی مگر حیران بھی ہوئی کہ کس طرح اس مردِ کامل نے منشاء الٰہی کے سامنے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ تجسس لیکر [illegible] قلب لیکے چلی گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ صاحب کے عشق کے بہت پہلو ہونگے اور گہرے، [illegible] حصول اس کیلیئے ممکن نہ ہوگا۔ وہ فنا ہو کر بقا پا چکے ہیں اور اپنے تیئں لوگوں کے لئے وقف کر چکے [illegible] و دائم جبروت ہیں مگر زندگی کی توانائی ہیں، نہ ختم ہونے والی حقیقت ہیں اور روحانی الاصل۔ اسے (ماریا) وہ سوغات ملی ہے جس جیسی سوغات زندگی بھر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ماریا نے اپنی تحریر کے ساتھ دھاگوں کی تص[illegible] شامل کی ہے جس کے معانی کھولنا یوں تو مشکل مگر رنگین اور قسم قسم کے بندھن تو صاف دکھائی دیتے [illegible] بندھن میرا خیال ہے موت کے بعد بھی ٹوٹنے محال!

سیمین طارق

The great saint....I have so much to tell about baba but in certain cases I've restrictions to speak about his miracles. I remember the day I first met baba. I had heard a lot about the great saint before my marraige but I had never met him. Before my marraige he had come to my parents home and opened the main gate. At that time we had some problem which was solved the very next day....Miracle....the thing which was impossibleThen soon after my marraige I met baba....a dream come true. He was sitting outside saying something which Icouldn't understand. I was really

scared to go near him as i had heard that he beats people but he welcomed me and from that day he used to call me Fata. I've spent just 5years with baba but in just 5yrs he showed me what he is.

He knew everything....one day my husband fought with me. I was really upset and went to Sopore along with my husband. Baba was sitting in Hamam when both of us entered. My husband was standing behind me when baba turned towards us and told me "Fata don't be afraid of your husband. He cannot harm you. Whenever he fights with you don't spare him.Teach him a lesson". I was shocked to hear this and my husband too.

In short I want to convey that whatever I have got in these years its (it is) because of baba's blessings. He didn't have any kind of greed....he used to walk on road bare footed. He couldn't feel the pain of scars on his body, he used to go out at chilly winter nights naked and he didn't feel the cold because he had left everything in the path of God. Today when some people think that baba is no more.... I know he is still there watching each of us. He still solves all my problems. MY BUB.....Hazaroon saal nargis apni baynoori pa rooti hai, badi mushkil say hota hai chaman may deedawar paida.

سیمین مظفر کی نرگس بھی اپنی بے نوری پہ روتے روتے آخرکار دیدہ ور ہوگئی اور وہ بھی صاحب کے طفیل۔ پانچ سال کے عرصے میں اس کو صاحب نے بتایا کہ وہ کون ہیں۔ وہ صاحب کی کرامات کی نقاب کشائی نہیں کرسکتی تاہم شادی سے پہلے صاحب اس کے مائیکے تشریف لے گئے تھے اور ان کا پھاٹک کھول دیا تھا۔ پھر دوسرے دن ہی ان کا ایک مشکل مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ وہ پہلے پہلے صاحب سے ڈرتی تھی مگر مانوس ہوکر فاطہ نام پاگئی۔ صاحب کے دئے ہوئے ناموں پر شک کرنا قطعی غلط ہے۔ فاطہ نام پانا بجائے خود ایک بہت بڑا فیض ہے۔

میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک ہوتی رہتی ہے اور صاحب اس سے واقف ہوتے ہیں۔ایک دفعہ سیمین کے میاں کو ڈانٹ سنائی اور سیمین کو ہدایت دی کہ پھر کبھی جھگڑا کیا تو مزہ چکھانا اُسے۔

صاحب کے برہنہ پا چلنے اور سرمائی شدتوں میں عریاں رہنے پر سیمیں کو درد محسوس تو ہوتا ہے مگر وہ جانتی ہے کہ راہ خدا میں فنا ہونے سے صاحب پر معمول کی زندگی اثر انداز نہیں ہوسکتی۔اس کا ایمان ہے کہ صاحب حیات ہیں، سنتے ہیں اور اس کی مشکلات دور کرتے ہیں۔"بب" کی مدھر تا زبان کو ہی مٹھاس سے نہیں بھرتی بلکہ اس کے دل کو بھی شاداب کرتی ہے۔

طارق احمد ککرو تو پیدا ہی ہوا ہے صاحب کے طفیل اور اس کا احساس اس کی والدہ کو [illegible] پرانے ایام یاد دلاتا ہے۔طارق احد صاحب کی محبت میں گنگنا تا رہتا ہے۔مگر ایک دن فوج [illegible] باوجود صاحب کیلئے محفل موسیقی کا انتظام کر گیا۔موسیقاروں کی پوری جماعت لانے میں کامیاب ہوا [illegible] راستوں پر شب بیدار فوج گشت کر رہی تھی۔گھر میں داخل ہوا تو صاحب بول اٹھے کہ انہوں نے [illegible] کو بتایا تھا کہ تم کو آنے جانے میں روک نہ لیں۔صاحب کے اولی الامر منکم ہونے پر کون شک کر سکتا ہے۔
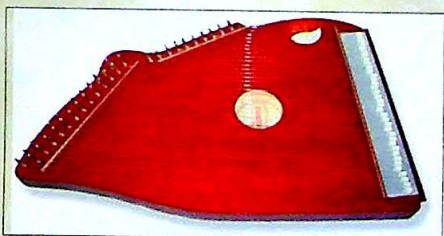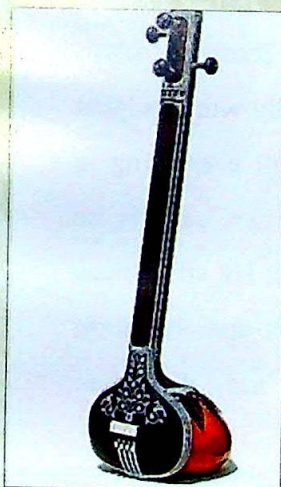
مسٹر ارشد لون (کے اے ایس)

AHAD BUB of Sopore is the personality who is very difficult to define in the vision of Science. The Rehber- Murshid was not feeling hot in scorched summer and was not feeling cold during shriveled winter like humans. His personality thus reflects the spiritualism and touches the extreme edges of exceptions of Science. I remember it was summer season of year 2005 I used to

visit Sopore once in a week from Wadoora Agriculture College and one day i decided to have a visit to AHAD BUB . It was amazing when I saw a large gathering of people irrespective of religion and region. FortunatelyI got an opportunity to look at him in this mob. I cannot express in words how much depth I saw in his eyes and how much I relaxed... Some people always criticize that AHAD BUB used to remain naked and his body exposure to woman folk is un-Islamic but the philosophy behind this fact is, the people themselves are actually naked even though they are weared by costly clothes and one who is able to see the phenomenon by the grace of God will never bother to hide himself. In my opinion he was not the saint of Muslims only but non- Muslims are also very thankful to him. During the year 2009-10, I was doing PhD. in Himachal Pradesh (Hindu state) and it is amazing a Hindu person namely Dr.Y. C Gupta informed me about the death of AHAD BUB, he was very sad..

So, it is the time when we should get a lesson and should strictly follow the preachngs or teachings of our Muslim saints like AHAD BUB.

May God bless AHAD BUB and his followers.

مسٹرارشدلون (کے اے ایس) کواحساس ہے کہ سائنس صاحب کی ذات کی پہچان نہیں کراسکتی، روحانیت کراسکتی ہے۔ وہ صاحب کی ذات سے بہت متاثر ہے، خاص کران کی چشمان مبارک کی گہرائیوں سے جن گہرائیوں نے اس کوقلبی سکون عطا کیا۔ وہ جب پہلی باران سے ان کے دولت خانے پہ ملاتو عوام کی کثیر تعداد دیکھ کر متاثر ہوا کہ جن میں بلالحاظ مذہب ومقام لوگ شامل تھے۔ وہ ان کے عریاں جسم کو دیکھ کر خفا نہیں کیونکہ خدانے جن لوگوں کو بصیرت عطا کی انہیں اس سے کیا غرض، انہیں تو اپنی عریانی کا غم کھانا چاہیے، عریانی جو اچھے خاصے لباس کے بیچوں بیچ بھی دکھائی دیتی ہے۔ لون صاحب فراخ دل ہے اسلئے مذہبی نزاع اسے اثر نہیں کرتا۔ صاحب تو سب لوگوں کو اپنے دربار میں جگہ دیتے تھے۔ ۱۰-۲۰۰۹ میں ہماچل پردیش میں اسے ڈاکٹر وے ایس گپتا نے ہی صاحب کے گذر جانے کی خبر سنائی تھی اور وہ بھی افسوس کے ساتھ۔ اس کی تمنا ہے کہ مرداں خدا کی تعلیمات عام کی جائیں۔ وہ صاحب اوران کے جانثاروں کیلئے دست بدعا ہے!

اشتیاق احمد (نہال پورہ)

Ahad Bab R.A. was coming to my village NIHAL PORA 30 kms away from Srinagar at least once or twice in month for visiting the Famous Shrine of Molvi Mohiudin Khan SAHIB R.A. here. What BAB was asking was becoming true.It was difficult for a common man to recognize BAB as HE was of great KAMAAL AND hundreds of People got treatment from dangerous diseases there which doctors could not treat.

مسٹر اشتیاق احمد جواں سال ہے مگر اس کے باوجود روحانیت کا شوقین ہے۔ میں نے اس کا نوٹ ایک بار پڑھا۔ اندازہ ہوا کہ اُسے صاحب کی طاقت کا شعور ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ یہ بھی کہ ان کا دست مبارک دستِ شفا ہے۔ یقیناً انسان کے لئے بہت دشوار ہے کہ وہ صاحب کی ذات سے واقف ہو جائے لوگ بقدرِ توفیق ان کے نزدیک جانا ناممکن نہیں۔ خدا تو انسان کے اتنے نزدیک ہے جتنی کہ اس کی شہ رگ۔ مولوی محی الدین خان رحمتہ اللہ علیہ بڑے بزرگ تھے مگر صاحب نہال پورہ کیوں جاتے تھے، اس بارے میں وثوق سے کچھ کہ نہیں جاسکتا۔ ہم نے بھی خان صاحب کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سنی ہیں، ہم بھی اُن سے محبت کرتے ہیں!

My eyes fell upon the grace of Ahad Bab for the first time in early 2000. On a bright sunny day I along with my parents visited the apple town of Sopore. Ahad bab was sitting in the front lawn of his house on a chair. He was a picture of calm and deep reflective demeanour as if completely unaware of the thronging and noisy mass of people around him gathered their (there) for his blessings. Ahad bab was scantily dressed but had the majestic aura of a lion in his own den. The garden was fenced and people tied pieces of cloth (dachi) on the fence as they asked for their wish (mannat).

My second and third visit followed somewhere during 2008/9. This time around I found Ahad Bab sitting inside the house in a room. His face reflected the sacredness of his being and all around him was a stillness and serenity as if the entire universe was trying to figure outwhat was going through Ahad Bab's mind.

Ahad Bab has always been a source of strength and solace. He often appears in my dreams and remains a strong guiding force.

ڈاکٹر عمران ڈار صاحب کے استغراق کی پہچان کر چکا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ استغراق کے لمحات میں صاحب دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جو ان سے فیض پانے کیلئے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور شور و غل بپا کرتے ہیں۔ عمران صاحب کا خیال ہے کہ ہمارے صاحب نورِ الٰہی میں لپٹے ہوئے شیر ہیں جو لگتا ہے کہ اپنے غار میں بے نیاز بیٹھے ہوتے ہیں۔ آغا صاحب نے بھی صاحب کے ارد گرد نورانی کیفیات کا ادراک کیا ہے۔ یہ ادراک غیر معمولی ہے۔ عمران نے تو نازنین چہرے کی کیفیات کا بھی ادراک کیا ہے اور ان میں صاحب کے دل مبارک کی پاکیزگی بھی مشاہدہ کی ہے۔ نیز ان کی سنجیدہ خاموشی اور استغراق سے ایک اور حقیقت کا پتہ لگایا ہے کہ ساری کائنات کا سناٹا اور سکون بھی ان کے ذہنی سکون کا عکّاس ہے۔

ڈاکٹر عمران صاحب کی ملاقات کرتا رہتا ہے مگر خوابوں میں بھی صاحب اس کیلئے سرچشمہ ہدایت و رہنمائی ہیں جس ہدایت سے اسے جبروت حاصل ہوتی ہے۔

محمد اشرف آہنگر نٹی پورہ، سرینگر

"And the big man never used cushion at back while sitting and nor put his legs on the floor".

اشرف صاحب نے صرف دو باتیں کہی ہیں اور دونوں باتیں بہت اہم ہیں، اتنی اہم کہ صاحب کی حیاتِ طیّبہ کی مکمل تفصیل ہے۔ اللہ جب مہربان ہوتا ہے تو اسی طرح۔ وہ تکیہ کبھی استعمال نہیں کرتے تھے اسلئے کہ خود کفیل تھے، کسی اور سہارے کے طلبگار نہیں تھے نہ ضرورت مند۔ پاؤں نہیں پھیلاتے کہ [illegible] حضور رہتے تھے اور تیار خدمت خلق اللہ میں۔ خدمت ایسی جو زندگی سنوارے، زندگی جاوداں بنا [illegible] مالک دو جہاں سے بچائے۔ آرام ان کو نصیب نہیں تھا کیونکہ وہ آرام نہیں چاہتے، کیونکہ وہ کبھی [illegible]، کام کرتے رہنا زندگی ہے اور پاکیزہ زندگی!

اعجاز، زبرون نشاط سرینگر

عظیم الشان قلندر احد صاحب کے بارے میں کیا لکھیں، کیسے کریں سمندر کو کوزے میں بند۔ کہاں ان کی ابتداء سمجھیں اور کہاں انتہا۔ ان کی مروّت اور ان کا فیض بھی کیسے نظر انداز کریں کہ جس کے طفیل عاشورہ کی شب کے دوران یہ سطور قلمبند کرنے کا خیال آیا۔ میری بساط کہاں اور ان کی بلندیاں کہاں!

فروری ۱۹۸۳ء میں ناچیز کو طالع نے ان کے مقدّس آستانے پر کھڑا کیا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ آستانے کے قریب مرحوم شفا صاحبہ کھڑی تھیں۔ فرمایا "بھائی آئے ہو تو اندر چلے جاؤ"۔ یہ کہتے ہوئے پہلے وہ اندر چلی گئیں۔ میں ذرا آگے بڑھا کہ صاحب کی نظر مجھ پر پڑی اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ پہلی آواز: "جو یہاں آتا ہے پھر کہیں نہیں جاتا"۔ وہ میری طرف متواتر دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غضب کی مستی اور سمندر کی گہرائی تھی۔ ایسا لگا کہ ایک بحرِ بیکراں میں ہچکولے کھا رہا ہوں۔ پسینہ کیا آ رہا تھا کہ گویا نہا تا تھا اور کپڑے تر! دروازے کے پاس بیٹھا۔ ایک صراحی ان کے پاس تھی، سرخ کانچ کی۔ ایک کالی کتیا پاس بیٹھی تھی جس نے اسی صراحی سے پانی پی لیا تھا۔ آپ نے بھی اسی صراحی سے پانی پیا۔ میں سوچنے لگا کہ بنا پوشاک اس شخص کو کیسے بزرگ کہا جائے جو ایسا پانی پیے۔ آپ اٹھے، میرے پاس سے گذرتے ہوئے ایک شخص اکبر کاک سے کہا "یہ دپان بوچھس موت" (یہ کہتا

ہے میں اپنے آپ سے بے خبر ہوں)۔ معاملہ صاف ہوگیا۔ آپ چیزے دگر ہیں اور میں اناڑی!

بار ہا فرماتے: آٹھ سال تجھے جیل میں رکھوں گا''۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آٹھ سال مکمل ہو گئے۔ میری ایک مشکل حل ہو گئی۔ مسئلے حل کرتے البتہ باور نہ کراتے کہ یہ ان کی کرامات ہیں۔

ہمارا بیٹا ہونے والا تھا۔ اچانک ہمارے گھر تشریف لائے۔ میری گھروالی پر ایک نظر ماری اور سوپور چلے گئے۔ قریباً ایک مہینے کے بعد بیٹا تو پیدا ہوا مگر گھنٹے دو گھنٹے تک زندہ رہا۔ بعد میں معالجوں سے پتہ چلا کہ ماں بیٹے کی زندگی خطرے میں تھی۔ پس ماں کا بچنا نظرِ کرم کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق بعید از امکان مگر پورے پانچ سال کے بعد عنبر فاطمہ پیدا ہوئی اور پھر زُجاج فاطمہ۔ دونوں بیٹیوں کے نام صاحب نے رکھے۔

آپ کی علالت کے دوران صورہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں حکم ملا کہ میں ان کیلئے باریک سوتی کپڑے کے فرن لاؤں۔ میں نے گاڑی دوڑائی اور حضرت بل کے بازار سے آسمانی اور ہرے رنگ کے دو فرن بنوا کے لائے۔ کفن پہننے سے پہلے یہی فرن ان کی پوشاک تھی۔ صاحب کا جسدِ پاک دیدار کیلئے رکھا گیا تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ان کے فرزندار جمند کا حکم ہوا کہ پہلے سے مقرر شدہ جگہ پر تجہیز وتکفین میں حاضر رہوں۔ گلریز مشتاق اور میں نے قبر کی نشاندہی کی۔ لحد تیار ہوئی۔ محسوس ہوا کہ ایک کشادہ آرام گاہ بن گئی ہے جس سے نافہ وعطر کی دھاریں پھوٹ رہی ہیں اور ایک روحانی دربار کی تیاری ہو رہی ہے۔

آپ کے رنگ نت نئے! کھڑے ہوتے تو شیر ببر کی طرح، چلتے تو رقصِ بسمل، تشریف

رکھتے تو معتبر انداز میں ہاتھ پیر سمیٹے میر محفل محوِ کار! جلالی کیفیت میں شعلے اُگلتے۔ تبسّم کرتے تو پھول شرماتے۔ تناول فرماتے یا چائے کی چسکیاں لیتے تو دیکھنے والوں کے منہ میں ذائقہ بھر دیتے جو دیر تک نہ جاتا! بچوں یا بڑوں کے ساتھ کھیلتے تو کھلاڑی پکے۔ غریبوں، لاچاروں، دل شکستوں اور بے یاروں سے ملتے تو دستگیری کے ساتھ ساتھ ان میں طاقت ترسیل کرتے۔ گنگناتے تو موسیقاروں کو پچھاڑتے، غمزہ مارتے تو جان لے جاتے!

جان وندیو ہا بو پان وندبو
زوتہٕ جان وندے میانہِ پیرہٕ لوتے لو

ادفر قادری، زبرون، سری نگر

عنایت اُس پُر آس شخصیت کی	جس نے امید و آرزو جگائی
عنایت اُس صاحب تخت کی	جس نے سادگی و بے تکلفی سکھائی
عنایت اُس محسن انسانیت کی	جس نے دردمندی و بردباری سکھائی
عنایت اُس حکیم و شفیع کی	جس نے زخم پر مرہم لگائی
عنایت اُس تقدس مآب روح کی	جس نے حیا و پردہ داری سکھائی
عنایت اُس بہادر صاحب کی	جس نے جرأت و بے باکی سکھائی
عنایت اُس ابوالابصار کی	جس نے آگہی کو اشکباری سکھائی
عنایت اُس پیکر اخلاق کی	جس نے کردار و خصلت سکھائی

اولاد

ہمارے صاحب نے جس جس مرید کے سینے میں عرفانِ الٰہی کا بیج بویا وہ ان کی اولاد کہلایا مگر جو بچے ان کی پشت سے پیدا ہوئے وہ ہر لحاظ سے انکی اولاد کہلانے کے مستحق ہیں۔ پہلے یہ کہ اُن کی رگوں میں صاحب کا خون دوڑ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے سینے میں بھی صاحب نے معرفت کا بیج بویا ہے اور یقیناً۔ جسدی اور روحانی اولاد ہوتے ہوئے وہ ان تمام جوہروں سے مستفید ہیں جنہیں ہم سائنسی زبان میں جین (gene) کہتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ کم سے کم روحانی

لغت میں والدین یا اولاد کوئی معنی نہیں رکھتے کیونکہ ابدی حقیقت ناقابل تقسیم ہے۔ اس سے نہ کچھ جنم لیتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ جو حقیقت جینے اور مرنے سے مبرّا ہو، اس کا حسب کیا نسب کیا۔ تاہم جس طرح ہم مسلمان ہیں، عیسائی ہیں، یہودی ہیں، جین ہیں، بودھ ہیں، ہندو یا پارسی ہیں، اسی طرح ہم ہندوستانی، پاکستانی، عربی، عجمی، ایرانی، افغانستانی، مغربی یا مشرقی ہیں۔ ہم احد احمد یا محمدؐ ہیں یا کرسٹوفر، پریم یا زاہدہ، عابدہ یا وکٹوریہ، اوشا یا للنی۔ ان ناموں سے اور حسب ونسب سے ہم پہچانے جاتے ہیں۔ یہ پہچان یونہی نہیں اور اس کی گہرائیاں غیر معمولی ہیں۔ آج تک ہم نے سنا ہے، پڑھا ہے کہ سیدنا حسنؑ اور سیدنا حسینؑ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شانوں پر چڑھتے تھے اور جناب سیدہ فاطمہ علیہا السلام ماں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔ ہم نے یہ نہ سنا کہ یہ افعال غیر اسلامی

تھے، غیر اخلاقی تھے یا فضول، بے مطلب، نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ فضل، یہ خاص عنایت حدیثِ کِسا سے بھی ہمیں معلوم ہوسکتی ہے اور بے شک!

پہلے ہی کہا گیا ہے کہ صاحب کی دو اولاد تھیں، ایک فرزند ایک صاحبزادی۔ صاحبزادی کا انتقال ہو چکا ہے اور فرزند جناب عطا محمد صاحب اپنے رندِ زماں احد صاحب کے بعد ان کی جگہ پر بیٹھے ہوئے ذمہ واریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں حصّہ بقدر جسّہ بہت مشکلات کا سامنا کیا ہے، خاص کر اس زمانے میں جب صاحب نے بھائی بہن کو مع ان کی والدہ کے یک طرفہ چھوڑ کر فنا کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے باوجود عطا محمد صاحب مروجہ تعلیم حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بی ایس [illegible] سیاسی کنبہ پروری نے انہیں میڈیکل سائنس میں جانے نہ دیا اسلئے وہ ویٹرنری سائنس میں [illegible] گریجویٹ ہوگئے وہ بھی پٹنہ میں۔ ریاست کی سیاسی جاگرتی میں ان کیلئے میڈیکل سائنس میں کوئی [illegible] اس کے باوجود کہ وہ دل رُبا احد صاحب کے بیٹے تھے۔ پھر وہ ملازم ہوگئے اور اب ویٹرنری سائنس کے انتظامیہ میں کام کر رہے ہیں۔

یہ نہیں کہ ہمیں ان کے عرفانی علم کا احساس نہیں۔ صاحب نے ان کا نام عطا محمد رکھا ہے اور یہ نام خالی از معنی نہیں ہوسکتا۔ پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد محمدیتؐ ان کی روح کے ساتھ جڑی رہی ہوگی کیونکہ جو چیز محمدؐ نے دے دی ہو، اس کا کیا کہنا۔ انسان آزاد کہاں کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علم عرفان کی بنیادی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیز تیز دوڑ رہے ہیں۔ جو لوگ عرفان کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہوں، وہ ان کے قریب جا کر اس کے قطعی ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ خود اس بارے میں خاموش ہیں کیونکہ جو بات سورج کی طرح عیاں ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت؟ طبعاً بھی وہ خاموش رہتے ہیں اور خاموش پسند اسلئے کہ ان کے دل میں جو واردات گذر رہے ہوں، وہ اسے بولنے کب دیتے ہوں گے۔ وہاں سننا زیادہ ہوتا ہے اور بولنا کم۔ وہاں احساسات کام کرتے ہیں اور باطنی ادراک۔

عطا محمد صاحب یوں تو صاحب کے ساتھ بہت کم بیٹھتے تھے مگر بیٹھتے تھے سب سے زیادہ۔ یہ ضروری نہیں کہ لوگ انہیں صاحب کے ساتھ بیٹھتے اور باتیں کرتے دیکھیں۔ روحانیت کا عالم ہی حیرت سے بھرا ہوا عالم ہے۔ اگر اس کے احوال سب لوگوں کو معلوم ہو جاتے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ یہاں صرف ان لوگوں کو چُنا جاتا ہے جو دریا دل ہوں اور خاموش رہنے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جب انسان کا پیالہ خوشی سے بھر آتا ہے تو اُچھلنے لگتا ہے جیسا کہ منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کا پیالہ اُچھل پڑا مگر اُچھلن میدانِ عرفان میں نقصاں

پہنچاتی ہے۔ لہٰذا لب بستگی ضروری ہے مگر ہے مشکل، بہت مشکل۔ عطا محمد صاحب جب کبھی باہر چلے جاتے تو صاحب کے دروازے پر سکنڈوں کیلئے کھڑا رہتے۔ دل ہی دل میں اجازت مانگی اور چل پڑے۔ صاحب بھی ایسے دیرینہ آزمودہ کار کہ سر نہیں اٹھاتے۔ مگر عطا محمد صاحب کو بے زبان بھی ضرور کہتے ''خدا کے حوالے''۔

میں نے عطا محمد صاحب کی ذات میں بہت اچھے خصائل پائے ہیں۔ وہ بڑے شریف النفس ہیں۔ جب کبھی کسی کا نام لیتے ہیں، مہذب زبان اور مٹھاس سے لیتے ہیں۔ بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں۔ ان کے اندر کافی گنجائش ہے لوگوں کی بات سننے کی اور باتیں جانچنے کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی تعلقات اور مجلس آرائی سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنی رائے کسی کے اوپر ٹھونستے نہیں اسلئے آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے کی قدر کرتے ہیں۔ مگر وہ جاہلوں پر بھی اپنی رائے مسلّط نہیں کرتے کیونکہ جاہل پتھر ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر پانی چھڑکنا یا نہ چھڑکنا ایک ہی بات ہے۔ نیز جاہل اپنی رائے بدلتے نہیں، شاید اس لئے کہ ان کی قساوتِ قلبی اُنہیں اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی رائے بدل ڈالیں۔ وہ سب لوگوں کے دکھ سکھ میں شامل ہوتے ہیں، وہ مرید ہوں یا دوست، پرائے ہوں یا اپنے، رشتہ دار ہوں یا بیگانے۔ جب کسی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو سب سے نچلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نام نہاد بڑے لوگوں کے ساتھ شانہ ملانا انہیں اچھا نہیں لگتا۔ لگتا ہے کہ اس عادت کو وہ بہت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ بحثوں میں الجھتے نہیں کیونکہ وہ منطقی نہیں اور نہ کھوکھلی باتوں میں دلچسپی لینے والے۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں حالانکہ ان کی صحت اتنی اچھی نہیں کہ وہ روزہ رکھیں۔ باپ کی طرح وہ کافی کپڑے پہنتے ہیں یعنی ان کی صفاتی زندگی ان کی ذاتی زندگی پر نظر پڑنے نہیں دیتی۔ صاحب کی طرح وہ گہرے بھی ہیں، ان سے واقف ہونا دشوار ہے اگرچہ ناممکن نہیں۔ عطا محمد اور مشتاق احمد دو نام اگر کھول دئے جائیں تو ان کی ذات پر تھوڑی نظر پڑ سکتی ہے۔ اب کوئی تعجب میں پڑ جائے یہ سن کر کہ صاحب بہت کپڑے پہنتے تھے۔ مگر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کپڑے حقیقت کو چھپاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جو احد صاحب کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو یعنی ان کی ذات کا شناسا ہو۔ وہ اسلئے کہ صاحب صاحبِ صفات تھے اور بہوت! اسی طرح عطا محمد صاحب بھی کھلے عام نہیں نکلتے اور نہ نکل سکتے ہیں، اسلئے کہ اس طرح نکلنا مناسب نہیں!

عطا محمد صاحب کو اپنے خاندان کی عظمت کا احساس ہے۔ شکر ہے کہ میں نے بھی اپنے طور پر اس بارے میں جو تحقیق کی ہے، وہ صحیح ہے۔ وہ ''پیر ہدایت اللہ صاحب جنہیں ہدہ صاحب کے نام سے لوگ یاد کرتے ہیں'' کو ''بزرگی اور کمالات کے باعث بہت عظیم شخصیت گردانتے ہیں''۔ اُنہیں فخر ہے کہ صاحب

کے اپنے ابتدائی ایام اس خاندان میں گذرے جس کے بارے میں سوپور کے لوگ ابھی فخر کے ساتھ چرچا کرتے ہیں۔اپنے نام دار والد صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے صاحب کو بہت صلاحیتوں سے نوازا تھا۔انکی شکل وصورت،ان کا قد،ان کا رنگ عش عش کراتا تھا۔ان کی آواز میں داوٗدی اثر تھا۔جب وہ قرآن پڑھتے یا اذان دیتے تو وقت کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی۔جلالی کیفیات سے ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی۔انسان کیا ہر جاندار اس سکوت سے متاثر ہو جاتا تھا۔آواز کے نرم سروں میں زیادہ جمال ہوتا تھا جو نغموں میں منتقل ہو جاتا تھا یہاں تک کہ چھوڑے بڑے سب لوگ جھومنے لگتے تھے۔ان کی آنکھوں میں خاص قسم کی سرخی ہوتی۔لگتا تھا کہ دو چمکتی ہوئی قندیلیں ہیں جن کی شعاعوں کی تاب نہیں لائی جا سکتی ہے اسلئے آنکھیں چار نہیں ہو سکتی تھیں۔جس خوش نصیب پر یہ شعاعیں پڑتیں اس کی کایا پلٹ جاتی تھی۔بازار سے گزرتے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور ان کے سروپا کا دبدبہ محسوس کیا جاتا۔پھر ایسے بھی جمالی لمحات آتے کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کندھوں پر چڑھنے سے رکتے نہیں۔جمال کے احساس کا یہ حال تھا کہ ابتدائی ایام میں ان کا بوٹ اس طرح چمکتا تھا کہ اس میں عکس دکھائی دیتے تھے،لباس کی تو بات ہی نہیں۔
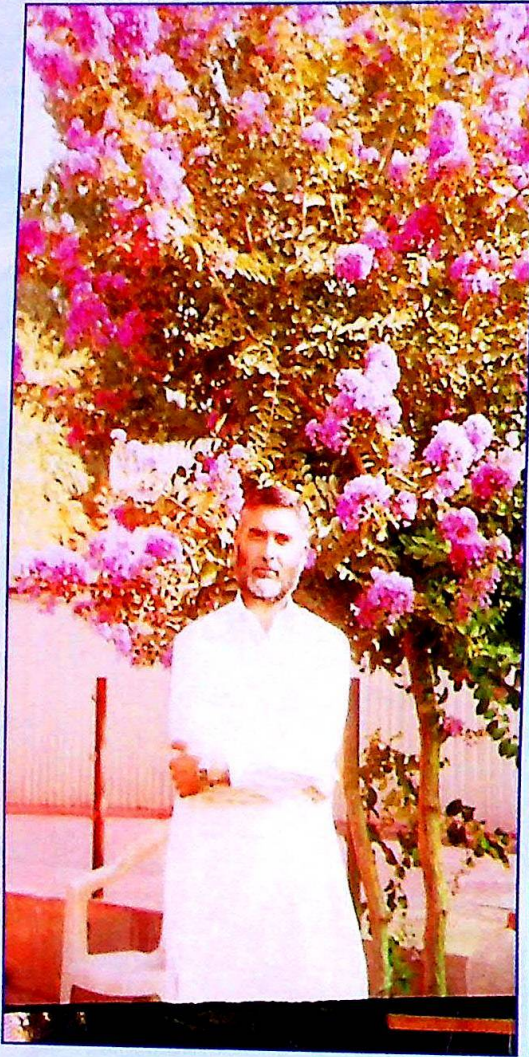
تیرے پھولوں کی مہکتی آبشاریں رنگ باز
واہ واہ رنگیں نظارہ نازنینوں کی نماز
مست مست انداز تیری کِھل کھلاہٹ کا شعور
تیری مسکانیں نکھرتی راگنیاں دِل نواز
پتہ پتہ ساز وسنطور، چنگ و رباب وتنبور
باد صبا میں بہاریں کھول کے زلفِ دراز
ڈالی ڈالی پر پھُدکتی بلبلوں کا ذوق وشوق
لاجرس ٹرومیا کے اندر غزل خواں احمد فراز
تتلیوں کا ناچ نازُک نازُک بھنوروں کا سرود
یا قرآن خواں شہد کی مکھیوں کا پھُرتیلا انداز
جنت الفردوس سے آئی ہوں میں مادام گل
باغ میں صاحب کے بیٹھی ہوں سندرتا پاکباز
شبنموں میں بیٹھ کر موتی پروتی ہے شفاؔ
گھورتی ہیں الکہف کی کھڑکیاں سوز و گداز

حبیبؔ

احد صاحب کی زندگی حرکت سے بھرپور تھی۔ اس میں جمود کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا۔ سوپور میں ہوں یا تجر شریف میں، آلوسہ بانڈی پورہ میں ہوں یا سید مہدی علی ختائی رحمتہ اللہ علیہ کے روضے میں ہوں، چھوٹی سی چوکی پر بیٹھے ہوں یا حمام کی کوٹھری میں، غنی پرنٹنگ پریس کی چارفٹ والی جگہ پر ہوں یا شمشان گھاٹ میں، نوپورہ کی ندی کے کنارے پر بیٹھے ہوں یا ایمبسیڈر گاڑی میں، جیل میں ہوں یا نور باغ کے مکان میں، ان کا ہر روز اور ہر پل نیا موڑ لے کے آتا تھا۔ لمحوں میں سماں بدل جاتا، ماحول میں نئی کیفیت پیدا ہو جاتی اور آنے والے پل کا قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی برداشت کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ واقعات اس طرح سہہ جاتے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ باہری تبدیلی ان کیلئے بے اثر

ہوتی تھی۔ ان کے اپنے معمول میں باہر کی کوئی قوت بدلاؤ نہیں لا سکتی۔ رات ہو یا دن، بارش ہو یا برف، دھوپ ہو یا چھاؤں، گھوڑا ہو یا گاڑی، پاؤں ٹھیک ہوں یا نہ ہوں، خاموشی ہو یا گن گرج، کھانا ملے یا نا ملے، روٹی کپڑا مکان ہو یا نہ ہو، وہ چلتے رہتے اور کام کرتے رہتے۔ لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ایک جیسا، چاہے کوئی امیر ہو یا غریب، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، مسلمان ہو یا غیر مسلم، سفید ہو یا کالا، رشتہ دار ہو یا پرایا، سب کے ساتھ اعلیٰ سلوک اور اعلیٰ ترین اس کے ساتھ جس نے خوب ٹھوکر کھائے ہوں، جو لوگوں کی نظروں میں ادنیٰ ترین ہو۔ کیا مجال کہ کوئی ان کی روش میں دست درازی کرے [illegible] وقت ان کے دربار سے باہر! کوئی بھی شخص ان کے پاس آتا اور اپنے غموں کا بوجھ ہلکا کرتا [illegible] اپنے انداز میں۔ یہاں کوئی پہرہ نہیں، پردہ نہیں۔ کوئی روتا، کوئی سسکیاں لیتا، کوئی درواز[illegible] کھڑکی پیٹتا، جس طرح چاہتا اپنی روئیداد سناتا۔ صاحب سبوں کو سمیٹ لیتے اور اگر [illegible] وقت کوئی بات گوارا نہ ہوتی تو ہمیں بھی اپنے انوکھے طریقے سے خبردار کرتے۔ صبر کے یہ سمندر ناقابل برداشت لوگوں کو جگہ دیتے اور اس طرح لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ جو لوگ پہلے کس[illegible] بیگانہ پن تصور کرتے، آخر کار حاضر ہو جاتے اور دوریاں کافور ہوتی محسوس کرتے!

صاحب روحانیت کے مجسمہ تھے۔ اُن کا ہر انداز اس کا عکاس تھا۔ ان کا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا، کھانا، پینا، سونا، باتیں کرنا، اسم اعظم پڑھنا، روحانیت سے پُر تھا۔ جب چلتے تو میلوں چلتے۔ اکثر بابا ریشی سے سوپور تک پیدل جاتے۔ پگڈنڈیوں سے بھی واقف تھے اور راستوں کی پہچان سے حیران کر دیتے تھے۔ باتیں کم کرتے مگر جب بولتے تو ان کا ایک ایک لفظ معانی کے باب کھولتا۔ سادہ زبان استعمال کرتے۔ کبھی کسی کے ساتھ مخاطب ہوتے مگر بات کرتے کسی اور کے ساتھ۔ ان کی یادداشت کمال کی تھی۔ مریدوں کے باپ دادا کا نام بھی بولتے اور سننے والے حیران ہو جاتے۔ کچھ مریدوں کو خاص نام سے پکارتے۔ مثلاً مظہ، سعیدہ، محبوب، عمہ، وغیرہ۔ مجھے صرف عطا محمد کے نام سے پکارتے۔ کچھ جگہوں کا نام لیتے جن کے ساتھ ان کا لگاؤ تھا۔ مثلاً کاوہ چک، سری پٹن، ڈنگی ووڑھ، وُسن، ٹنگہ مرگ، تجر شریف!"

عطا محمد صاحب کو اپنے بچپن کے ایام کے دکھ درد یاد ہیں اور ان کا گہرا احساس بھی ہے۔ وہ جب انہیں دہراتے ہیں، انسان کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ ان کو گلے لگا کر پیار کریں، ان کی والدہ،

نانی صاحبہ اور ہمشیرہ کی قبروں پر پھولوں کے انبار نچھاور کریں اور صاحب کی مجاہدانہ زندگی پر قصیدوں کے قصیدے لکھیں۔ اولاد کو ایک طرف چھوڑنا اور راہِ خدا اختیار کرنا یوں تو ایک معمولی واقع دکھائی دیتا ہے مگر جب انسان ایسی کوئی بات کرنے پر اُتر آتا ہے تب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے معانی کیا۔ عطا محمد صاحب جس ادب اور تمیز سے اپنی نانی کا نام لیتے ہیں اور اس کی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب کتنے شریف الاصل ہیں اور اصل النسل! ہم اُن مشکل لمحات کا درد محسوس کرتے ہوئے ان پاکیزہ روحوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے صعوبتیں برداشت کیں۔ عطا محمد صاحب کے نانا بھی اس میں شامل!

عطا محمد صاحب کی رفیقہ حیات اصلاً بانڈی پورہ کی رہنے والی ہیں۔ صاحب کے گھر کے ساتھ ان کے والدین کا رابطہ شادی سے پہلے بھی قائم تھا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بھی ایک دفعہ اپنی والدہ کے ساتھ صاحب کے پاس آئی تھیں۔ صاحب کے علم و دانش میں اجنبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ انہوں نے عطا محمد صاحب کی گھر والی خود ہی چنی تھی اور اُن کے سراپا کو جانچ لیا تھا۔ صاحب کے گھر کی مالکن بننا کوئی آسان کام نہیں اور مجھے لگتا ہے کہ دلشادہ صاحبہ کی ذات میں وہ سب گن ہیں جن سے وہ اپنے فرض منصب پر پوری اتر سکتی ہیں۔ صاحب کا گھر بڑا وسیع گھر ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ کائنات سے بھی بڑھ کر کائنات ہے۔ اس کائنات کا بوجھ اٹھانا ایک سعادت ہے جس کے سامنے دنیا کی کوئی چیز، کوئی عزت، کوئی حشمت وشوکت مطلب نہیں رکھتی۔ اُن کے گھر میں گھستے ہی میں نے دیکھا کہ عطا محمد صاحب اور ان کی گھر والی اپنے آرام اور اپنی آسائشیں لوگوں کے شور وغل اور آہ وبُکا کے سامنے قربان کر رہے ہیں، حتیٰ کہ رات کے وقت بھی صاحب کا دربار کھلا رکھتے ہوئے شب بیداری سے جی نہیں کتراتے ہیں۔ مجھ جیسا آدمی زیادہ سے زیادہ ایک رات کیلئے نیند قربان کر سکتا ہے، آرام و آسائش ترک کرنے کا امکان ہی نہیں۔

دلشادہ صاحبہ کا دل ہمدردی سے بھرا ہے۔ میں ان کی ہمدردیاں دیکھ کر حیران و ششدر ہو جاتا تھا۔ وہ بے کسوں اور دل جلوں کو خود کھلانے پلانے کی ذمہ داری سنبھالتی تھی۔ انسان کا ذہن ان کی ہمدردی اور شفقت دیکھ کر چکرا تا تھا۔ ان کا ایک اور وصف ہے دور اندیشی سے منصوبہ وار طریقے سے کام کرنا اور کام کرتے کرتے دنیا کے معاملات کا بھی لحاظ رکھنا۔ ان کی کامیابیاں دیکھ کر تحسین ومرحبا کے کلمات خود ہی دل سے نکلتے ہیں، زبان پر چڑھیں یا نہ۔

میں نے اپنی طرف سے ان کی روحانی کامیابیوں کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ایک دفعہ دفعتاً انہوں نے ایک سائلہ کو کہا "یہ دربار بہت بڑا دربار ہے"۔ وہ کلمہ وہبی تھا کسبی نہیں، اس میں آمد تھی آورد نہیں،

اصلیت تھی، بناوٹ نہیں۔ مگر انہیں معلوم ہو چکا تھا چھوٹی عمر میں بھی کہ دربار کیا ہے اور بڑا دربار کیا۔ یہاں تو لمبی لمبی سفید داڑھی والے کچھ لوگ مجھ جیسے ابھی بھی نہیں سمجھتے کہ بڑا دربار کیا ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں کیا! اتنا ہی نہیں وہ کبھی کبھی اپنے میاں کے ساتھ روحانی معاملات میں سرگوشیاں بھی کرتی رہتی تھیں اور مریدوں کے ماپنے کے پیمانے بھی ہاتھ میں لیتی تھیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ ایک دفعہ بے باک عقیدوں کے سلسلے میں میرا مقابلہ مرحوم عبدالرشید سرینگر کے ساتھ بھی کیا۔ انہیں اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے کہ روایتی عقیدوں میں کون الجھا ہے اور بے باک ایمانی پیش قدمیوں کی تڑپ کس کو۔ ۱۹۸۵ء میں میرے اوپر کچھ واردات گذر[illegible] تقریباً میرے سب متعلقین پریشان ہو گئے مگر میرا اتنا ہوش باقی تھا کہ میں ان کی مسکان دیکھ رہا تھا [illegible] میرے حال سے باطنی طور پر واقف تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں گر نہیں رہا ہوں، سنبھل رہا ہوں۔ [illegible] یہ کہ وہ صاحب کے ساتھ کھڑا ہونے اور ان کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی جرأت بھی کرتی تھیں۔ اور، یہ جرأت یونہی نہیں ہوتی، صاحب کی عنایت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اس وقت بھی وہ کافی جرأت کے ساتھ روحانی معاملات میں حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے کئی بار بیت اللہ کا طواف بھی کیا ہے اور اللہ اکبر کا درس پڑھا ہے اپنے میاں کے ساتھ ساتھ!

جب چاند کے [illegible] میں
تاروں کی ٹم ٹم چھپتی ہے
جب زُلفیں شب [illegible] کھُلتی [illegible]
اور نیند پریشان [illegible] ہے
جب خواب ادھورے رہتے ہیں
اور وقت کی دھڑکن رکتی ہے
شبنم کے جھلکتے ساغر میں
موتی کی ڈھلک سوجاتی ہے
جب شوخ بہاروں کی خواہش
دم گھُٹ گھُٹ کے مرجاتی ہے
جب آس کا دم بھی رکتا ہے
تب یاد تیری کیوں آتی ہے
لے ہاتھوں سے سوغاتِ گلاب
یہ نام شَفا کا لیتی ہے
حبیب

اب ہم شریفہ صاحبہ بنت احد کے بارے میں چند ایک جملے لکھنے کی سعادت خدا سے مانگیں گے۔ میں پہلے اُن سے شفہ اور پھر شفا کے نام سے مخاطب ہوتا تھا۔ دونوں ناموں میں مجھے بے حد مٹھاس محسوس ہوتی تھی اور اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس مٹھاس میں تقدّس ہے، عظمت ہے، علویت ہے تاریخی اعتبار سے معروف بی بیوں کی عظمت کا احساس ہے۔ یہ مٹھاس بارگاہ الٰہی میں سجدوں پر سجدے کرتے حاصل ہوتی ہے اور سلسبیلی اور زنجبیلی اثرات سے زیادہ تسکین واطمینان کے نغمات دل میں پیدا کرتی ہے۔ یہ نسائی عالم کے بے پناہ فیوض کا اعتراف کراتی ہے اور دردِ دل پیدا کرنے کیلئے خود بخود روح کی گہرائیوں سے اُچھلتی

ہے۔ایک زمانہ ہوا کہ وہ ہم سے روٹھ کے چلی گئیں مگر مجھے محسوس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ وہ چلی گئی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ وہ قدم قدم پر مجھے دعائیں دیتی رہتی ہیں اور مالک دو جہاں سے میری قلبی اور دائمی زندگی کی مسرتیں مانگ رہی ہیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے ساتھ باتیں کرتی ہیں اور میرے خیالوں کی نوک پلک درست کرتی رہتی ہیں تا کہ میں عرفانی دنیا کی خوب سے خوب لطافتوں کا مشاہدہ کرسکوں۔ یہ بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ میرا درد محسوس کرتی ہیں اور میری سلامتی کے لئے دربارالٰہی میں دعا مانگتی ہیں۔اسی شفا کے انتقال کی خبر مجھے دوسرے دن ملی تھی اور میں مبہوت رہ گیا تھا۔سوپور پہنچتے پہنچتے میرا دل بہت بھر آیا تھا اور میرے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل آئی تھیں۔ میں دفعتاً ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔میں نے صاحب کے پاس بیٹھ کر صرف تین دن میں ایک سو ایک اشعار شفا کی یاد میں لکھے تھے جو نہ جانے کس طرح جَن گئے تھے کیونکہ تب تک میں نے صرف چند ایک اشعار ہی لکھے تھے اور وہ بھی صاحب کے زیر اثر۔ان اشعار کی زبان اتنی صاف اور معانی اتنے گہرے ہیں کہ میں بھی سمجھتے سمجھتے انہیں سمجھ نہیں پاتا۔صاحب نے ان کے بارے میں انہی دنوں فرمایا تھا کہ یہ پتھر ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے، بھاری! فاروق اور اعجاز کے ذریعے میں نے دہلی میں یہ اشعار چار رنگوں میں گلدستے میں چھپوائے تھے مگر ان کے تجربے کی کمی سے وہ کتابچہ اتنا اچھا نہیں چھپا تھا جتنی میری آرزو تھی۔اس کے چند اشعار:

مہک اُٹھی ہے قبر روشن ہوئے ہیں بام و در	یا فرازِ طور سے نکلی ہے حوروں کی نظر
کوندتی ہیں بجلیوں سے تیغ ہائے تندرو	زخم دل سے پھوٹتی ہے زندگانی باوضو
ظلمت شب کی قسم باجے ہیں گھنگرو خوش لحن	تیز نازک سا بدن ان کا طریق پیرہن
گل بدامن جگنیاں جوشِ ہزاراں کام جو	یا چھنکتی دھوپ میں پھلکاریوں کی گفتگو
دھڑکنیں بے تاب سینوں میں درخشاں ہوگئیں	یا عروقِ جنت الماویٰ سحر خواں ہوگئیں

معصوم شفا نے اپنے معصوم بھائی کے ساتھ بہت دل سوز مراحل طے کئے ہیں۔ان کی درد بھری کہانی سے دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔عطا محمد صاحب کی زبانی کہانی کا ایک جز پڑھیے۔

''ہمارا بچپن بے سروسامانی میں گذرا۔نانی کے سوا ہمارا کوئی غمخوار نہ تھا۔میری عمر چودہ اور میری بہن کی گیارہ سال تھی۔8x30 فٹ والے کمرے کے اندر ہم اور ہماری نانی زندگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

میری ماں بستر علالت پر تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ ان کے جانے کے بعد ہمارا کیا حال ہوگا کیونکہ نانی صاحبہ کمزور ہونے کے باعث شاید ہمارا ساتھ اور زیادہ نہ دے پاتی۔ ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا جس کے سامنے سارے غم کا اظہار کرتے۔ اسلئے اپنی کہانی اپنے آپ کو سناتے۔ ہم بھائی بہن کا کیا حال ہوگا۔ ہمیں کون تھامے گا، کون راستہ دکھائے گا۔۔۔ خود ہی اپنے آپ کو تسلی بھی دیتے تھے۔ میری ماں کو میری تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں قرآن شریف پڑھ لیا اور اس کے معانی بھی سیکھنا شروع کیے۔" (خط کشید گی مصنف کا اضافہ ہے)

شفا زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکی، اسلئے وہ بھی اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہ ہو سکی۔ وہ صاحب [illegible] مریدوں کو کہاں شعور کہ وہ اس کا مطلب سمجھیں اور اس بنیاد پر اپنے فرائض محسوس کریں۔ دنیا [illegible] ہے، اسے پالن ہار اور پالن ہار کے لاڈلوں کی کیا فکر! بہر حال شرافت اور حیا کی مورت بے پناہ صبر و استقلال سے آخری دم تک زمانے کے ستم سہتی رہی۔ میں نے اپنی کتاب اللہ اکبر میں بای ذنب قتلت کا ایک باب شامل کیا ہے۔ میرے تحت الشعور میں شفا کام کر رہی تھی جب میں یہ باب لکھ رہا تھا۔ پولیس سٹیشن [illegible] ساختہ محتسبوں کی دنیا میں اور اور لکھنا دشوار۔ مرتا کیا نہ کرتا!

شفا صاحبہ خورد سال تو تھی مگر اپنے ابا جان احد صاحب کے نزدیک بیٹھتی تھیں اور سینہ بسینہ احوال عرفان سے اپنی دنیا و آخرت کو آباد کرتی تھیں۔ تقاضۂ عمر سہی، صاحب اپنی صاجزادی کی تربیت نہ کریں تو کس کی کریں۔ ان کی جسمانی اور بیانی زبان سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں صاحب کے ساتھ روابط ہیں اور انہیں اس کا اچھی طرح سے احساس تھا کہ ان روابط کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ گُل گُور اور ریش مام جیسے جانثاروں کی شفقت اور مہربانی کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ ان کے مزاج میں کافی گہرائی تھی اور وہ بولتی بھی بہت کم تھیں۔ ہر رنگ انہیں پسند تھا اور وہ بھی گہرا گہرا۔ مجھے سورۂ الرحمٰن کا مدھامتان یاد آتا تھا شفا کی ان خصوصیات میں۔ میں صاحب کی کامرانیاں مشاہدہ کرتا تھا مگر ساتھ ساتھ وما توفیقی الا باللہ پڑھتا تھا۔ مگر مجھے ان کے معدے کی کمزوری دیکھ کر ان کی والدہ یاد آتی تھیں کہ کہیں یہ بھی معدے کی کمزوری کا شکار نہ ہو جائیں۔ آخر ہوا بھی ایسا۔ خدا اگر کوئی مخلوق ہوتا تو میں اسے بے رحم کہتا مگر وہ ہے کہ جو چاہے کرے، چاہے ہمیں سمجھ میں آئے یا نا!

احد صاحب کے دربار میں میری رسائی کا سب سے اہم وسیلہ یہی شفا ہے۔ انہوں نے قریباً چالیس کلومیٹر کی دوری سے ایک اجنبی کو گھر سے اکھاڑ کر صاحب کے قدموں پر پھینک دیا۔ مجھے صاحب کے انداز

کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں اور میں غور وفکر کے مرحلے سے نکل نہیں پاتا تھا کہ جاؤں یا نہ۔ اور وہ میرے گھر آگئیں اور جاتے وقت سوپور آنے کی دعوت دی۔ وہ لفظ میرے دل کے کان ہمہ وقت سنتے رہتے ہیں۔ اس دعوت میں گو کہ اصلی ہاتھ صاحب کا تھا مگر وسیلہ اگر بنی تو یہی شفا! میری بوٹی بوٹی ہر وقت اسے سلام بھیجتی رہتی ہے اور کہتی رہتی ہے کہ مسافر ابھی سفر کے مرحلے کاٹ ہی رہا ہے۔ میری زندگی میں ان جیسی کوئی پیاری نہیں۔ دو لفظ ہیں جو میری جان بن گئے ہیں۔ شفا اور وفا۔ دراصل یہ لفظ نہیں بلکہ موضوعات ہیں۔ زندگی بھر ان پر ثابت قدم رہنے کا ارادہ ہے۔ خدا کرے کہ ثابت قدمی برقرار رہے۔ میرے کلبے کی جبیں پر دو حصوں پر مشتمل ایک جملہ نہایت ہی مہین قلم سے لکھا ہوا ہے۔ ''شفا در دنیا، وفا در آخرت''
جس کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنے لمحات گذار رہا ہوں۔ اگر میں نے صاحب کے دست نازنین پر بیعت نہ کی ہوتی تو شفا کے ہاتھ پر ضرور کی ہوتی!

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

ارم مشتاق اور گلریز مشتاق، ایک باغ دو گلاب، رنگ اپنا اپنا، ڈھنگ اپنا اپنا۔ جب میں آیا ماریا شیر خوار تھی اور کالے انگور کھانے والا گل ریز آنے والا تھا۔ ارم قریباً دو سال کی تھی کہ میرے ساتھ میرے گھر آئی اور آتے ہی میرے برآمدے پر جمع جوتوں کو نیچے پھینکتی گئی۔ میں جمع کرتا تھا، وہ پھر پھینکتی تھی۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ بچپنا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے سبق پڑھا رہی تھی جو اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس سے ہر
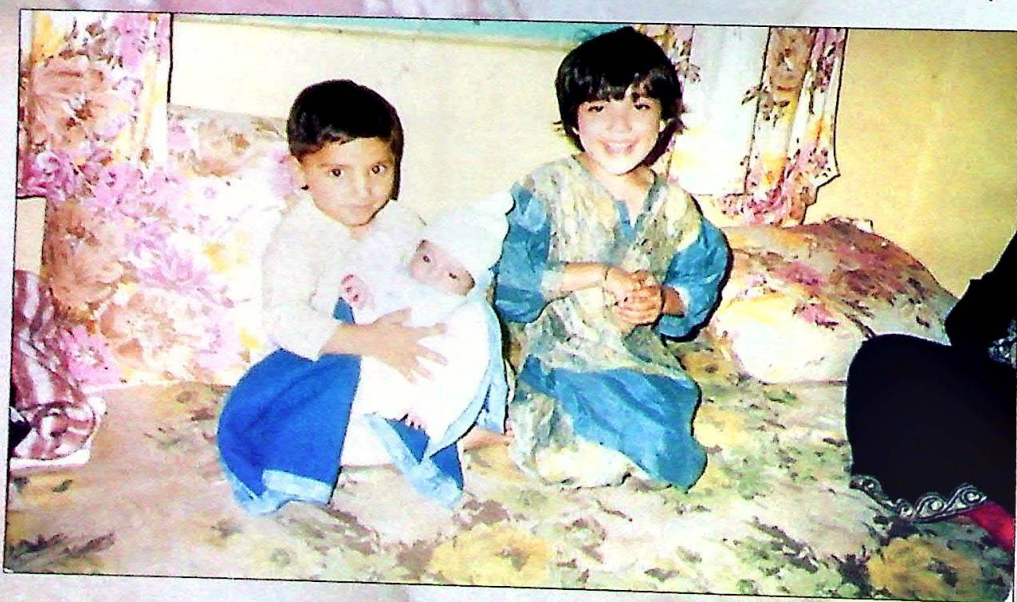
بالغ آدمی کی آنکھیں کھلنی چاہیں۔ کسی وقت ایک شیر خوار بچہ بھی ایسا سبق پڑھاتا ہے کسی عمر رسیدہ انسان کو کہ زندگی بھر یاد کر لیتا ہے۔ خدا نے جس کی آنکھ کھولی تو کھولی۔ اس میں بڑے چھوٹوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ شیخ حمزہ مخدومی محبوبی رحمتہ اللہ علیہ بھی صوفی اللہ داد کو اس وقت سے ہی پڑھاتے تھے، جب وہ پنگوڑے میں تھے۔ رہا سوال گل ریز مشتاق کا، گل نام تو صاحب نے ہی دیا ہے اس کو، جیسے صاحب گلاب کہیں اس کا کیا کہنا۔ یوں تو گل ریز کے اطوار بچپن سے ہی قلندرانہ ہیں۔ وہ بڑا خوددار غیور لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔ اس کے چلنے کے انداز میں سربلندی دیکھئے تو! ارم مشتاق بہت محنتی اور ذود فہم بیٹی ہیں۔ بچپن سے ہی

کتابوں کی طرف لگی رہیں۔ خود ہی سمجھتی ہیں کہ جب تک کوئی سبق اچھی طرح سے ذہن میں بیٹھ نہ جائے، اٹھنا نہیں ہے۔ میڈیکل ایجوکیشن میں جانے سے پہلے وہ صاحب کو انتہائی دخترانہ معصومیت سے کھانا کھلاتی۔ دیکھنے والا اگر حساس ہوتا تو وہ آنکھوں میں دل کی گہرائیاں محسوس کرتا جن سے بیٹیاں اپنے باپ دادا کو دیکھتی ہیں اور کھلاتی ہیں۔ دو دلوں کے بندھن بھی دکھائی دیتے اور بے زبانی کے باوجود باتیں بھی سنائی دیتیں۔ ایسے بھی تعلقات ہوتے ہیں دنیا میں جن میں غرض نہیں، مطلب نہیں، مجبوری نہیں، زور زبردستی نہیں، جن میں بس ایک چیز چھائی ہوئی ہوتی ہے۔۔۔ محبت! صاحب اور ارم کے درمیان گہری محبت کی شاداب بہاریں نظر آتی تھیں۔ میں بیٹیوں کے نرم و نازک دل پر رحمتوں کے نزول کی دعا کرتا ہوں، اس وقت خصوصاً! اس وقت ارم خدا کے حوالے دور کہیں جنوبی ہندوستان میں میڈیکل ایجوکیشن کے آخری مراحل طے کر رہی

ہیں اور وہ جلد ہی انشاء اللہ ڈاکٹر بن کے آرہی ہیں۔ صاحب کی اولاد کیلئے نیا کشمیر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسلئے انہیں مادرِ کشمیر سے دور سفر کرنا پڑا! گلریز مشتاق بھی اس وقت یونائیٹڈ کنگڈم یا برطانیہ میں تعلیم حاصل کرر ہا ہے۔ کوئی وظیفہ نہیں، کسی کی مدد نہیں، بس باپ کی کمائی پر سات سمندر پار تعلیم حاصل کرر ہا ہے۔ صاحب کے وصال پر کشمیر میں ہی تھا اور ان کے رسومات تجہیز و تکفین میں شامل تھا۔ پھر برطانیہ چلا گیا، جس دن صاحب کے آنگن میں دستی بم پھینکا گیا، میں اور گل ریز مشتاق زیادہ سے زیادہ آٹھ دس فٹ صاحب سے دور بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کرر ہے تھے۔ اگر اچانک صاحب ہم دونوں کو ڈانٹتے نہیں، ہماری بوٹیاں اڑ گئی ہوتیں۔ اس تصویر میں جہاں عطا محمد صاحب کھڑے ہیں، بالکل وہاں ہی صاحب لیٹے ہوئے تھے اور بم اس جگہ سے قریباً دس فٹ دور پھٹ گیا تھا۔ وہاں تصویر میں زینیا کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔
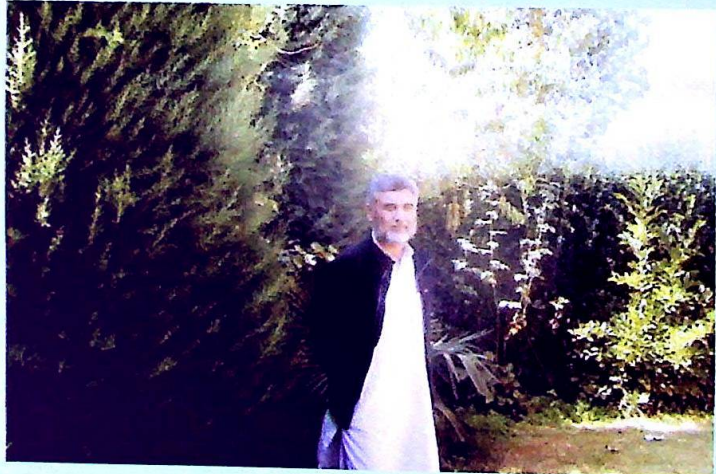
رخصت اے بزمِ جہاں

زندگی رواں ، دواں اور جاوداں حقیقت کا نام ہے۔اسے وقت کے اُلٹ پھیر سے ماپا نہیں جاسکتا۔اس کی قوت بہت زیادہ، بہت شدید، اتنی کہ کوئی طاقت اسے برباد نہیں کرسکتی اور نہ فنا کرسکتی ہے۔ اگر ہم یوں بھی کہیں کہ یہ خود قوت کا سرچشمہ ہے، قطعی قوت کا، تو نہ مبالغہ ہوگا اور نہ محض خیال۔اس نے اپنے اوپر ایسا خول چڑھایا ہے یا ایسا لباس پہن لیا ہے کہ یہ رنگا رنگ بن گئی ہے اور الگ الگ اَن گنت پیکروں میں دکھائی دیتی ہے مگر اسکے پیکر جتنے رنگ بدلاتے ہیں اتنے ہی اس کے خول، اس کے لباس۔ اگر یہ حقیقت ہے......اور یہ قطعی حقیقت ہے......تو پھر موت کسے کہتے ہیں؟ موت تو اس بدلتے ہوئے رنگ، بدلتے ہوئے مزاج کو ہی کہتے ہیں۔ پس موت ایک پہچان ہے، ایک اصطلاح ہے جو ہمیں مقامات، منازل اور ادوار کا پتہ دیتی ہے مگر خود کوئی قطعی حقیقت نہیں۔ یہ ایک سہولیت ہے، مناسبت ہے اور موزونیت جو ہمیں ہیجان سے بچالیتی ہے، ذہنی فتور سے نجات دلاتی ہے، اور ہماری سوچ کو ایک خط مستقیم پر لگاسکتی ہے۔ یہ ہماری مدد کرتی ہے اللہ تعالیٰ پر مستحکم ایمان رکھنے کیلئے، اللہ تعالیٰ جس نے حکیموں، دانشوروں اور صاحب دلوں کے علاوہ آسمانی کتابوں کے ذریعے واضح کر کے دیا کہ کوئی چیز مرتی نہیں اور نہ کوئی چیز جنم لیتی ہے۔ آیات الٰہی اس کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ بارش بادلوں سے برستی ہے، بادل سخت گرمی سے، پانی گرم ہونے سے بنتے ہیں، بھاری ہوجاتے ہیں اور پھر پانی بن جاتے ہیں۔ پانی یخ بھی بنتا ہے یا برف یا ژالہ یا اولا

اگر حرارت گر جائے اور منفی ڈگری پر پہنچ جائے۔ اسی طرح بیج زمین پر گرتا ہے، مٹی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد کلّے کی صورت میں زمین سے سر نکالتا ہے اور آہستہ آہستہ پودا بن جاتا ہے یا درخت۔ ایک دن اس سے پھول نکل آتے ہیں جو آہستہ آہستہ میووں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ میووں میں وہی بیج پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ پھر زمین میں گر جاتے ہیں یا بوئے جاتے ہیں۔ یہ سیدھی سادھی مثالیں ہیں مگر ہیں سب کے سب الٰہی آیات۔ ہم پیچیدہ یا مرکّب آیات کی مثالیں بھی دے سکتے ہیں جن سے پتہ چل سکتا ہے کہ کوئی چیز نہ جنم لیتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور یہ بدلاؤ ہی زندگی ہے، دائم اور رواں دواں۔ اس حرکت [illegible] اس بدلاؤ سے زندگی صرف آگے بڑھتی ہے۔ ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے اور کبھی واپس نہیں جاتی۔ جوانی بچپنے اور بڑھاپا جوانی میں واپس نہیں جاتا اور نہ دوپہر صبح بن جاتا ہے یا صبح نصف رات۔ نظام خداوندی جسے آپ رحمت کہیے، ربوبیت کہئے، ہمیشہ زندگی آگے بڑھانے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کام کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے سمجھایا کہ مردہ کیسے زندہ ہوتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے چار جگہوں پر جانوروں کے اعضاء رکھے اور وہ پھر وہی پہلی صورت اختیار کر گئے۔ اگر ہم پھر بھی نا سمجھیں تو قصور ہمارا ہوگا۔

> اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے [illegible] مردوں کو کیسے زندہ کریگا؟ اللہ [illegible] نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا: کیوں [illegible] میں تو قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: پھر تو چار پرندے لاکر انہیں اپنے ساتھ مانوس کر [illegible] ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو بلا، وہ میرے پاس دوڑے چلے آئیں گے اور جان لے کہ بے شک اللہ غالب، خوب حکمت والا ہے۔ ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی سی ہے جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کیلئے چاہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔
>
> القرآن: 2:260-61

اب فکر کی ایک اور کھڑکی کھول دیں اور دیکھیں کہ انسان کی اصل کیا ہے۔ میں نے قرآن مجید میں پڑھا ہے کہ انسان دراصل خدا کی اپنی روح ہے کیونکہ خدا نے ہی انسان کے ڈھانچے میں اپنی روح کا پیوند لگا دیا۔ انسان جتنا آگے بڑھتا ہے، اتنا ہی اس کی روح مضبوط ہوتی ہے، کھِلتی ہے اور کھُلتی بھی ہے۔ بشرطیکہ انسان شعوری طور پر خدا کے ساتھ ساتھ رہے، یعنی تقویٰ کرے۔ انسانی روح میں بنیادی طور پر سب کچھ موجود ہے۔ اس کا ختم ہو جانا، مٹ جانا یا تباہ ہو جانا بعید از امکان۔ جس طرح یہ سارا جہاں اللہ کی عادت ہے جو

خوگرِ پرواز کو پرواز میں کچھ ڈر نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
اقبالؔ

لحظہ لحظہ بدلتی رہتی ہے اسی طرح انسان کی عادت بھی بدلتی رہتی ہے مگر عادت بدلنے سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ اب ایک بات سامنے لائیے۔ اللہ تعالیٰ نے روح محمدؐ سب سے پہلے بنائی۔ پھر اسی روح سے لوح، قلم، عرش، کرسی اور ساری کائنات بنائی۔ انسان بھی روحِ محمدؐ سے بنا۔ کیا روحِ محمدؐ (خاکم بدہن) تباہ ہوسکتی ہے؟ بالکل نہیں ہوسکتی۔ خدا ایسے فاسد خیال سے محفوظ رکھے۔ یہ تو عام انسانوں کے بارے میں حقائق ہیں۔ صاحب عام انسان تو نہیں۔ ان کا مقام اعلیٰ وارفع۔ انہیں موت مٹا سکتی ہے؟ انہیں بربادی کا ڈر ہوسکتا ہے؟ نعوذ باللہ! تو پھر؟

یہ اپنی جگہ پر بالکل سہی مگر ہم ذرا عادت کی بات کریں۔ بہت عرصے سے صاحب تھکے ماندے لگتے تھے۔ ان کے جسم کے سارے اعضاء ذیابیطس کی وجہ سے پک گئے تھے، تھک گئے تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ وہ جس طرح صحن میں بیٹھتے، باغ میں بیٹھتے، ادھر اُدھر گھومتے، صحن سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھتے اور علاقے کا چکر لگاتے، وہ تو اب ناممکن ہوگیا تھا۔ عطا محمد صاحب کے اصرار پر کھانا بھی انہیں ایسا ملتا تھا جیسا ذیابیطس کے مریضوں کو ملتا ہے۔ اسلئے وہ کمزور ہوگئے تھے۔ نہ اس طرح گرجتے تھے جس طرح ان کا معمول تھا اور نہ کسی کے اوپر برستے تھے۔ زیادہ دیر کیلئے بستر پر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کیلئے کمرے میں ہی

چوکی بنائی گئی تھی۔ اس پر بھی لوگ بیٹھتے تھے اور ان کو چھوتے تھے۔ ان کے اوپر دباؤ کم کرنے کیلئے باضابطہ پولیس والے بھی آگئے تھے۔ جو لوگوں کو چھوٹے چھوٹے

جتھوں میں اندر بھیجتے تھے اور اندر کمرے میں بھی رحیم کاک جیسے مددگار لگائے گئے تھے جو لوگوں کو جلدی جلدی کمرے سے نکلنے کی تلقین کرتے تھے۔ لوگ صاحب کی صحت کا حال دیکھ کر پریشان ہوتے تھے مگر وہ بیٹھتے رہتے تھے اور اپنے کام درست کرانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ صاحب ان کی طرف پوری توجہ دیتے تھے مگر اس طرح ان کے جسم پر، ان کے ذہن پر زیادہ دباؤ بڑھتا تھا۔ صحت عامہ کے نظریے سے دیکھا جائے تو اس دباؤ سے ان کا بلڈ پریشر بڑھتا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ تھکاوٹ محسوس کرتے تھے۔ پھر بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ آخری ایام میں لوگوں کے ساتھ ان کی توجہ کم ہوگئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ توجہ د[illegible] گ[illegible] تھے اور فریادیوں کی طرف گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ نظروں سے بہت ساری باتوں کا پتہ چلتا تھا۔ اگ[illegible] سے نقاب اٹھانا ممکن ہوتا تو بہت کچھ معلوم ہوسکتا۔ یوں بھی ان کے خادم، ان کے مرید اور چاہنے [illegible] پ بان دیتے تھے مگر آخری ایام میں والہانہ خدمت کرنے کی سعادت پٹن کے سجّاد، غلام حسن، سوپور کے یعقوب، حمید اور غلام محمد وکیل اور براٹھ کے وزیر کاک کو حاصل ہوگئی تھی۔ پتھر پھینکنے والوں نے حبیب ک[illegible] اپنے بڑھاپے کے ایام میں کم سے کم ان کے نازنین پاؤں کو چومتا رہتا کہ جو زخموں سے گلستان کی طرح کھل گ[illegible] تھے۔ ان خدّام پر کس دل والے کو رشک نہیں ہوگا اور پتھر پھینکنے والے کا زخم کس کے دل پر نہ لگا ہوگا! [illegible] کمرے میں جاتے، چائے اور لواس ان کے سامنے رکھتے، ان کے کمبل بدلاتے اور احتیاط سے ان کے پاؤں، ان کی ٹانگیں دباتے۔ اب تو ان کا خورد و نوش کافی کم ہوگیا تھا، کہاں وہ زمانہ جب وہ دو دو تین تین چائے کے چھوٹے چھوٹے سماوار دن رات پیتے رہتے اور کہاں یہ دن جب وہ لواس ہاتھ میں اٹھاتے اور اس کا درمیانی حصہ انگلیوں میں نچواتے، نچوا نچوا کر نقطے جیسے اس کے ٹکڑے منہ میں ڈالتے۔ ان کا مُوڑ [illegible] پر چھریاں چلتیں۔ ان کے نقش سینے سے لگائے بیٹھا ہوں اور اپنی تنہائیوں میں انہیں یاد کرتا ہوں، ان بہت ہی جلیل وجمیل اور مشفق دل ربا کو! انہوں نے زندگی بھر پرہیزی کھانا نہیں کھایا، جو ملتا وہ کھاتے، مرچ، مصالحہ، چٹنی، چربی سے بھرا گوشت، مرغے، مکّا کی روٹیاں، سب کچھ مگر وہ کبھی کبھی کچھ کھاتے بھی نہیں۔ لگتا کہ انہوں نے روزہ رکھا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے کھاتے تھے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگاتے تھے۔ لوگوں کیلئے اپنے برتن میں کافی کھانا چھوڑ دیتے۔ لوگ ان کا چھوڑا ہوا کھانا شوق اور تمنا سے کھاتے۔ میں بھی کھاتا تھا اور کبھی اتنا زیادہ جتنا دوپہر کا کھانا۔ جب ان کا اشارہ ہوتا تب پھولے نہ سماتا تھا۔ میں نے ان کے اشارے سے سڑے ہوئے انگور، کیلے اور سنگترے بھی کھائے ہیں اور بہت خوشی سے، دلچسپی سے۔ ان کے ہاتھوں سے زہر بھی ملتا وہ بھی کھاتا، اسلئے کہ ان کے ہاتھوں میں زہر تریاک بن جاتا ہے۔

ماریا تیجا کا ایک دن فون آیا، میں چونک گیا۔ کہا کہ صاحب شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کردیئے گئے ہیں۔ میں جان گیا کہ صاحب جارہے ہوں گے۔ میں فوراً ہسپتال پہنچا تو مایوسی ہوئی۔ صاحب کی صحت بہت گر گئی تھی۔ عطا محمد صاحب، ان کی گھر والی اور گلریز اپنے فدوی مریدوں کے ساتھ صاحب کی دیکھ بال کررہے تھے۔ طارق ککرو بھی موجود تھا۔ غلام حسن، یعقوب وغیرہ غم سے دب گئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں میرا دل سخت کیوں ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں کسی بھی طرح صاحب کو ہسپتال میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے صبر سے خاص کمرے میں، خالی پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی لیٹتے، کبھی کروٹیں بدلتے، کبھی اٹھ بیٹھتے مگر اکثر لیٹے رہتے۔ یہاں بھی لوگوں نے جمع ہونا شروع کیا تھا۔ جوق درجوق لوگ آتے اور ہسپتال سٹاف کے زبردست اصرار پر رخصت ہوجاتے، مگر ہسپتال کے باہر جتھوں میں بیٹھ جاتے۔ کچھ لوگ علی الصباح پو پھٹنے کے ساتھ ہی پہنچ جاتے۔ سبھوں کے دلوں پر صاحب کی علالت کا بوجھ پڑا تھا۔ کبھی کبھی ہسپتال کے لوگ صاحب کے مریدوں کو ڈانٹ بھی سناتے مگر اس سے لوگوں کے جمع ہونے پر کچھ خاص اثر نہیں پڑتا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر زبردست کوششیں کرتے مگر وہ الٰہی منصوبوں کے سامنے بے بس دکھائی دیتے تھے۔ کچھ اور ڈاکٹر صاحب کے مرید ہیں، ان کی علالت دیکھ کر مایوس سے لگتے تھے۔ ادھر شہر اور دیہات میں حالات خراب ہو گئے تھے۔ پولیس اور لوگوں کے درمیان زبردست جھڑپیں ہورہی تھیں اور مار دھاڑ ہورہی تھی۔ کچھ معصوم جانیں ضائع ہوگئی تھیں۔ آخر کار ان ہی حالات کے بیچوں بیچ 26 جولائی 2010 رات نو بج کر تیرہ منٹ پر ہمارے صاحب کی روح مبارک پرواز کر گئی۔ اس وقت صاحب بالکل ہشاش بشاش تھے اور مکمل طور پر کامیاب زندگی گذار کر جبروت کے ساتھ پرواز کررہے تھے۔ ان کے سرہانے کے ساتھ ان کے فرزند عطا محمد صاحب کھڑے تھے اور بالکل خاموش! اناللہ وانا الیہ راجعون!

اور اس کے بعد سوپور کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ سب لوگ جو انسٹی ٹیوٹ میں حاضر تھے، صاحب کی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، پہلے آہستہ آہستہ چل رہے تھے کیونکہ شہر کی سڑکوں سے گذرنا تھا، پھر تیز تیز جب کارواں شاہراہ پر پہنچا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اوپر تارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور چودھویں شعبان المعظم کا چاند گُم سُم شب برات کے ساتھ ساتھ صاحب کا انتظار کررہا تھا۔ تاروں کی لگاتار ٹمٹماہٹ سے عالم ارواح کی جنبشوں کا حال معلوم ہورہا تھا اور چاند کی خاموش سنجیدگی سے دل کے سکون، ہم آہنگ اعتدال کا اندازہ ہورہا تھا۔ زمین پر خاک ساران احد وقت کا تقاضا پورا کررہے تھے اور آسمان پر عالم غیب کے احوال پُرشکوہ خوش آمدید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ دو عالموں کو ملانے والی طاقتیں وحدتِ حیات کے لوازمات

راستے روشن ہوئے گو رات نے اوڑھا نقاب
سُورہ سُورہ خاک بھی پڑھنے لگی کھلی کتاب
کالی زلفیں کھُل گئیں شب زندہ نورانی نظر
آب گینوں میں جھلک اٹھے منوّر تاجور
دوڑتا تھا قافلہ جنبان ساری کائنات
ساری قندیلیں تھیں روشن سجدہ کرتے تھے ذرات
بستہ لب حیران ثریّا، ماہ، انجم، آفتاب
لی مع اللہ کی فضا میں اڑتے تھے عالی جناب
جوش میں حوروں کے جذبِ محوِ ثنا قدسیاں
صلِّ علیٰ پڑھتے تھے جنّ و پری آتشِ بیاں
والضحیٰ پڑھ پڑھ کر وعدے یاد کرتی تھی وفا
الم نشرح جوش سے سینے کی گرمی باخدا
جلوہ گر تھا عالمِ عرفان میں نور مصطفےٰؐ
سبز نوارانی فضا میں اڑتی تھی روحِ شفا
حبیبؔ

انجام دے رہی تھیں۔ زمین پر بھی انتظار کی گھڑیاں کم ہوتی جارہی تھیں اور فلک کا بھی ایسا ہی عالم تھا۔ یہاں بظاہر فراق کی گھڑیاں نزدیک آرہی تھیں اور وہاں بظاہر وصال کی مگر صاحب تھے کہ فراق و وصال کے عالم کے اوپر پرواز کررہے تھے کیونکہ پرواز ہی زندگی ہے۔ یہ ہورہا تھا کہ رات کے قریباً [illegible] بجے اور سوپور کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ سارا سماں آہ و بکا و نالہ فریاد سے گونج اٹھا۔ دختران مادر ایام کو بھی رات کی خاموشیوں کا پردہ چاک کرنا تھا اور وہ چاک ہوگیا۔ اتنے میں ننھا منا ایک شخص اپنی بچھڑی ہوئی زندگی پر رو رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خون کے جھرنے بہتے ہوئے دیکھے۔ میرے جھرنے بھی اسی کے جھرنوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے کیونکہ میرا دل سخت ہوگیا تھا۔ اس شخص کو میں منا کہہ کے پکارتا ہوں مگر اس کا نام ہے پیر غلام نبی، صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے والا ساتھی! ننھا منھا اسلئے کہ بے چارا معصوم ہے اسلئے مخلص! میں نے دل ہی دل میں اسے کہا "رومت! فائدہ؟"

صاحب کا پُروقار جسد پاک خاص و عام کے دیدار کیلئے پلنگ پر رکھا گیا اور رات کے وقت ہی لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ رات بھر گھر کے در و دیوار اپنی

یادیں سمیٹتے رہے اور نورہ دیدی جیسی خواتین کی طرح دل ہی دل میں آنسو بہاتے رہے مگر صبح ہوتے ہی شور وغل بڑھ گیا اور آہ وزاری، لوگوں کا اژدھام جمع ہوگیا، پولیس بھی کافی تعداد میں آگئی اور مرد وزن کی قطاریں بندھ جانے لگیں۔ عورتوں نے صاحب کے صحن کے باہر دیوار کے پاس ایک نہایت ہی رقت آمیز مجلس سجائی اور وہ کھڑے کھڑے زور زور سے تاثیر سے بھری آواز میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھتی گئیں، پڑھتی گئیں۔ پڑھتے پڑھتے ان کے دلوں میں وہ ساری واردات گذر رہی تھیں جو صاحب کے دربار میں آتے جاتے ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ان کی آوازوں کا درد صاحب کی شفقت و ہمدردی کا غماز تھا، وہ

شفقت سے بھری ہمدردی جو انہوں نے ساری عمر عورتوں کے ساتھ روا رکھی۔ ان کا ترنّم ان کے دلوں کی زخمیں دکھا رہا تھا جن پر احد بب کا کام تھا مرہم لگانا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ صاحب ہم آپ کے ساتھ ہیں اور آپ ہمارے ساتھ۔ ہم آپ کو کبھی بھولیں گے نہیں کیونکہ آپ نہیں بھولیں گے ہمیں۔ ہمارے بندھن دربارِ الٰہی میں بندھے ہوئے بندھن ہیں، زمانے کی کوئی روش، زمانے کا کوئی ستم انہیں توڑ نہیں سکتا۔ ان کی مجلس آرائی حیات جاودانی کیلئے جڑ پکڑ رہی تھی اور صاحب بالکل سن رہے تھے، دیکھ رہے تھے!

صاحب کی نواسی ارم مشتاق ہندوستان کے جنوب میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ دادا احد بب کی رحلت کی خبر سن کر وہ وہاں سے چل نکلی تھی۔ گو کہ ہوائی سفر کر رہی تھی، پھر بھی وہ ابھی گھر نہیں پہنچی تھی۔ سارے لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر وہ بھی قریباً تین بجے بعدِ دوپہر سوپور پہنچ گئی۔ اس کے آتے ہی صاحب کی رسومِ تجہیز و تکفین شروع ہوئیں۔

صاحب کا جنازہ نور باغ سے تقریباً دو ڈھائی کلو میٹر دور نو پورہ کی عیدگاہ میں پڑھا جانا تھا۔ لوگوں کا سمندر جنازہ گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ چلنا دشوار تھا اسلئے سب لوگ دھیرے دھیرے جا رہے تھے اور لا الٰہ الا اللہ پڑھتے جا رہے تھے۔ اجتماعی آواز اتنی گھمبیر تھی کہ انسان کا دل دہل رہا تھا مگر سچ مچ روح نہ جانے کہاں پرواز کر رہی تھی۔ ایک طرف سکتے کا عالم تھا دوسری طرف صاحب کا جلال و جمال آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک

طرف ان کا مجاہدہ لوٹ لوٹ کے آرہا تھا اور آنسو بہانے پر مجبور کررہا تھا تو دوسری طرف عوام النّاس کیلئے ان کا تخلیقی کام سبحان اللہ زور زور سے پڑھنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ کشمکشِ باطن سے انسان گویا بے حسی کے عالم میں اس مردِ کامل کا جنازہ پڑھنے کیلئے جارہا تھا جس نے نہ جانے کتنے لوگوں کا جنازہ پڑھ پڑھ کر انہیں حیاتِ جاودانی سے نوازا تھا۔ حقیقت اور لوازمات کے درمیان کھچاؤ کے بیچوں بیچ آخرکار جنازہ گاہ کا سماں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ ہر طرف اللہ اکبر کی گونج، ہر طرف کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی صدا، رحمتوں کا نزول اور اسی ماحول میں صاحب کا تابوت جو ایک کھلی گاڑی میں رکھا گیا تھا اور جس گاڑی میں صاحب کے فرزند اپنے جانثاروں کے ہمراہ کھڑے تھے، جنازہ گاہ میں داخل ہوا۔ لوگوں کا جم غفیر گاڑی کے ارد گرد جمع ہوا۔ مشکلات کے باوجود جنازہ پڑھا گیا اور صاحب کا جسدِ پاک آرام گاہ کی طرف واپس آنے لگا۔ پھر وہی کلمۂ حق کی صدا، پھر وہی ٹھاٹھیں مارنے والا سمندرِ خلق مگر آخرکار تجہیز و تکفین کی باری آئی۔ نثار صاحب ککرو، خالق صاحب، غلام نبی بُلا صاحب، ان کے فرزندان، پیر اعجاز (آزاد)،

منا مفتون، مجروح، مغموم، اعجاز فرید، نذیر صاحب عشہ پیر، وزیر کاک اور بہت سارے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے جانثارانِ احد فراقِ احد کا بوجھ لا الٰہ الا اللہ سے ہلکا کر رہے تھے۔ دور چنار کے پاس سڑک پر اک مسافر بے چارا پتھر بن گیا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، نہ جانے کیوں! ادھر سماوی بارگاہیں شب برات کی شمعیں لا لا کر درست کر رہی تھیں۔ چھ بج چکے تھے اور شام کا وقت دور نہیں تھا اسلئے مسجد چشتیہ بھی دروازے کھولنے جا رہی تھیں! پولیس کھڑی تھی اور لوگوں کی واپسی شروع ہوگئی تھی۔

کشمیر کے حالات بدستور خراب تھے۔ سڑکیں ہڑتالوں کی وجہ سے سنسان تھیں۔ لوگوں کا آنا جانا ناممکن تھا۔ رسمِ چہارم اس کے باوجود انجام دی گئی اور صاحب کے لاڈلے فرزندار جمند جناب عطا محمد صاحب کی دستار بندی ایک مختصر مگر شاندار تقریب پر کی گئی۔

[illegible] کی آرام گاہ پر روضہ تعمیر کرنے کا کام فوراً ہاتھ میں لیا گیا۔ ابھی تک یہ کام جاری ہے۔ شاید اسلئے [illegible] تعمیری ساخت میں ردوبدل ہوتی رہتی ہے۔ لوگ جوق در جوق روضے پر حاضر ہوتے رہتے ہیں [illegible] علی الصباح قرآن پاک کی تلاوت موقعے پر ہی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دن کی گھڑیوں میں بھی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ لنگر بدستور چالو ہے اور زائرین کیلئے سہولتیں بھی۔ جناب عطا محمد صاحب ساری ذمہ داریاں خود سنبھالے ہوئے ہیں اور ہم ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے متمنی!
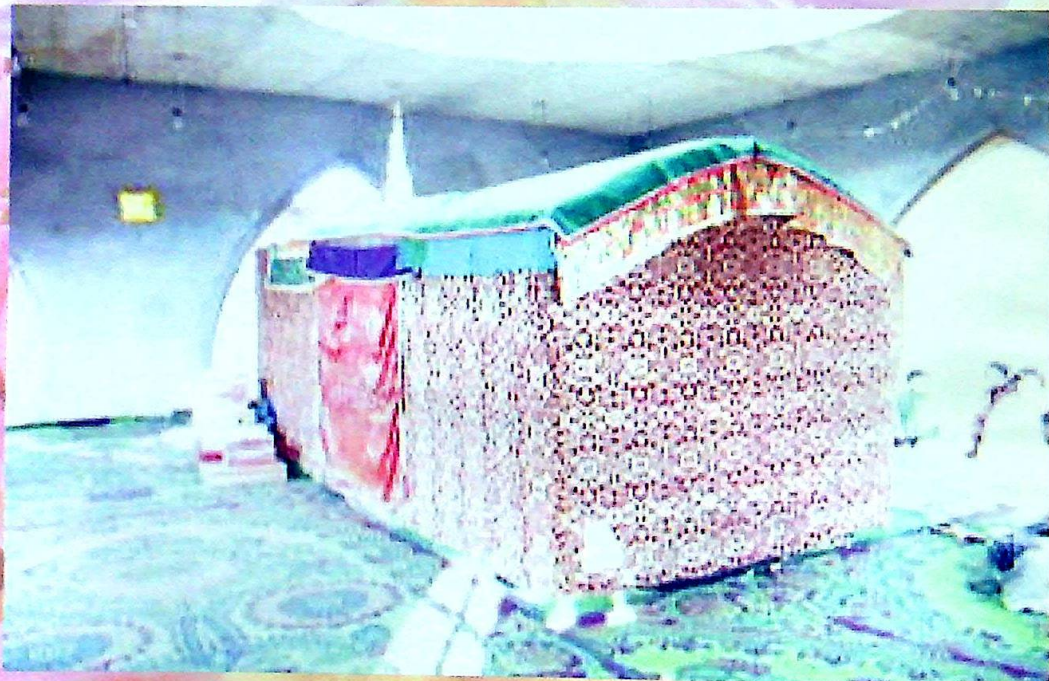
پانچ سے اللہ کا ناطہ نور [illegible] سماں
ہا سے ہو موجود سبحان صلِ علیٰ نعت خواں
لاالہٰ خود ہی پکارے الا اللہ شام و سحر
رقص رقصاں راز کھولے خود بخود نطقِ دہر
دیدۂ امکاں سے ٹپکیں دم بدم انوار حق
ذرہ ذرہ خود پڑھے منصور انا الحق سبق
الم نشرح سینہ کھولے اللہ اللہ عرض پاک
آسماں ہرسو پکارے مرحبا روحی فداک
تحت الثریٰ زمزموں کی کھول دے اپنی کمر
چاند سورج وصل کا دربار چھلکائے سحر
قدسیانِ افلاکیاں مستِ مستِ درودِ حضور
لوحِ شفا پر لکھے یزداں عرفانی سطور

حبیبؔ

تشکّر

شکر و ثنا رب العالمین کا جس کی نظرِ کرم سے اس نقشِ کتاب کا تصور پیدا ہوا جواب اس تحریر کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ اس کی مہربانی سے ہی دوسرے احباب بھی اس کام کے ساتھ جڑ گئے۔

پچھلے سال نومبر کے مہینے میں صاحب کے فرزند عطا محمد صاحب اور اپنے منّا (پیر غلام نبی) نے میری خاصی معاونت کی۔ وہ دن بھر میرے ساتھ رہے۔ ہم مختلف جگہوں پر گئے اور تصویریں کھینچیں۔ عطا محمد صاحب نے سید مہدی علی ختائی کے مزار شریف پر چند خاص باتوں کا انکشاف کیا جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔ وہاں بھی ہم نے تصویریں لیں۔ نومبر سے پہلے اور اُس کے بعد عطا محمد صاحب کے ساتھ وقتاً فوقتاً فون پر کارآمد باتیں ہوتی رہیں اور اس طرح میری رکاوٹیں دور ہوتی گئیں۔ ان دونوں برادران کا تہہ دل سے شکریہ!

بانڈی پورہ کے گُل گُور اور پٹن کے غلام حسن سے بھی فون پر کچھ کارآمد باتیں دریافت ہوئیں۔ اُن کا بھی شکریہ!

ماریا ہارٹی نے اس کام میں خاصی دل چسپی دکھائی۔ اس سے فنونِ لطیفہ سے متعلق چند تصویریں حاصل ہوئیں جن کی مدد سے میرا استدلال زیادہ صحت مند ہوا۔ اُس کا بہت شکریہ!

ضمیر احمد میر صاحب اس کام میں اس قدر محویت سے جٹ گئے کہ میرے دوست بن گئے۔ اُنہوں نے سخت محنت سے اس مشکل کام کو آسان بنادیا۔ اس پیچیدہ کام میں چار زبانیں گتھم گتھا ہوگئی ہیں، متعدد بکس اور تصویریں استعمال ہوئی ہیں اس لئے اس کی پیچیدگیاں دور کرنا صبر آزما کام تھا۔ ان سب چیزوں کو نفس مضمون کے ساتھ جوڑنا ضمیر صاحب کا فنّی کرتب ہے۔ ضمیر صاحب اس لحاظ سے خاص تشکّر کے مستحق ہیں۔

میرے نئے معاون فاروق صاحب نے اس تحریر میں رنگ بھر دئے۔ اُن کا شکریہ۔ چھپائی حسبِ دستور شالیمار آرٹ پریس کو سونپ دی گئی۔ اُمید ہے کہ چھپائی تحریر کے مزاج کو برقرار رکھے گی۔ قیوم صاحب کا بہت بہت شکریہ۔

ایک نامور نوجوان آرٹسٹ منیر احمد صاحب نے موقلم سے اس تحریر کا سرورق بنایا۔ موقلم سے صاحب کی تصویر بنانا لازماً کوئی معمولی کام نہیں۔ منیر صاحب کو پروردگار اپنی مہربانیوں سے نوازے۔ میں تو اُن کا بس شکر گزار ہوں۔

کام کرتے کرتے میرے گھر والوں پر کچھ بوجھ ضرور پڑ گیا ہوگا۔ صاحب کی محبت کی وجہ سے بھی اُنہوں نے دباؤ برداشت کئے ہونگے۔ اُن کا بھی شکریہ۔

حبیب